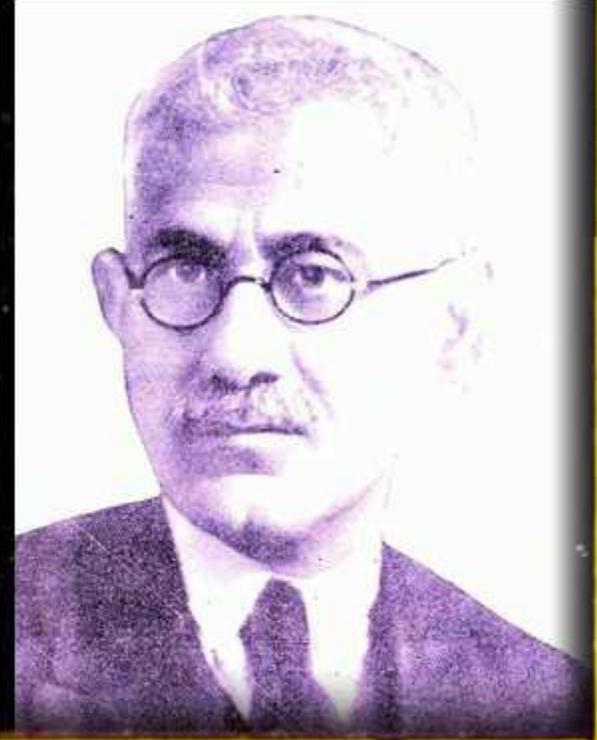


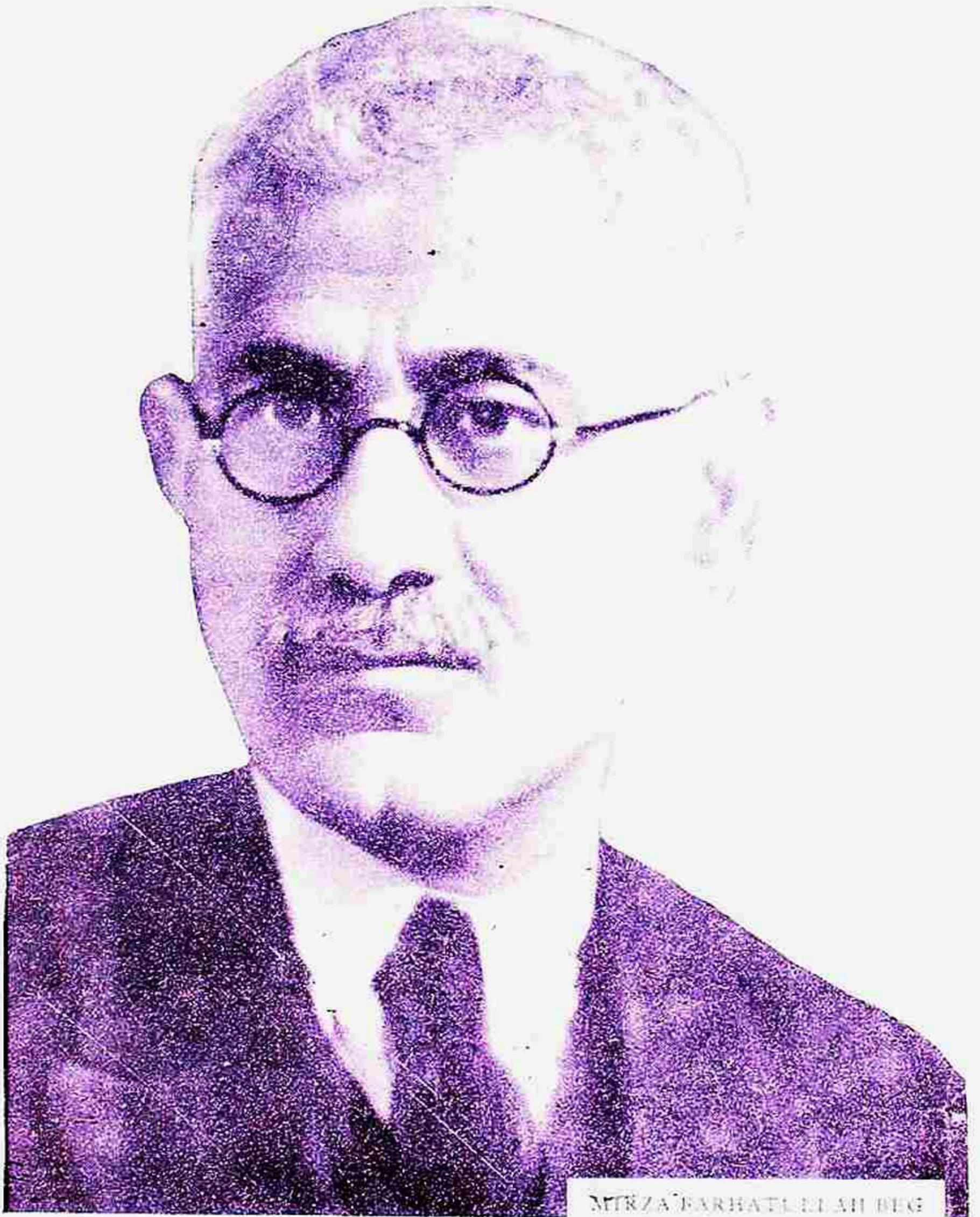
مزا اللہ سے مہما میں

(انتخاب)

مرتبہ: اسلم پرویز



اردو اکادمی دہلی



MIRZA FARHATULLAH BEG

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین

(انتخاب)

مرتبہ

ڈاکٹر اسلم پرویز



اردو اکادمی، دہلی

**MIRZA FARHATULLAH BEG KE
MAZAMEEN (KA INTEKHAB)**

Ed. by : Dr. Aslam Parvez

First Ed. 1989, IIInd Ed. 1992

IIIrd Ed. 1997

Price: Rs. 40.00

۱۹۸۹ء

اشاعت اول:

۱۹۹۲ء

اشاعت دوم:

۱۹۹۷ء

اشاعت سوم:

چالیس روپے (= ۴۰/-)

قیمت:

آئی آئی اے پبلسنگز، دہلی ۱۱۰۰۰۲

طباعت:

ناشر و تقسیم کار

اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN: 81-7121-037-6

فہرست

۷	۱- حرفِ آغاز
۹	۲- مقدمہ
۳۲	۳- شروع
۳۵	۴- یادِ ایامِ عشرتِ فانی
۶۴	۵- ہم اور ہمارا امتحان
۶۹	۶- میری داستان
۸۶	۷- جزیرہ بورنیو کا سفرنامہ
۹۰	۸- ایک نواب صاحب کی ڈائری
۱۲۰	۹- پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکڑے
۱۳۳	۱۰- کل کا گھوڑا
۱۳۶	۱۱- اڈیٹر صاحب کا کمرہ
۱۵۱	۱۲- دیارِ عشق
۱۵۹	۱۳- کہانی
۱۷۰	۱۴- کم بستی کی شادی
۱۷۷	۱۵- انجمن اصلاحِ حالِ بد معاشان

۱۹۲	۱۶۔ اصلاحِ سخن کے متعلق میرے خیالات
۲۰۶	۱۷۔ مردہ بدست زندہ
۲۱۲	۱۸۔ ایک اور ایک چار
۲۲۲	۱۹۔ جہینے کی پہلی تاریخ
۲۳۲	۲۰۔ پینا
۲۳۹	۲۱۔ نانی چندو
۲۴۸	۲۲۔ بہرا
۲۵۱	۲۳۔ غلام
۲۶۵	۲۴۔ نئی دہلی

حرف آغاز

دلی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے عدیل کی تاریخ و تہذیب علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبان دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیر سایہ نشوونما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جہنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیش نظر محترمہ اندرا گاندھی کے ایما پر (جو اس وقت ملک کی وزیراعظم تھیں) ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے، ان سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک یہاں تک کہ بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اس کام میں اکادمی کو دہلی سرکار کا فراخ دلائل تعاون حاصل رہا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے۔ دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیراعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور معلموں میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرون دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی چند گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے۔ انہی سرگرمیوں میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی ماہنامہ "ایوانِ اردو" اور بچوں کا ماہنامہ "امنگ" کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

پیش نظر کتاب جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کا انتخاب ہے اردو اکادمی کے اسی اشاعتی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے صاحبِ طرز نثر نگاروں میں ہیں۔ دہلوی تہذیب کے جو مرقعے ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں، وہ اس حسن و خوبی کے ساتھ شاید ہی کہیں اور نظر آئیں۔ مرزا صاحب کے مضامین کا انتخاب ڈاکٹر اسلم پرویز نے کیا ہے جو خود بھی دہلوی تہذیب کے پروردہ اور اس کے ادانشناس ہیں۔ انھوں نے مرزا صاحب کے بہترین مضامین تلاش کر کے اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔

ہم اردو اکادمی کے سرپرست اور صدر نشین عالی جناب صاحب سنگھ جی وزیر اعلیٰ دہلی کی عنایت اور توجہات کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین کے بھی شکر گزار ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرے گی اور ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

ڈاکٹر صادق

سکریٹری اردو اکادمی، دہلی

مقدمہ

مرزا فرحت اللہ بیگ چہرے مہرے کے اعتبار سے ٹھیکہ مغل تھے۔ اُن کے جگری دوست غلام یزدانی نے، جنہیں وہ پیار سے دانی کہا کرتے تھے، ان کے چہرے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

”رنگ نہایت سرخ و سپید، جلد صاف، ہونٹ پتلے پتلے، دانت چھوٹے اور پیوست، چہرہ نہ لمباز نہ زیادہ گول، آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی اور ایک آنکھ کو دبا کر دیکھتے تھے۔“

کہا جاتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضافین کی جلد چہارم میں خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان پر جو مضمون لکھا ہے اس میں اپنے خاندان کا شجرہ بھی دیا ہے اس شجرہ کی روت خواجہ امان، مرزا فرحت اللہ بیگ کے پرانا نام ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ولادت ذی قعدہ کے مہینے میں ہوئی تھی۔ ذی قعدہ کے مہینے کو دنی کی عورتیں خالی کا مہینہ کہتی ہیں چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ اس حقیقت کو کہ وہ خالی کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے بڑے لطف سے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش کا ہجری سال ۱۲۰۱ اور عیسوی مہینہ اور سال ستمبر ۱۸۸۳ء تھا۔ وہ دنی کے محلہ

لہ یادگار فرحت، فرحت میموریل کمیٹی، حیدرآباد ۱۹۵۱ء ص ۱۲۔

لہ یادگار فرحت، میں غلام یزدانی نے ایک جگہ ان کا سال ولادت ۱۸۸۳ء اور دوسری جگہ ۱۸۹۳ء (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

چوڑی والان کے رہنے والے تھے۔ اُن کی ولادت ڈپٹی سلطان خاں کے مکان میں ہوئی تھی جو ان کے حقیقی پچھتا تھے یہ مکان راجا سینل داس کی جوہلی تھی جسے بعد میں ڈپٹی سلطان خاں نے خرید لیا تھا۔ اسی جوہلی سے ملحق ایک حمام بھی تھا اور اس رعایت سے چوڑی والان کا یہ علاقہ اُس زمانے میں حمام سیتل داس کہلاتا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد مرزا شمس اللہ بیگ بھی ایک خوب صورت انسان تھے۔ مرزا کے دادا کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا مرزا عبداللہ بیگ چوں کہ افلاس زدہ تھے اس لیے وہ اپنے فرزندوں کو خاطر خواہ تعلیم نہیں دے سکے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی والدہ مشرف جہاں بیگم تھیں اور ان کی نانی کا نام ابمن آرا بیگم تھا جو خواجہ امان کی بیٹی تھیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ابھی چھوٹے ہی سے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اس لیے ان کی تمام تر پرورش ان کی پھی حسن جہاں بیگم نے کی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے قرآن اور دین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں شادہ بی کے چھتے کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ اسی مدرسے میں غلامیڑ دنی بھی ان کے ہم جماعت تھے۔ اس مدرسے سے فارغ ہو کر وہ کشمیری دروازے والے مدرسے میں داخل ہوئے۔ کشمیری دروازے والے مدرسے کی عمارت وسیع و عریض تھی یہاں کھیلنے کے میدان بھی خوب تھے اور یہ جہاں کے کھیل گھاٹ کے بائکل پاس تھا چاروں طرف کا منظر انتہائی پرفنا تھا اور بچوں کو یہاں بڑا لطف آتا تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں کبھی رنڈی نسی ہوا کرتی تھی اور ۱۹۵۷ء سے پہلے وہی کالج بھی اسی عمارت میں آباد تھا۔ اس اسکول کا بڑا دل چسپ ذکر ان کے طویل مضمون 'بادِ ایامِ عشرتِ فانی' میں ملتا ہے۔ مرزا نے اس اسکول میں پڑھائی کے ساتھ کرکٹ اور فٹ بال کے کھیل میں بھی نام پیدا کیا۔ ۱۹۰۱ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ہندو کالج میں داخلہ لیا۔ ہندو کالج اس

۱ بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ بتا رہے ہیں اسی بنیاد پر ایک اور مضمون لکھنے بھی ان کا سالِ ولادت ۱۹۰۲ء ہی لکھا ہے لیکن ۱۹۸۳ء کے ساتھ چوں کہ انھوں نے جوی سال ۱۹۰۰ء ہی دیا ہے اس لیے ہی صحیح ہو سکتا ہے۔

زمانے میں نیا نیا قائم ہوا تھا اور کناری بازار کی ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ اس کالج کے زیادہ تر اخراجات رائے بہادر سری کرشن داس اٹھاتے تھے۔ یہیں سے مرزا کو شو و شاعری کا چسپہ پڑا چناں چہ کالج میں مختلف موقعوں پر انھیں اپنی موزونی طبع کے خوب جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ فرحت ایک ذہین طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ شوخ اور ترقی بھی تھے۔ ۱۹۰۳ میں انھوں نے سینٹ اسٹیفنز میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ میں اچھے نمبروں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۵ کے بعد اسی کالج میں انھوں نے اپنی ایم۔ اے کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

فرحت کے والد انتہائی غیر ذمے دار اور لالچانی قسم کے انسان تھے۔ وہ ہمیشہ بس اپنی سیر تفریح میں مگن رہتے تھے۔ فرحت کی پھپھی کے لیے جو اب ان کی ماں کی جگہ تھیں، یہ زمانہ بڑی سختی کا تھا۔ غلام یزدانی کا بیان ہے کہ انھی دنوں کسی ماں مشکل میں گرفتار ہو کر انھیں مولوی نذیر احمد سے روپیہ قرض مانگنا پڑا لیکن مولوی صاحب نے اتنا سود طلب کیا کہ وہ قرض نہ لے سکے۔ ۱۹۰۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ ملازمت کی غرض سے حیدرآباد چلے آئے اور پھر تادم حیات وہ یہیں رہے۔ حیدرآباد آنے کے بعد وہ گلہ گاہ دلی جاتے رہتے تھے لیکن نئے حالات کے ساتھ دلی بھی جس طرح تیزی سے بدلتی جا رہی تھی اسے دیکھ کر انھیں بڑا قلق ہوتا تھا چناں چہ اپنے مضمون نوی دہلی میں انھوں نے کچھ اس قسم کی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ حیدرآباد میں ان کی ملازمت کا سلسلہ ہیڈ ماسٹری سے شروع ہوا اور پھر وہ ترقی کرتے کرتے شش جج کے عہدے تک پہنچے۔ سیشن جج کی حیثیت سے ان کا تقرر کلکتہ میں ہوا تھا۔ کلکتہ کے ہی دوران قیام ان پر منہ ہی رنگ غالب آیا اور وہ پکے تہاڑی ہو گئے۔ یہ سلسلہ مرنے دم تک جاری رہا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا انتقال اچانک دلی کی حرکت بند ہو جانے سے ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو ہوا اور چونکہ وہ ۱۹ سال زندہ رہے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی چوبیس سال دلی میں اور بقیہ چالیس سال حیدرآباد میں گزرے۔ لیکن

زندگی کے جو چوبیس سال انھوں نے دلی میں جیسے تھے انھی چوبیس سالوں کو وہ چالیس برس تک حیدرآباد میں بھی جیتے رہے اور اس کا ثبوت ہیں ان کی وہ تمام تحریریں جو انھوں نے حیدرآباد میں بیٹھ کر قلم بند کیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصانیف میں ان کے مضامین کے سات مجموعے اور چند متفرق چیزیں شامل ہیں۔ یہ سب ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کے مقربین کا کہنا ہے کہ ان کے پاس اپنے غیر مطبوعہ مضامین کا کم از کم اتنا ذخیرہ اور موجود تھا جس سے ان کے مضامین کا آٹھواں مجموعہ تیار ہو جاتا لیکن اب وہ غیر مطبوعہ مضامین کہاں ہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان مضامین کے علاوہ ان کے انتقال کے تیس سال بعد یعنی ۱۹۷۷ء میں ان کی ایک اور کتاب 'میری داستان' شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ناشر مرزا فرحت اللہ بیگ کے بڑے بیٹے مرزا شرافت اللہ بیگ ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اتنے عرصے گناہی میں کیوں پڑی رہی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے انتقال کے بعد جب ۱۹۵۱ء میں فرحت میموریل کمیٹی کی جانب سے 'یادگار فرحت' شائع ہوئی تو اس کتاب کے کسی بھی مضمون میں اس امر کی جانب اشارہ نہیں کیا گیا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک غیر مطبوعہ کتاب 'میری داستان' کے نام سے بھی موجود ہے 'میری داستان'، دراصل حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے چونتیس سالہ دورِ ملازمت کی روداد ہے۔ اور چونکہ یہ زمانہ انھوں نے یہاں ہنسی خوشی نہیں گزارا اس لیے انھوں نے خود ہی اسے چونتیس سالہ قیدِ بامشقت سے تعبیر کیا ہے اس کتاب میں وہ شگفتگی اور تازگی بھی نہیں جو ان کی دوسری تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ ساری کتاب شروع سے آخر تک ایک ہی موضوع کے تحت لکھی گئی ہے اس لیے اس میں مضامین کا تنوع بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا مسودہ کہیں کاغذات میں گم ہو جسے بعد میں دستیاب ہونے پر شائع کر دیا گیا۔ کتاب کے آغاز میں ناشر کی جانب سے ایسا کوئی دیا چہ بھی نہیں جس سے اس کی صحیح حقیقت پر روشنی پڑ سکے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا رفیق بیگ کے رسالہ 'تماش' کے اجرا کے ساتھ ہوتا ہے یہ رسالہ غالباً ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا۔ مرزا رفیق بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ماموں زاد بھائی تھے اور انھوں نے رسالہ 'نمائش' اردو کے مجتہد نظم گو شاعر عظمت اللہ خاں کے مشورے سے جاری کیا تھا۔ مرزا رفیق بیگ کے بیان سے ایک بات یہ بھی پتا چلتی ہے کہ رسالہ 'نمائش' کے اجرا سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون 'ہم اور ہمارا امتحان' ۱۹۱۹ یا ۱۹۲۰ء میں رسالہ 'افادہ' میں بھی شائع ہو چکا تھا لیکن اس رسالے میں انھوں نے یہ مضمون کسی اور نام سے چھپوایا تھا۔ رسالہ 'نمائش' میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ مضمون 'ایک نواب صاحب کی ڈائری' عظمت اللہ خاں کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون بھی مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے نام سے نہیں بلکہ مرزا الم نثر کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس مضمون کے ساتھ عظمت اللہ خاں کا جو تعارفی نوٹ 'خوش مذاقی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس میں خوش مذاقی کی تعریف کرتے ہوئے عظمت اللہ خاں نے کہا تھا کہ 'خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سو قیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی پینترے اور داؤں پیچ ذہن کے لیے پر لطف و رزش بھی ہو جائیں'۔ مرزا الم نثر کے قلمی نام اور ان حقائق سے جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی مضمون نگاری کا آغاز بنیادی طور پر ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی کیا اور آج تک اردو کے زیادہ تر قارئین ان کو صرف ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ان کے مضامین کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے وہ بیک وقت ایک طنز و مزاح نگار، قصہ نویس، خاکہ نگار، ادبی محقق اور نقاد،

(عاشیہ گزشتہ صفحہ کا) لہ 'یادگار فرحت' میں شامل مرزا رفیق بیگ کے مضمون میں رسالہ 'نمائش' کا سال اجرا ۱۹۳۱ چھپا ہے جو کہ بت کی غلطی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ کے دو مضامین 'نذیر احمد کی کہانی' جولائی ۱۹۲۷ء اور 'دہلی کا مشاعرہ' اکتوبر ۱۹۲۷ء میں رسالہ اردو میں خود ان کے نام سے چھپ چکے تھے۔ قیاس ہے کہ رسالہ 'نمائش' کا سال اجرا ۱۹۲۱ء ہوگا۔

لہ 'یادگار فرحت' ص ۸۲۔ لہ مضامین فرحت، جلد اول، حیدرآباد ص ۴۸۔

ڈراما نگار، سماجی مصلح، شاعر اور مصور سمجھی کچھ تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لالہ سری رام مولت نام خانہ جاوید کے ساتھ ایک ملاقات کے تعلق سے یہ بات کہی ہے کہ 'اس زمانے میں میں پڑھتا بہت تھا لکھتا ایک حرف نہ تھا اس لیے میں نے لالہ صاحب کی بہت تعریف کی مگر وہ تحسین نامی شناس سمجھ کر خاموش ہو گئے، لالہ سری رام کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہو چکا تھا اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا ان سے تعارف ان کی زندگی کے آخری سالوں میں ہوا تھا گو یا لالہ سری رام کے ساتھ ان کی یہ ملاقات اس وقت ہوئی جب ادب میں ان کی شہرت نہیں ہوئی تھی اس لیے اس وقت تک یا تو انھوں نے تیز رفتاری کے ساتھ لکھنا شروع نہیں کیا تھا یا وہ جو بھی کچھ لکھ رہے تھے وہ مرزا الم نشرح کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ اس بات کی توثیق خط لکھنے کے مضمون 'خوش مذاقی' کی اس عبارت سے ہوتی ہے —

'خوش مذاقی کی کمی کے مد نظر ہم اس بڑے میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گہ گہ آنے والا صاحب ہمارے ہاتھ لگے۔ ہماری نظر ایک صاحب پر تھی لیکن کچھ تو طبعی کاہل وجودی اور بہت کچھ عدیم الغرضتی کی وجہ سے ان کو لکھنے پر آمادہ کرنا خیر جوئے شیر لانا تو نہیں ہاں کسی نو دریا محبوبہ کے رام کرنے سے کم نہ تھا۔ ان کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور انھوں نے اس کو پسند فرمایا کہ مرزا الم نشرح کے نام کے پردے میں اپنے آپ کو مخفی کر دیں۔'

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تمام تحریروں میں ان کے تین مضامین کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مضامین ہیں 'نذیر احمد کی کہانی' کچھ میری کچھ ان کی زبانی، ۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک شاعرہ، اور 'پھول والوں کی سیر'۔ نذیر احمد کی کہانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ نذیر احمد کی کہانی ان کا سب سے عمدہ مضمون ہے جس کے بارے میں بیشتر نقادوں کا یہ قول ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ اگر کچھ اور نہ لکھتے تو بھی اس مضمون کے بل پر وہ زندہ رہتے۔ نذیر احمد کی کہانی

۱۔ مضامین فرحت جلد سوم، غنم اسٹیٹ پریس، گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز، حیدرآباد، ص ۳۔

۲۔ مضامین فرحت، جلد سوم ص ۸۳۔ ۳۔ مضامین فرحت، جلد اول ص ۴۸۔

ایک سوانحی خاکہ ہے۔ عزیز احمد نے 'نذیر احمد کی کہانی' پڑبصرہ کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ 'مرزا صاحب اپنے عہد کی عام سطح سے اس مضمون میں اس قدر اونچے اٹھ آئے تھے کہ یہ مقام صرف چند مضامین میں برقرار رکھ سکے تمام میں نہیں ہے' آکا کے عنوان سے مرزا رفیق بیگ کا جو مضمون 'یادگار فرحت' میں شائع ہوا ہے اس میں 'نذیر احمد کی کہانی' کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں 'اس وقت تک اس مضمون کا عنوان صرف 'نذیر احمد کی کہانی' تھا۔ خاں صاحب جب مضمون سن چکے تو پہلے مضمون پر انھوں نے قبضہ کیا پھر کہنے لگے 'آکا یہ مضمون 'نمائش' میں نہیں چھپے گا رسالہ 'اردو' میں چھپے گا اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام سے چھپے گا۔۔۔۔۔ دیکھا کہ اب کوئی صورت پختہ کی نہیں ہے تو خود ہی بیٹھے بیٹھے کہنے لگے اچھا تو اس کا نام "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" رکھ دو یہ نام سن کر خاں صاحب سچڑک گئے اور فوراً یہ مضمون مولوی عبدالحق کو بھیج دیا گیا۔ اس مضمون کی تعریفوں سے مرزا صاحب کا توجہ بڑھ گیا اور اس کے بعد سے انھوں نے 'مرزا الم نشرح' کے بجائے 'مرزا فرحت اللہ بیگ' کے نام سے پے درپے مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ 'نذیر احمد کی کہانی' پہلی بار رسالہ 'اردو' کے جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں جس بے باکی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس پر نذیر احمد کے عزیزوں نے غلام یزدانی سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی شکایت بھی کی لیکن بقول یزدانی 'فرحت اللہ بیگ کا آرٹ بھی لطیف، جو گو کا آرٹ تھا۔ کیریکچر سٹ کا آرٹ تھا جو بغض و دشمنی سے پاک تھا۔ البتہ کمزوریوں کو وہ ایک دلکش اور پسندیدہ انداز میں پیش کرنے سے نہیں چوکتے تھے' 'نذیر احمد کی کہانی' سے متعلق مولوی وحید الدین سیم کا واقعہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ یہ واقعہ مرزا عصمت اللہ عصمت نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔

۱۔ یادگار فرحت، ص ۱۰۰۔

۲۔ یادگار فرحت، ص ۸۵۔

۳۔ یادگار فرحت، ص ۲۷۔

مولوی وحید الدین سلیم کا کہنا تھا کہ 'فرحت جب سے میں نے تمہارا مضمون پڑھا تب سے ملنے کو تڑپ رہا تھا بارے آج وہ مرادپوری ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مضمون کیا سمجھا گیا مرنے کے بعد تم نے نذیر احمد کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا افسوس ہمارا کوئی ایسا شاگرد نہیں جو ہمارے مرنے کے بعد ہمیں اس طرح زندہ کر دے۔'

مرزا فرحت اللہ بیگ کا دوسرا اہم مضمون '۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک مشاعرہ' ہے یہ مضمون اپنے نام کے تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ دہلی کی آخری شیعہ دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ 'دہلی کا آخری مشاعرہ' وغیرہ ناموں سے متعدد بار کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور آج تک اس کے متن کی بنیاد پر تعلیمی اداروں اور ثقافتی انجمنوں کی جانب سے تخیلی مشاعروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مضمون بھی مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی کی طرح مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا تھا اور اسی لیے یہ مولوی صاحب کے رسالہ اردو کے اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع بھی ہوا تھا۔ اس مشاعرے کو مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد کالج ڈسک کے موقع پر اسٹیج بھی کیا تھا اور اسٹیج ڈائریکٹر کے فرائض خود مرزا فرحت اللہ بیگ نے انجام دیے تھے 'دہلی کا ایک مشاعرہ' کہنے کو تو مضمون ہے لیکن مرزا نے اس کو ڈرامے کی شکل میں لکھا تھا۔ دراصل ڈرامے سے مرزا کو زمانہ طالب علمی ہی سے خاص شغف تھے جہاں وہ بہت سے انگریزی ڈراموں میں پارٹ بھی ادا کر چکے تھے 'دہلی کا مشاعرہ' سے پہلے انھوں نے دو ڈرامے اور لکھے تھے ایک ڈراما کسی خاموش فلم کے لیے اس وقت لکھا تھا جب خاموش فلمیں چلا کرتی تھیں اور دوسرا بعد میں بولتی ہوئی فلم کے لیے لکھا تھا۔ ان کے ان دونوں ڈراموں کا کیا حشر ہوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے مطبوعہ مضامین میں 'دہلی کا ایک مشاعرہ' کے علاوہ ان کا بس ایک ڈراما اور ملتا ہے جو ان کے مضامین کی جلد پنجم میں شامل ہے اور جس کا نام 'خان بہادر ہے ہوسکتا ہے کہ یہ انہی دو ڈراموں میں سے ایک ہو جو انھوں نے فلموں کے لیے لکھے تھے 'خان بہادر'

کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے خود یہ لکھا ہے کہ یہ میرا پہلا ڈراما ہے جو طبع ہو رہا ہے۔ خان بہادر کی اشاعت سے پہلے ہی رسالہ اردو میں اور پھر مضمین فرحت جلد اول میں دہلی کا مشاعرہ، شائع ہو چکا تھا اور اورنگ آباد کالج کے لیے وہ اسے اسٹیج بھی کر چکے تھے اس کے باوجود انھوں نے اس کا شمار اپنے ڈراموں میں نہیں کیا۔ شاید خود ان کے نزدیک دہلی کا ایک مشاعرہ، کی حیثیت ڈراما کی نہیں بلکہ ایک ٹیلیو کی تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا تیسرا شاہکار پھول والوں کی سیر ہے، اس مضمون کی حیثیت ایک ثقافتی دستاویز کی ہے۔ پھول والوں کی یہ کامیلا دہلی میں ہر سال بہادروں کے مہینے میں مہرولی میں لگا کرتا ہے اس میلے میں شہر کے ہندو اور مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں۔ مہرولی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی درگاہ ہے اور جوگ مایا کا مندر بھی ہے۔ پھول والوں کی سیر کے موقع پر پھولوں کا ایک پنکھا حضرت بختیار کاکی کی درگاہ پر اور دوسرا جوگ مایا کے مندر پر چڑھایا جاتا ہے۔ یہ میلہ بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں شروع ہوا تھا لیکن اسے زیادہ دھوم دھام سے منانے کا رواج بہادر شاہ کے زمانے میں عام ہو چکا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضمون میں پھول والوں کی سیر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ دراصل بہادر شاہ ظفر کے زمانے کی پھول والوں کی سیر تھی۔ آج دہلی میں پھول والوں کی سیر کا میلہ اس طرح نہیں لگتا جس طرح مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لگتا تھا۔ یقیناً مرزا فرحت اللہ بیگ نے اندر سے پہلے ایسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہوں گی جن کے بچپن یا جوانی میں یہ میلہ لگتا تھا۔ چنانچہ انہی لوگوں سے سن کر انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے اس میلے کا نقشہ اپنی آنکھوں میں بٹھایا اور لکھ ڈالا اور اسی لیے اس مضمون کی حیثیت ایک ثقافتی دستاویز کی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے جن تین مضمین کا تذکرہ یہاں کیا گیا یہ ان کے بہت ہی مشہور اور قدرے طویل مضمین ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی بھی مضمون کو موجودہ انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک

مزاح نگار کی حیثیت سے کیا تھا ان کے قلمی نام مرزا الم نشرح میں بھی بجائے خود ایک لطیف مزاح موجود ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ لکھتے گئے ان کے ہاں نئی نئی جہتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اس اعتبار سے ان کے مذکورہ بالا تین مضامین کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ کی تمام نہیں تو بیشتر جہات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ 'نذیر احمد کی کہانی' میں انھوں نے صرف بہترین مزاح نگار ہونے کا ثبوت ہم نہیں پہنچا یا ہے بلکہ وہ ایک کامیاب خاکہ نگار کی صورت میں بھی ہمارے سامنے آتے ہیں اسی طرح 'دہلی کا ایک مشاعرہ' میں انھوں نے ادبی تحقیق کے جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ ڈراما نگاری کے فن کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ پھول و انول کی سیر میں ثقافت، انشا پر دانی اور قصہ نویسی یہ تینوں چیزیں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے 'نذیر احمد کی کہانی'، 'دہلی کا آخری مشاعرہ' اور 'پھول و انول کی سیر' کو بڑی حد تک ان کے نمائندہ مضامین کہا جا سکتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے تمام مضامین کو کھنگال کر اور مختلف موضوعات کے تحت ان کی درجہ بندی کی جائے تو یقیناً سب سے زیادہ تعداد ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی ہی ہوگی۔ اسے ان کی ستم نظریں ہی کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنی توجہ طنز و مزاح سے ہٹا کر دوسرے موضوعات پر بھی مرکوز کی اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید ان کے طنزیہ مزاح کے جوہر اور کھل کر ہمارے سامنے آتے۔ زیر نظر کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے جو مضامین منتخب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں ان میں بھی سب سے زیادہ تعداد ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی ہی ہے۔

سمانج میں اپنے ارد گرد ہمیں عام طور پر دو طرح کے لوگ ملتے ہیں ایک وہ خاموش طبع لوگ جو اپنے آپ کو لیے دیے رہتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات کا کوئی بھی تاثر نہ صرف یہ کہ اپنی زبان سے بلکہ اپنے چہرے سے نہیں ظاہر ہونے دیتے۔ ایسے لوگ ہمارے لیے خطرناک ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ طے ہے کہ ان کے پاس ہمیں دینے کو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں کی دوسری قسم وہ ہے جنہیں اپنی زبان پر مشکل ہی سے قابو ہوتا ہے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بولتے ہی رہتے ہیں اور اکثر ان کے اس بولتے رہنے سے کچھ نکل کر بھی نہیں آتا۔

مہذب سماج میں آدابِ مجلس کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ دل کے اندر کی بات کو سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر اپنے سے باہر لایا جائے لیکن ایسا کرنا شاید عام طور پر اس قبیل کے لوگوں کے بس کی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ کبھی کبھی کسی کی جا اور بے جا دل شکنی کا سبب بھی بن جاتے ہیں لیکن اسی قبیل کے بے شمار لوگوں کی بھینٹ میں ایک بہت چھوٹی سی تعداد خوش طبع لوگوں کی بھی چھپی بیٹھی ہوتی ہے خوش طبع انسان ایک لطیف اور نازک احساس کا مالک ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کا نسبتاً گہرا تاثر قبول کرتا ہے اور چونکہ اس قبیل کے لوگوں میں اپنے تاثرات کے اظہار کو روکنے پر قابو نہیں ہوتا، اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، وہ برملا اپنے دل کی کیفیات بیان کر جاتے ہیں۔ لطیف احساس اور خوش طبعی میں گھلے ملے یہ تاثرات کبھی مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور کبھی طنز کی چٹکیاں لیتے وجود میں آتے ہیں مزاح نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دلیر ہوتا ہے اور اس لیے بے باک بھی۔ وہ گرد و پیش کے حقائق پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ ایک لطیف احساس کا مالک ہونے کی وجہ سے وہ معاملات کی نوعیت کو شدت سے محسوس کرتا ہے اس کی جس مزاح زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو اس طرح چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے جس طرح سورج کی کرن درختوں کی پھنگول کو چوں کہ ایسے انسان میں صاف گوئی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اس لیے اس کے ہاں ضمیر کے بحران کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ آسانی کے ساتھ مگر لطیف پیرائے میں معاشرے اور اس کے افراد کی کمزوریوں اور معائب پر سے پردہ اٹھاتا ہوا چلتا ہے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ادراک کا زہر پینے کا حوصلہ اس لیے رکھتا ہے کہ اس میں اس تمام زہر کو اگل دینے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ یہی اگلا ہوا زہر طنز و مزاح ہے جسے پڑھ کر ہم سنتے اور خوش ہوتے ہیں لیکن ہماری یہ سنسی اور خوشی سطحی اور بے وقعت نہیں ہوتی یہ دراصل زندگی کے ایسے کا وہ مقابلہ ہے جو مزاح نگار کے نقطہ نظر سے ایک طرح کا کتھارسس ہو سکتا ہے لیکن جو قاری کی سطح پر بھی کم از کم کامک ریلیف سے کم تر درجے کی چیز ہرگز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بات بھی مانتی ہوگی کہ خوش طبعی اور

احساس لطیف کوئی جامد قسم کی چیز نہیں ہے۔ ہر فرد میں اس کا معیار نسبتاً بلند یا پست ہو سکتا ہے یہاں تک کہ ایک ہی فرد کے ہاں بھی مختلف موقعوں پر اس کے درجات گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر خوش مذاق انسان ضروری طور پر اعلا پائے کا طنز و مزاح نگار بھی ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کسی طنز و مزاح نگار کی ہر تحریر ہی ادب کا شہ پارہ ہوگی۔ اور یہ بات طنز و مزاح ہی نہیں کسی بھی فن کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ایسا ہی کچھ مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ تاہم طنز و مزاح کی اس بحث میں ہمیں طرفت اور پھکڑ پن میں فرق کرتے ہوئے چلنا ہوگا۔ اچھے مزاح نگاروں کی بڑی تحریروں میں بھی پھکڑ پن آسکتا ہے وہ ایک علاحدہ چیز ہے لیکن بحیثیت مجموعی مزاح اور پھکڑ پن میں بہ آسانی فرق کیا جاسکتا ہے۔ خود مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں پھکڑ پن کی مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں ان کی نثر میں ایسی مثالیں تلاش کرنا شاید تھوڑا مشکل ہو لیکن ان کی شاعری سے ایسی مثالیں آسانی کے ساتھ تلاش کی جاسکتی ہیں اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وہ شعر و شاعری کے میدان میں غیر شعوری طور پر بعض معاملات میں سید انشا سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور انشا کے پھکڑ پن میں کوئی کلام نہیں۔ بہر حال خود مرزا فرحت اللہ بیگ کے نزدیک مزاح کا کیا معیار تھا اس کا تذکرہ فرحت اللہ بیگ کے حوالے سے مرزا عصمت اللہ بیگ نے اس طرح کیا ہے:

”ظریف کے معنی ہنسوڑے، مسخرے، یاودگو اور بجانڈ کے تو ہیں نہیں ظرافت تو خوش طبعی اور ذہانت کا نام ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری حماقتیں اور جیوب دل کش طریقے سے بتائے جائیں اور سیاسی، سماجی، ملکی اصلاح دل چسپ طریقے سے کی جائے۔ ظرافت میں تو مذاق شہتہ، پاکیزہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔“

اس اقتباس سے مرزا فرحت اللہ بیگ کے نظریہ ظرافت کے بارے میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی تو یہی کہ ظرافت، خوش طبعی اور ذہانت کا نام ہے۔ بلاشبہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی بہت سی تحریریں ایسی ہیں جن میں انھوں نے خوش طبعی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ان کے مضامین 'نذیر احمد کی کہانی'، 'کل کا گھوٹرا' اور 'ایک نواب صاحب کی ڈائری'۔ پھر دوسری بات انھوں نے یہ کہی ہے کہ ہماری حماقتیں دل چسپ اور عیوب دلکش طریقے سے بتائے جائیں اور تیسرے یہ کہ سیاسی، سماجی اور ملکی اصلاح دل چسپ طریقے سے کی جائے۔ جہاں تک سیاسی، سماجی اور ملکی اصلاح کا تعلق ہے اس معاملے میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ظرافت سے زیادہ کام نہیں لیا۔ انھوں نے یقیناً اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے 'کم سنی کی شادی' یا 'انجمن اصلاح حال بد معاشا'، لیکن یہ ان کے سنجیدہ مضامین ہیں۔

سید احتشام حسین نے کہیں یہ بات کہی ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں مزاح طنز سے پاک ہو سکتا ہے۔ دراصل طنز و مزاح کا معاملہ اتنا میکانیکی کبھی نہیں اگر اس بات کا امکان ہے کہ مزاح طنز سے پاک ہو تو یہ بات کبھی اسی قدر ممکن ہے کہ طنز مزاح کے بغیر کیا جاسکے۔ شاید ایسا ہے کہ طنز میں مزاح کی آمیزش اسے بالواسطہ بنا دیتی ہے جبکہ مزاح کے بغیر کیا گیا طنز برا اور راست ہوتا ہے۔ اس کی مثال مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون 'جزیرہ بوریٹو کا سفر نامہ' ہے جو انھوں نے سنجیدہ سب و لہجے کے ساتھ تحریر کیا ہے لیکن ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خیالی سفر نامہ دراصل ان تمام حقیقی سفر ناموں کی پیروڈی ہے جو دل چسپ اور پراسرار واقعات سے پر ہیں۔ رشید احمد یقینی نے یہ بات بالکل بجا کہی ہے کہ طنز کا مقصد تنقید حقیقت ہونا ہے اور حقیقت بلاشبہ تلخ ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ ظرافت میں طنز مضمون ہوتا ہے مگر طنز میں ظرافت کا کوئی دخل نہیں ہے اس بات کو بھی کلیہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ظرافت میں طنز مضمون ہوتا ہے نہیں ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون 'ایک اور ایک چار میں ظرافت ہے لیکن طنز نام کو

نہیں اور جس معاملے کو لے کر یہ مضمون لکھا گیا ہے وہاں طنز کا کوئی محل بھی نہیں۔ دوسری جانب ان کا مضمون 'کل کا گھوڑا' یا 'ایک نواب صاحب کی ڈائری' بنیادی طور پر طنز یہ مضامین ہیں۔ سائنسی ایجادات کو اخبارات کس طرح رانی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور خبروں کو اپنے اخبار کی فروخت کے لیے کیا سے کیا رنگ دیتے ہیں اور سائنس پڑھنے کے بعد بعض لوگ کس طرح فطرت کو چھوڑ کر میکا نائیت کے غلام ہو جاتے ہیں 'کل کا گھوڑا' انھی تمام باتوں پر کاری طنز ہے لیکن اس مضمون میں اسی قدر بھرپور ظرافت بھی ہے کہ پڑھنے میں لطف آجاتا ہے۔ اس طرح 'ایک نواب صاحب کی ڈائری' والے مضمون میں برٹش راج کے عدالتی نظام پر کتوں کے وسیلے سے جو پھبتیاں کسی گئی ہیں وہ مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کا حصہ ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ مضامین کے بارے میں شاید عزیز احمد کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں ظرافت کے دو اسلوب ملتے ہیں ایک متین ظرافت جسے انھوں نے ادبی ظرافت کہا ہے اور دوسری صحافتی ظرافت۔ متین ظرافت کے زمرے میں 'نذیر احمد کی کہانی' کو رکھا جا سکتا ہے اور صحافتی ظرافت کے دائرے میں 'عشق کی گولیاں' جیسے مضمون آئیں گے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن عزیز احمد نے 'ایک نواب صاحب کی ڈائری' والے مضمون کو بھی صحافتی ظرافت کے زمرے میں ڈالا ہے جو یقیناً یادتی ہے۔ اس مضمون میں کافی گہرائی ہے لہذا ہر اس مضمون سے مزاح ابلا پڑتا ہے لیکن عدالتی نظام پر ان کا تیکھا طنز موج تہ نشین کی طرح موجود ہے ویسے بھی یہ مضمون پطرس کے مضمون 'کتے' سے کسی طرح کم نہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو خاکہ نگاری کے فن پر بھی بھرپور قدرت حاصل ہے۔ خاکوں کے علاوہ ادبی تحقیق کے تعلق سے انھوں نے ماضی کی چند اہم ہستیوں کے مرقعے بھی تیار کیے ہیں اس اعتبار سے نبطر اکبر آبادی، سید انشا، خواجہ امان، حافظ عبدالرحمن خاں احسان اور انعام اللہ خاں یقین وغیرہ پر انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ادبی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہیں۔ ان مضامین کو خاکے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کے زمانے کے لوگ نہیں ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ خاکے اور سوانح کے نازک تفرق کو بخوبی سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے شخصیات پر قلم اٹھاتے ہوئے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ خاکہ ذاتی تاثرات کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے اس اعتبار سے ایک ادیب صرف اپنے ہمعصروں ہی کے خاکے لکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد، عظمت اللہ خاں، وحید الدین سلیم اور لالہ سہی رام پر دینی یا سوانحی مضمون لکھنے کے بجائے ان کے خاکے لکھے ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے ادبی مرتبے کا تعین کرنا نہ صرف یہ کہ ایک دشوار کام ہے بلکہ قبیل از وقت بھی ہے۔ اس لیے مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان حضرات کے خاکے لکھتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا ذکر بس برائے نام ہی کیا ہے۔ خاکے کا موضوع ضروری نہیں کہ کوئی معروف شخصیت ہی ہو اس لیے انھوں نے مشاہیر کے خاکے لکھنے کے ساتھ ساتھ بعض گمنام شخصیتوں کے خاکے بھی لکھے ہیں جیسے 'تانی چندو' یا 'دیور بیگان خورد' مشہور لوگوں کے مقابلے میں گمنام لوگوں کے خاکے کبھی کبھی زیادہ جاندار ہوتے ہیں اس لیے گمنام لوگوں کے ہاں انفرادیت کی چھاپ نامور لوگوں سے زیادہ اس لیے ہوتی ہے کہ نامور لوگ پھر مخصوص قسم کے درجوں اور خانوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ ایک ان پڑھ اور گمنام آدمی کا اپنا ہی ایک درجہ اور خانہ ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا 'ایوب' اور مولوی عبدالحق کا 'گڈری نعل نور خاں' اسی لیے بہترین خاکے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے عہد کے بعض کرداروں کو بھی بڑے دل چسپ اور موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں بیان کی جانے والی شخصیتوں کو دو دستوں میں تقسیم کیا ہے ایک زندہ کردار اور دوسرے سماجی نمونے سماجی نمونوں سے عزیز احمد کی مراد انہی لوگوں سے ہے جنہیں ہم یہاں کردار کہہ رہے ہیں۔ ان اشخاص کو کردار اس لیے کہا جا رہا ہے کہ نذیر احمد اور عظمت اللہ خاں کی طرح ان کے کوئی نام نہیں ہیں اس لیے کہ یہ مخصوص اشخاص یا افراد نہیں بلکہ اپنے آپ میں پوری ایک کلاس یا ایک طبقہ ہیں۔ 'بہرا'، 'غلام' اور 'صاحب بہادر' ان کے تعمیر کئے ہوئے ایسے ہی کردار ہیں۔ خاکے اور کردار کا فرق یہی ہے کہ خاکے کو کسی مورق کی طرح پتھر کی سالم سل میں سے

تراش کر باہر لانا پڑتا ہے اور کردار کو بھبھکے ہوئے اینٹ کا رے اور مٹی سے تعمیر کرنا ہوتا ہے خاک لکھنے ہوئے شخصیت کا ایک عکس پہلے ہی سے ذہن میں محفوظ ہوتا ہے لیکن کردار کی شکل اس کی تعمیر کے ساتھ دھندلکے میں سے آہستہ آہستہ نکل کر باہر آتی ہے۔ حکومت برطانیہ کے زمانے میں صاحب لوگوں کی دنیا سے باہر مگر انہی کے گرد گھومتا ہوا تذیر احمد کا ابن الوقت یا مرزا فرحت اللہ بیگ کا صاحب بہادر ایک بن قبیل کے وہ کردار ہیں جنہیں کالے انگریز کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے اس طرح صاحب لوگوں کے گھر کا بہرا یا جاگیر دار مسلم گھرانوں میں 'غلام' جیسی حیثیت کے نوکر اس زمانے کی کھری سچائیاں تھیں۔

اصلاح کے موضوع پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے دو مضامین ہیں اور دونوں اس انتخاب میں شامل ہیں ان میں سے ایک کا عنوان ہے 'اصلاحِ سخن سے متعلق میرے خیالات اور دوسرے کا عنوان ہے 'ابنِ اصلاحِ حال بد معاشاں! ان دونوں مضامین میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اصلاح سے متعلق غیر روایتی رویے کا ثبوت دیا ہے ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ شعرو شاعری کے سلسلے میں استاد ی شاگردی اور اصلاحِ سخن کے معاملات نے ایک پیشے کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ استاد کی سند کے بغیر نوشتہوں کو شعرو سخن کی محضوں میں کوئی اعتبار حاصل نہیں ہوتا اس لیے استاد ان سخن بجا اور بے جا شاگردوں پر اپنی استاد ی کی دھاک جھاتے ہیں اور اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات اپنی بے سنگم اصلاحوں سے ان کے اشعار کو کچھ کچھ بنا دیتے ہیں اس لیے ان استادوں سے رجوع کرنے کے بجائے نوشتہوں کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھیں! اسی طرح اپنے دوسرے مضمون 'ابنِ اصلاحِ حال بد معاشاں میں انہوں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت برے آدمی کی اصلاح نہیں کر سکتی تا آنکہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے کہ اسے اپنے اندر سے برائی کو دور کرنا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ اس شخص کی ذات پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جس کی اصلاح معاشرے کو مقصود ہے۔

اپنے بعض مضامین کی شکل میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے خود نوشتہ سوانح کے

فن کا مظاہرہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے 'یاد ایام عشرت فانی' ان کا ایک دل چسپ مضمون ہے جو دو حصوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ مبسوط انداز میں اپنے خودنوشت سوانح ترتیب دیں گے لیکن اپنی زندگی میں وہ یہ منصوبہ پورا نہیں کر سکے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک اور کتاب ان کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد ان کے بڑے بیٹے مرزا شرافت اللہ بیگ نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی ہے۔ اس کتاب کے عنوان 'میری داستان' کی توسیع کرتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ نے یہ بھی لکھا ہے 'یعنی چونتیس سال کی قید بامشقت کے کچھ حالات و واقعات' یہ وضاحت کچھ بے معنی نہیں ہے بلکہ اس داستان کے ذریعے، اور اسے مرزا کی دوسری تحریروں کے ساتھ رکھ کر، مطالعہ کرنے سے ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دلی والے تھے ملازمت کی خاطر حیدرآباد کی سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی وہ دلی والے ہی رہے۔ وہ ہمیشہ دلی کی فضا میں سانس لیتے تھے اور حیدرآباد میں بیٹھ کر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ بھی زیادہ تر دلی ہی کے بارے میں تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد پہنچے تھے جس کا مطلب ہے انھوں نے حیدرآباد کی چونتیس سالہ داستان اپنی وفات سے پانچ سال قبل ۱۹۲۱ء میں مکمل کر لی تھی۔ غالباً ملازمت کی مصروفیات، خانگی معاملات اور عمر کے ساتھ ساتھ گرتی ہوئی صحت اور توانائی نے ان سے اس طرح کی تحریریں لکھنے کی طاقت چھین لی تھی جو ان کا خاص رنگ تھا۔

پروفیسر سید محی الدین قادری زور نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات بالکل بجا کہی ہے کہ اردو میں ادبی تحقیق کی روایت محمد حسین آزاد سے شروع ہوتی ہے اور آزاد کے بعد اس میں دوسرا نام مرزا فرحت اللہ بیگ کا ہی آتا ہے۔ محمد حسین آزاد بنیادی طور پر انشا پرداز تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا بھی اصل میدان طنز و مزاح تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے ادبی مضامین میں طنز و مزاح کو علاحدہ رکھا ہے لیکن آزاد نے زیادہ تر ادبی تحقیق کو بھی انشا پردازی

ہی کا میدان سمجھا۔ انشا پر دازی اور طنز و مزاح میں ایک فرق یہ ہے کہ انشا پر دازی کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں جا کے رومایت سے ضرور مل سکتے ہیں جب کہ طنز و مزاح حقیقت کو کریدتا ہوا چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد حسین آزاد، آبِ حیات میں اکثر مقامات پر افسانہ طرازی پر زیادہ مائل نظر آتے ہیں جب کہ فرحت اللہ بیگ حقیقت کو تلاش کرنے میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کوئی باقاعدہ محقق نہیں تھے اور اردو میں اس وقت تک تحقیق کی وہ روایت بھی قائم نہیں ہوئی تھی جس نے تھوڑا آگے چل کر محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عیسیٰ جیسے لوگ پیدا کیے۔ چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضامین کے ذریعے حقیقت کی تلاش جو جستجو تو کی لیکن وہ تحقیق کے ان آداب کو نہیں برت سکے جہاں ماخذ حوالے یا سند کے بغیر بات نہیں کہی جاتی۔ اس کی وجہ ایک تو یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک تحقیق کا چلن عام نہیں تھا اور دوسری یہ بھی کہ مرزا فرحت اللہ بیگ بنیادی طور پر مضمون نگار تھے محقق نہیں تھے اس لیے وہ اپنے ان مضامین میں آدابِ تحقیق کو نہیں برت سکے۔ لیکن اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ ادبی تحقیق کے میدان میں وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے محمد حسین آزاد کو لکھنا جب کہ معاملہ یہ ہے کہ آج بھی بہت سے تحقیق کرنے والے محقق نہیں، ایسے ہیں جو اپنی تحقیق میں آبِ حیات ہی کے حوالوں سے کام چلاتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں تحقیق کا مطلب نہ صرف ماضی کی ادبی شخصیتوں سے متعلق حقائق کی تلاش تھا اس لیے انہوں نے بس ایسی شخصیتوں ہی پر تحقیقی مضامین لکھے جو ان کے زمانے سے پہلے کی تھیں۔ مثلاً خواجہ امان، حکیم آغا جان عیش، انشا اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ اس ادبی حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس فیضیے سے بچے رہے جو مومن، غالب اور ذوق کے سلسلے میں محمد حسین آزاد کے گلے پر گیا۔ دراصل اپنے ہم عصروں سے متعلق ہمارے کچھ اچھے یا برے تعصبات ضرور ہوتے ہیں۔ ان تعصبات کا ہماری تنقید میں رادہ پانا ایک یقینی بات ہے انہی تعصبات کی بنا پر محمد حسین آزاد نے کہیں مومن کو نظر انداز کیا، کہیں غالب کو چت کیا اور کہیں ذوق کو آسمان پر بٹھایا اور اسی پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

ان نراکتوں کو سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے ہم عصروں میں سے کسی کو بھی اپنی ادبی تنقید کا موضوع نہیں بنایا جب کہ ان کے ارد گرد اردو ادب کی کئی قدر اور شخصیتیں تھیں۔ ہاں انھوں نے ان شخصیتوں پر دل چسپ خاکے لکھے۔ نذیر احمد، غنیمت اللہ خاں اور وحید الدین سلیم ایسی ہی شخصیتیں ہیں۔ تاہم آج ادبی تحقیق جہاں پہنچ چکی ہے اس کے تناظر میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے ان مضامین کی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی یہ مضامین بس اپنے عہد کے سیاق و سباق میں ہی صحیح ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب نگارش انتہائی دلکش تھا وہ دلی والے تھے اس لیے دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے لیکن ایسی ٹکسالی زبان نہیں جس میں محاوروں کی ٹھونس ٹھانس ہوں انھوں نے دراصل دلی کے روزمرہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کے وہ مضامین تو خاص طور پر بہت ہی دل چسپ ہیں جس میں انھوں نے دلی کے رہن سہن کو دلی کے طور طریقوں کو اور دلی والوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنا یا ہے۔ دراصل کسی تہذیب کی نیچ عکاسی اس کی اپنی زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔ جو لوگ زبان اور تہذیب کے باہمی تعلق کو سمجھتے ہیں وہ اس نکتے کو جانتے ہیں۔ چونکہ مرزا نے اپنے ہاں دلی کا روزمرہ استعمال کیا ہے اس لیے ان کی زبان دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سہل بھی ہے۔ اس اعتبار سے مضامین فرحت کی ایک اہمیت یہ ہے کہ یہ دلی کے اس روزمرہ کی دستاویز ہیں جس کا چلن تقسیم ہند سے پہلے کی دلی میں عام تھا لیکن جو اب تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ تخلیقی ادب کے لیے روزمرہ کا استعمال بظاہر بڑا آسان معلوم ہوتا ہے جب کہ یہ اتنا آسان ہے نہیں۔ کم از کم روزمرہ لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ لکھنؤ اور دلی زبان کے دو بڑے مرکز رہے ہیں ان شہروں میں ہمیشہ سے دو طرح کے لوگ آباد رہے ہیں ایک وہ جن کا تعلق کئی انہوں سے انھی شہروں سے رہا اور دوسرے نئے آنے والے ظاہر ہے لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ پر جننا عبور پرانے باشندوں کو ہوگا اتنا نئے آنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو زبان کے دونوں مرکزوں دہلی اور لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے ہیں۔ دہلی یا لکھنؤ کے روزمرہ پر

ان لوگوں کے عبور حاصل کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا اس لیے لکھنؤ کے روزمرہ کے صحیح اور برحبتہ استعمال کی سلاجیت سرشار جیسے ادیبوں میں اور دلی کے روزمرہ کی مرزا فرحت اللہ جیسے ادیبوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ روزمرہ کے علاوہ آسان زبان لکھنا کسی بھی ادیب کے لیے ایک مشکل کام ہے بہت سے لوگ اس مشکل کو عبور کرنے کی سلاجیت رکھتے ہیں اور مرزا فرحت اللہ بیگ میں یہ سلاجیت تھی۔ آسان زبان میں کہی ہوئی بات زیادہ موثر ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مشکل زبان لکھنے کے حق میں نہیں تھے جو لوگ اردو میں عربی کے مشکل مشکل الفاظ داخل کر کے اسے بوجھل بناتے ہیں وہ ان سے خوش نہیں تھے۔ اپنے ایک مضمون کے آغاز میں جس کا عنوان عالی جناب تحصیل دار صاحب دام اقبالہم ہے انہوں نے برسبیل تذکرہ زبان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”خدا معلوم ہمارے یہاں کے مولویوں کی یہ کیا ذہنیت ہے کہ جب باتیں کریں گے تو ضرورت اور بے ضرورت عربی کے موٹے موٹے الفاظ ٹھونس دیں گے لکھنے بیٹھیں گے تو بچاری اردو کو عربی کا وہ جامہ پہنائیں گے کہ اس کے سمجھنے کے لیے ہر ایک سطر میں ایک دو دفعہ قلموس دیکھنے کی نوبت آئے بچوں کا نام رکھیں گے تو ایسا کر نوکر چا کر تو کیا خاصے پڑھے لکھوں کی زبان سے اس کا ادا ہوتا مشکل ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے بس یہی کہ کام نکالنے کے لیے گھر والے اس نام کو بگاڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے مولوی مملوک العلی صاحب کا نام بگاڑ کر مگلوبیاں ہوا اور ان کے ساتھ زاد سے بسوخت العلی صاحب کے نام لے گیتو میاں کی شکل اختیار کی اور اس نام نے وہ زور پکڑا کہ چھوٹے بڑے دوست احباب نوکر چا کر اپنے پرانے سب ان کو گیتو میاں ہی کہتے اور یہ اس عجیب و غریب نام کو سنتے اور ذرا برا نہ مانتے، اے

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں ان کا انتقال ہوا بیسویں صدی کے نصف اول کا دورہ سطح پر جن طوفانی تبدیلیوں کا حامل تھا اُسے دہرانے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ اس دوران پوری دنیا میں اور خود ہندوستان میں سماجی اور سیاسی سطح پر جو واقعات رونما ہوئے وہ اور لوگوں کے ساتھ ادیب اور شاعر کو بھی متاثر کرنے والے تھے اور انھوں نے بڑی حد تک متاثر کیا بھی چناں چہ اس زمانے میں خود اردو ادب میں فکر کی سطح پر مواد اور ہیئت کی سطح پر جو انقلاب برپا ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس اعتبار سے یہاں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ اس صورت حال سے کس طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ بظاہر وہ اپنے عہد کے سماجی سیاسی اور تاریخی ہنگاموں سے متاثر نظر نہیں آتے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور بڑی حد تک شاید ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کا کوئی سماجی سیاق و سباق نہیں ہے۔ ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ دراصل اسی ادیب کا اپنے عہد کی تاریخی صداقتوں سے بے توجہی برتنا بھی ایک مخصوص رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنے عہد کی تاریخی صداقتوں کے ساتھ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرنا چاہتا تو وہ پھر اپنے آپ کو ان میں ملوث بھی کیوں کرے گا۔ وہ ان صداقتوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی ان سے لاتعلق ہی رہنا پسند کرے گا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی بے خبر نہیں لاتعلق تھے اس لیے لاتعلق تھے کہ وہ ایک سول سرونٹ تھے۔ برطانوی سرکار کے زمانے کے سول سرونٹ اور سول سروس ان کے لیے روزی روٹی کا ذریعہ ہی نہیں ان کا طرز زندگی تھی ان کا کلٹ تھی۔ سول سروس انگریز کے ہندوستان کی ایک قدر تھی، مستحسن یا غیر مستحسن جیسی بھی ہو، چناں چہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہ صرف یہ کہ سماجی زندگی میں اس قدر کو برتا بلکہ ان کی ادبی فکر بھی اسی قدر کے تابع رہی۔ اور یہاں پھر سوال سرکاری ملازمت کے کوڈ آف کنڈکٹ کا نہیں ہے بلکہ زندگی کی اُس قدر کے ساتھ سچی ذہنی اور سماجی وفاداری کلمہ ہے جس کا نام سول سروس ہے۔ انگریز کے زمانے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے

سرکاری ملازمت کرنا ان کا خواب ہی نہیں آدرش بھی تھا جو پورا ہوا اس کے بعد تو انھوں نے زندگی کے معاملات کو اسی زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ وہ انگریز کے زمانے کے اس اریٹو کریٹ طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو سیاست میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتا تھا اس لیے سیاسی فکر کے راستے جو چیزیں ادب میں راہ پاتی ہیں وہ ان کے ہاں نہیں ملتیں اس دور میں یہی معاملہ تھوڑا بہت پطرس اور شوکت تھا نوی جیسے ادیبوں کا بھی رہا ہے۔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا تعلق تو بہر حال نظام دکن کے معاشرے کی اریٹو کریسی سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب اور زندگی کی نزاکتوں میں پڑنے کے بجائے ادب کی مجلسی حیثیت کے قائل تھے چنانچہ انھوں نے لکھتے ہوئے کبھی بھی اُس خول سے باہر باہر آنے کی کوشش نہیں جو ان کے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ ان کے اندر لکھنے کی بے پناہ صلاحیت اور قدرت تھی۔ وہ پتھر میں جو تک لگا سکتے تھے لیکن ادب ان کے لیے زیادہ تر خوش وقتی کا ذریعہ تھا۔ اس لیے انھوں نے زندگی کے حقائق خلاقانہ طور پر بیان تو کیے لیکن دانشورانہ طور پر ان حقائق کے سرے تلاش کرتے ہوئے کسی دوسری جگہ جا کر نہیں نکلے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کی دو تہائی زندگی حیدرآباد میں گزری جہاں یقیناً عمر کے ساتھ ساتھ ان کے فہم و فراست میں بھی بالیدگی آئی ہوگی لیکن ان کی تخلیقات کی فضا زیادہ تر دہلوی ہی رہی اگر انھوں نے حیدرآباد کے کچھ واقعات بیان بھی کیے تو وہ بھی دہلوی رنگ میں۔ وہ زندگی کے معاملات پر گہری نگاہ نہ ور رکھتے تھے اور ان کے بعض مضامین سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد بھی تھا لیکن اس سب کے باوجود ان کی کچھ حدود تھیں اور وہ ہمیشہ اپنی حدود ہی میں رہے۔ وہ طنز و مزاح کی صنف کی سطح پر ضرور اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ وہ پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کیپور وغیرہ کے ہم عصر ہیں لیکن فکر و دانش کی سطح پر ابوالکلام آزاد، پریم چند، نیاز فتح پوری اور اقبال جیسے ہم عصروں کی کوئی رقیب ان میں نہیں۔ وہ اپنے استاد نذیر احمد کی طرح انگریزی سرکار کے وفادار ملازم تھے لیکن اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ۔ اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ سرکاری نظام کی

وفاداری کی قدر سے پیچیدہ صورتِ حال کا جو ردِ عمل ان کے تخلیقی رویوں پر ہو سکتا تھا وہ پورا پورا دکھائی دیتا ہے۔ تذییر احمد کا اہن اوقت اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے صاحبِ بہادر اور 'سیرا' اس ردِ عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کی سماجیات بڑی دل چسپ ہے، اور اس پر تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو اکادمی دہلی کی جانب سے تقسیم ہند سے پہلے کی ادبی اور ثقافتی سرمائے کی بازیافت کی جو کوششیں جاری ہیں یہ کتاب انہی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ اس کتاب کا اصل مقصد مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت کو اردو داں لوگوں سے از سر نو متعارف کرانا ہے لہذا مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کی سات جلدوں میں سے یہ چند مضامین انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس انتخاب میں جو مضامین شامل ہیں ان کے بارے میں یہ دعویٰ قطعی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام ان کے بہترین مضامین ہیں۔ جو سکتا ہے کچھ بہت اچھے مضامین شامل ہونے سے روکے ہوں اور کچھ نسبتاً کمزور مضامین اس انتخاب میں شامل کر لیے گئے ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی ادیب کا انتخاب کرتے ہوئے اس کی اچھی تحریروں کے ساتھ ایک دو کمزور تحریریں بھی شامل کرنی چاہئیں تاکہ اس انتخاب کے ذریعے ادیب کی صحیح نمائندگی ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ ان مضامین کے انتخاب میں اچھے اور برے سے زیادہ جس چیز کا خیال رکھا گیا ہے وہ یہ کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت کی تمام جہات سامنے آجائیں۔ اس انتخاب میں ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ایسے مضامین نہ شامل کیے جائیں جنہیں بے انتہا شہرت حاصل ہو چکی ہے، جو بار بار غلامی سے چھپ چکے ہیں اور اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ یہ مضامین ہمارے ذہنوں میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس بنا پر 'تذییر احمد کی کہانی' جو ان کا سب سے اچھا مضمون ہے اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے جو مضامین ادبی تحقیق سے متعلق ہیں انہیں بھی اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ ادبی تحقیق اور ادبی تنقید آج مرزا فرحت اللہ بیگ کے دور سے بہت آگے نکل آئی ہے دوسرے یہ کہ یہ مضامین اتنے طویل ہیں کہ ہر مضمون کا حجم ایک چھوٹی سی کتاب کے برابر ہے چنانچہ بہتر یہی سمجھا گیا کہ ان طویل مضامین کے مقابلے میں مختصر مضامین کو ترجیح دی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مضامین شامل کیے جاسکیں۔ اس انتخاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعض طویل مضامین کو پورا نہیں شامل کیا گیا۔ ان کا ایک انتہائی دل چسپ مضمون 'بادایام عشرت فانی' مضامین فرحت کے حصہ سیوم اور چہارم میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر انتخاب میں اس مضمون کا حصہ دوم شامل کیا گیا ہے۔ مضامین فرحت جلد اول میں ایک مضمون 'ہم اور ہمارا امتحان' دو حصوں میں 'تصویر کا ایک رخ' اور 'تصویر کا دوسرا رخ' کے ذیلی عنوانات سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا بھی صرف پہلا حصہ اس انتخاب میں شامل ہے۔ مننا میں فرحت حصہ پنجم میں ایک مضمون 'جزیرہ بورینو کا سفر نامہ' شائع ہوا تھا اس مضمون کے ابتدائی چند صفحات ملک کی سیاسی صورت حال پر ہیں جن کا اس سفر نامے سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے جو آگے چل کر بیان کیا گیا ہے اس انتخاب میں اس مضمون کے یہی ابتدائی صفحات شامل کیے گئے ہیں یہ دکھانے کے لیے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ جیسا سونی صدی غیر سیاسی شخص اس صورت حال کو کس عینک سے دیکھتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی وفات کے تیس سال بعد ان کے بڑے لڑکے مرزا شرافت اللہ بیگ نے ان کی جو کتاب 'میری داستان'، ۱۹۷۷ء میں شائع کی تھی اس کتاب میں مرزا نے حیدرآباد کے دورِ ملازمت کے چونتیس سالوں کی روداد بیان کی ہے اور کتاب کے عنوان ہی میں اسے 'چونتیس سال کی قید بامشقت' کہا ہے۔ یہ کتاب ۳۲۰ صفحات پر محیط ہے اس کتاب کے بھی صرف وہ ابتدائی چند صفحات شامل کیے گئے ہیں جن میں دلی کو خیر باد کہہ کر حیدرآباد روانہ ہونے کا تذکرہ ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ادبی کارناموں پر تنقیدی نقطہ نظر سے ابھی تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ اردو طنز و مزاح کی بحث کے سلسلے میں ان کا نام خال خال

دیکھنے کو مانتا ہے، یا ان پر ایک دو مضامین ہیں اور بس۔ ۱۹۴۷ء میں جب مرزا فرحت اللہ بیگ کا انتقال ہوا تھا تو حمید آباد میں ایک فرحت میموریل کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس میموریل کمیٹی نے ۱۹۵۱ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ پر یادگار فرحت کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی زیر نظر کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی شخصیت کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ زیادہ تر یادگار فرحت ہی سے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ کتاب مرزا فرحت اللہ بیگ کے دوستوں، عزیزوں اور اردو ادب کی بعض مقتدر شخصیتوں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابھی تک مرزا فرحت اللہ بیگ پر بس لے دے کر یہی کام ہوا ہے۔ اگر کسی یونیورسٹی سے ان پر کوئی پی۔ پی۔ ڈی کا مقالہ لکھا گیا ہو تو کہا نہیں جاسکتا۔ یادگار فرحت کے مضامین سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی شخصیت اور ان کے ادب کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً ان کی زندگی کے بہت سے حالات تو صرف ان مضامین ہی سے پتا چلتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک اچھے مزاح نگار تھے ایک ادبی محقق اور صاحب طرز ادیب تھے اور ایک کامیاب خاکہ نگار بھی۔ اس اعتبار سے ان کی مختلف حیثیتوں پر تفصیل کے ساتھ علاحدہ علاحدہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ زیر نظر کتاب اسی ضرورت کی بنیاد پر اشارہ کرنے کی ایک اداسی کوشش ہے۔

اسلم پرویز

شروع

اس زمانے میں کسی کتاب کا چھپوانا کراہت نہیں تو کمال ضرور ہے۔ غضب خدا کا کاغذ نایاب۔ سیاہی کم یا ب۔ کاتب مغرور اور خریدار مفقود ہیں۔ اس "سے" دوہی قسم کے آدمی اپنی تصنیف چھپوا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو دیوانے ہیں اور دوسرے وہ جو "لکھ لٹ" ہیں۔ میں دوسری قسم میں تو آ نہیں سکتا۔ اور پہلی قسم میں آنا نہیں چاہتا۔ یقین مانیے کہ میرے مضامین کا یہ ساتواں حصہ کبھی نہ چھپتا۔ اگر بعض کرم فرماؤں کی غناہت شریک حال نہ ہوتی۔

دنیا میں ہر چیز شروع میں چھوٹی ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ مگر ان مضامین نے اس کلیے کو بالکل توڑ دیا ہے۔ مضامین فرحت ابتدا، رائل سائز پر چھپے تھے۔ اس کے بعد یہ گھٹ کر ڈی سائز پر آگئے۔ اور اب یہ ساتواں حصہ بڑی ننھی منی تقطیع پر آپ کے سامنے آرہا ہے۔ اگر یہی انحطاط جاری رہا۔ تو شاید آٹھواں حصہ اتنا ہو جائے کہ گھڑی کے جیب میں آئے۔ اور خوردبین سے پڑھا جائے۔

یاد ایام عشرت فانیؒ

(حصہ دوم)

اپر پراخڑی سے کیا نکلے گویا بچوں سے نکل بڑوں میں آگئے۔ یہاں کی دنیا ہی نئی ہے۔ جو لڑکا ہے آفت کا پرکالہ ہے۔ جو سو جھتی ہے نئی سو جھتی ہے جو کرگزرتے ہیں اس کا اب خیال کر کے ہنسی آتی ہے۔ عرض مدرسہ نیا۔ ماسٹر نئے۔ ہم نئے۔ ساتھی نئے۔ زمین نئی۔ آسمان نیا۔ جس مدرسے میں اب داخل ہوئے اس میں کسی زمانے میں شاہی کتب خانہ تھا۔ عمارت کیا ہے ایک جہاز ہے۔ سیدھی یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ کمرے اتنے بڑے بڑے ہیں کہ کسی اسپتال کے بھی کیا ہوں گے۔ عمارت کے دو طرف باغ ہیں اور دو طرف سڑکیں۔ باغ سے گزرے تو کرکٹ کے میدان۔ ایک بہت بڑا۔ تین ذرا چھوٹے۔ عرض مدرسے نے کوئی دو میل کا رقبہ گھیر لیا ہے۔ جیسا مدرسہ شاندار ہے ویسے ہی یہاں کے طالب علم بھی لائق ہیں۔ پڑھنے میں نہیں بد معاشی میں۔ دماغ سے اتار اتار کر وہ بد معاشیاں کرتے ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ اپنی سلطنت علاحدہ قائم کر رکھی ہے۔ باقاعدہ تخت نشینی ہوتی ہے۔ سلطان وقت کی عدول عکمی قیامت ہے۔ جب میں اس مدرسے میں داخل ہوا تو اس وقت میرے ہی برنامہ حاکم وقت تھے۔ پھر میں ہی ان کا جانشین ہوا۔ اس لیے ان کے بعض واقعات قلم بند کرنا میرا فرض عین ہے۔ ان کے حالات کا تذکرہ موقعے موقعے پر کروں گا۔ فی الحال مدرسے کا

لے اس کا پہلا حصہ مضامین فرحت کی جلد سوم میں طبع ہوا ہے۔

نقشا اور ماسٹروں کی شکلیں ذہن نشین کر لیجئے۔

مدرسے کا ایک بڑا دروازہ تھا۔ لڑکوں کو ادھر سے آنے میں ذرا چکر پڑتا تھا اس لیے یاروں نے احاطہ کی دیوار کی اینٹیں نکال نکال کر دوسرا راستہ بنایا۔ کئی دفعہ مرمت کرائی گئی۔ مگر یہ دفعہ دو تین روز کے بعد ہی وہ دیوار خود بخود گر گرا کر راستہ بن گئی۔ آخر ناچار ہو رہاں چھوٹا سا دروازہ قائم کر دیا۔ دروازہ کیوں کہ دیوار میں اتنی جگہ کر دی کہ ایک آدمی گزر جائے۔ بس یہی راستہ چلتا تھا بعد دروازہ کا راستہ برائے نام تھا۔ ادھر سے کوئی چلتا چلا تا نہیں تھا۔ اس چھوٹے سے دروازے سے نکل کر آگے بڑھے تو مدرسے کی عمارت شروع ہو گئی۔ کرسی ذرا اونچی ہے۔ چونکہ اس رخ پر مدرسے کی چوڑائی ہے اس لیے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں نہیں ہیں۔ قلابچ مار کر چبوترہ چڑھنا ہوتا ہے۔ چبوترہ پر چاروں طرف برآمدہ ہے۔ برآمدے کے گزر کر جس کمرے میں آتے ہیں اس کی میدان چوڑائی کچھ نہ پوچھو۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ٹینس کورٹ پر چھت ڈال دی ہے۔ اس کمرے میں تین جماعتیں سمیٹتی ہیں۔ شروع میں فارسی کی جماعت اس کے بعد حساب کی اس کے بعد عربی کی۔ اس کمرے سے ملا ہوا جو کمرہ ہے اس میں ہیڈ ماسٹر صاحب بیٹھتے ہیں۔ یہ کمرہ بھی بہت بڑا ہے۔ دیواروں سے لگی ہوئی کتبوں کی بڑی الماریاں کھڑی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے بعد ٹینس کی جماعت کے اس کے بعد مڈل کی اس کے بعد ساتویں کی اور اس کے بعد چھٹی جماعت کے کمرے ہیں ان چاروں کمروں کے سامنے برآمدہ اور برآمدے کے آگے چھوٹا سا صحن ہے صحن کے کنارے پر کٹہرا لگا ہوا ہے۔ اس برآمدے اور صحن کی کرسی کوئی چاب پانچ گز کی ہوگی۔ کرسی کی وجہ سے نیچے جو جگہ نکل آئی ہے اس میں پیانو، کورکٹ کے سامان اور کاجی کی کوٹھریاں ہیں۔ ماسٹروں کے حصے بھی یہیں رکھے رہتے ہیں کوئی گھنٹہ خالی ہوا اور اگر دو مہارت کے چھٹی جماعت کے کمرے سے ملا ہوا سائنس کا کمرہ ہے۔ اور اس کے برابر دو کمرے انسپیکٹ صاحب مدرسے نے رہنے کیے رکھے ہیں۔ اس کے بعد سیڑھیاں دے کر عمارت کو نیچا کر دیا ہے۔ اس حصے میں دو کمرے ہیں ایک میں اسپیشل کلاس اور دوسرے میں پنڈت بنی بیٹھتے ہیں۔ پنڈت بنی کے کمرے کے سامنے کورکٹ کا چھوٹا میدان اور اس میدان سے ملا ہوا

یورڈنگ ہاؤس ہے میرے مدرسے سے چھوڑنے کے بعد ان عمارتوں میں بہت ردوبدل ہو گیا ہے۔ کرکٹ اور ٹینس کے تین چھوٹے میدانوں اور باغ کو بڑا بڑا کر کے کئی اور عمارتیں بنا دی ہیں۔ اس طرح گنجائش تو بہت نکل آئی مگر اصل عمارت کی رونق برباد ہو گئی۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر گھنٹے کے بعد بلی انڈر منعمون بجائے ماسٹروں کے تبدیل ہونے کے جاغتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں مین باندھ کر جاتی تھیں جو کمرے جاغتوں کے نام سے موسوم تھے ان کا عرفی مطلب تھا کہ وہاں انگریزی کے مدرس بیٹھے تھے۔ اور وہی اس جماعت کے ڈیڑھ گھنٹے فارسی کے مولوی صاحب چھٹی جماعت سے لگا کر انٹرنس تک کو فارسی اور اسی طرح عربی کے مولوی صاحب مدرسے پھر کے عربی پڑھنے والے عاب غلیوں کو اپنی پڑھاتے تھے۔

پہلے میں ماسٹروں کے حالات لکھ دوں اس کے بعد دوسرے واقعات سنائوں گا کیوں کہ جب تک برما سٹر کی حالت معلوم نہ ہو جائے واقعات سن کر مزاج میں مشکل بن جس سلسلے سے میں نے کماؤں کا تذکرہ کیا ہے اسی سلسلے سے ماسٹروں کے حالات بھی لکھنا ہوں۔

فارسی کے مولوی صاحب ایک تماشائے کوئی ۶۰ سال کی ہو گئے۔ چھوٹا سا قد لمبا چہرہ سرخ و سفید رنگت، نیچی سفید داڑھی، بڑی بڑی سرس آلود آنکھیں، آن پر بوئے موٹے تالوں کی عینک چوڑا دبانہ، ہر وقت پان کھائے رہتے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے دانت نہیں رہتے تھے اس لیے پیک ٹنڈ سے بہہ بہہ کر کھوڑی اور ڈاڑھی کی خبر لاتی تھی۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ یا گول چندوسے کی ٹوپی۔ جسم پر اچکن اس کے اوپر کالی مٹھل کا چنور۔ شہابی سفید پتی در، پاؤں میں لال نری کی جوتی، بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ پڑھانے میں ہر وقت ادھرتے ادھرتے اور ادھر سے ادھر بھیدکتے پھرتے تھے۔ باتیں بھی کچھ عجیب طرح کی کرتے تھے ایک بات کی اور تالی بجائی پینتڑا بدل سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا اور اٹا ہاتھ بیچھے لے گئے پھر کوئی بات کی اور پھر وہی تالی اور وہی پینتڑا۔ غرض ان کی جماعت میں پڑھنے پڑھانے کی اتنی آواز نہیں ہوتی تھی جتنی تالیوں کی پھٹا پھٹا۔ اپنی اس خاص حرکت کی وجہ سے مدرسے تو مدرسے شہر پھر میں بیچوٹے مولوی صاحب کے نام سے شہور ہو گئے تھے۔ نسوئی مشرب آدمی تھے اگر

خدا نخواستہ کسی نے کسی بزرگ کی شان میں ذرا بھی گستاخی کی تو اس طرح پھرجاتے کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

اس کمرے کے پتے کے حصے میں حساب کے مولوی صاحب بیٹھتے تھے بڑے مضبوط اور گھٹیلے آدمی تھے پہلے حساب سکھاتے تھے۔ پھر عربی کے مولوی صاحب ہو گئے۔ گول چہرہ، سانوی رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، سُرخ بھروال ڈاڑھی، سر پر کالی ٹمبل کی چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر کشمیرے کی اچکن، اس پر کشمیری کام کا چغہ، شاعر تھے اس لیے مندرہب سے لا پروا تھے۔ ہر وقت گنگنائے رہتے تھے۔ بعض وقت تو ایسے تو ہویاتے تھے کہ ساری جماعت کی جماعت اٹھ کر چلی جاتی اور ان کو نہر بھی نہ ہوتی۔ بلا کے ہوشیار آدمی تھے۔ متین اور سنجیدہ ایسے تھے کہ خد کی پناہ۔ ان کی کمرے بچے کا حصہ بیماری ہو کر چلنی کی شکل ہو گیا تھا اس وجہ سے طالب علموں نے ان کو مولوی دنیہ کا خطاب عطا کیا تھا۔ میں پانچ برس اس مدرسے میں رہا اس کے بعد بھی کئی برس تک ان سے ملنے کا اتفاق رہا لیکن جو اچکن اور چغہ میں نے پہلے دن ان کو پہنے دیکھا تھا وہ ان سے نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹا۔ سنتا ہوں اب ان کا انتقال ہو گیا ہے شاید اسی اچکن و چغے میں دفن ہوئے ہوں۔ اس کمرے کے دوسرے کونے پر عربی کے مولوی صاحب کی جماعت بیٹھتی تھی بڑے آدھے آدمی تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی پنشن ہو گئی۔ ان سے زیادہ واسطہ بھی نہیں پڑا اس لیے ان کے متعلق کچھ سمجھنا بھی فنیسول ہے۔

اس کمرے سے ملا ہوا دوسرا کمرہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا تھا۔ یہ جتنے بدسورت تھے اتنے ہی لائق اور ہوشیار تھے۔ مگر شاہ اب نے ان کی بڑی بڑی حالت کر دی تھی۔ ہر وقت نمین رہتے تھے اور ہر دوسرے تیسرے روز چہرے کیوں کو ان کی پتلون بد لوانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کرسی پر سے گر پڑنا تو معمولی بات تھی۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے جب پڑھانے بیٹھتے تو اس طرح پڑھاتے تھے کہ پھر اس کا بھوننا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی میں ہمیشہ ان کی جماعت کا کوئی نہ کوئی طالب علم انگریزی میں اول رہتا تھا۔

ان خاص ماسٹروں کا ذکر کر کے اب میں واقعات کو لیتا ہوں بقیہ ماسٹروں کے حالات موقعے موقعے سے بیان کروں گا۔ سب سے پہلے میں طالب علموں کے بادشاہ بے تاج و ملک کے

حالات لکھتا ہوں تاکہ اس مدرسے کے لڑکوں کا کچھ رنگ معلوم ہو جائے۔ آپ کا قد کوئی پونے پانچ فٹ کا تھا۔ ایسے سوکھے تھے کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں۔ مگر اثر اور رعب ایسا تھا کہ لڑکے تو لڑکے ماسٹروں کا دم نکلتا تھا۔ ہر سال مڈل کے امتحان میں بیٹھے اور فیل ہوتے فیل کیوں نہ ہوتے پورا امتحان ہی نہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں مڈل کا امتحان دسمبر میں ہوتا تھا۔ دسمبر کرکٹ کا خاص مہینہ ہے۔ یہ کرکٹ کے عاشق تھے۔ خود تو نہیں کھیلتے تھے ہاں یہ دیکھنے کا شوق تھا۔ یہ امتحان دسے رستے ہیں کہ کسی نے جھوٹے موٹے کرکٹ دیا کہ آج تو باغ میں علی گڑھ والوں کا میچ ہے۔ بس اتنا سن لینا ان کے لیے کافی تھا۔ امتحان چھوڑ چھاڑ باغ کا استیاء واپس آتے آتے ایک پرچہ نکل گیا۔ چلو فیل ہو گئے۔ دوسرے سال آیا اور پھر کوئی نہ کوئی پرچہ ماسٹربان کے امتحان کے وہ واقعات ہیں کہ خیر سال کرنے سے منسی آتی ہے ایک دفعہ آپ نے ایک کو خرید اپنی باندھ باندھ پر بیٹھا اس کو امتحان میں لے گئے۔ خیر یہیں تک ہوتا تو غنیمت تھا۔ یہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بیٹی کو بٹھکا دیتے وہ ایسی کائیں کہیں کرتا مارا کہ دگنچ جاتا۔ بچارے کا رڈوں نے منع کیا مگر یہ کب سننے والے تھے۔ آخر جب غل شور بہت بڑھا تو دوسرے کمرے سے امتحان کے پہلے ٹنڈنٹ صاحب دیکھنے آئے کہ آخر کیا قیامت مچی ہوئی ہے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحب بائیں ہاتھ پر واہٹھائے دائیں ہاتھ سے پرچہ لکھ رہے ہیں۔ پہلے ٹنڈنٹ صاحب انگریز تھے اور بڑے غصیلے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر آگ بگول ہو گئے۔ آتے ہی ان کو ڈانٹا۔ یہ چپکے بیٹھے اپنا کام کیے گئے جب صاحب نے بہت غل مچا تو یہ بھی نہایت متانت سے اٹھے۔ پوچھی ”فرمائیے کیا فرماتے ہیں“ صاحب نے کہا امتحان کے کمرے میں کوالا نے کی اجازت نہیں ہے، آپ نے امتحان کی بدایتوں کا پرچہ نکلان کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ ”براہ کرم وہ ممانعت بنا دیجیے کہ کہاں لکھی ہوئی ہے۔ کتاب یا کوئی پرچہ امتحان کے کمرے میں لانا منع ہے۔ کوالا نامع نہیں ہے۔ پہلے قواعد میں ترمیم کر دیجیے اس کے بعد اعتراض کیجیے۔ ورنہ اس طرح فضول باتیں کر کے جو میرا وقت ضائع کیا جاتا ہے اظہار میں یونیورسٹی میں کر دوں گا“ تیر بچارے صاحب تو چپکے ہو کر چلے آئے۔ مگر خود کوٹے نے اپنا چھدکارا کر لیا۔ انگوٹھے پر اس زور سے ٹھونک ماری کہ ان کو لپٹاڑا دینا پڑا۔ ایک

دفعہ کیا کیا کہ امتحان میں بالنسب ہی لے کر پہنچے تھوڑی دیر تک تو پرچہ لکھتے رہے۔ اس کے بعد بالنسب ہی نکال کر بجائی شہ رخ کی۔ سپہ ٹنڈنٹ صاحب نے منع کیا۔ انھوں نے وہی قواعد کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ "تم کو حق نہیں ہے کہ بالنسب ہی بجا کر دوسروں کا دماغ پریشان کرو" انہوں نے کہا "بہت اچھا مجھے کسی دوسرے کمرے میں بھی دیکھیے۔ میں اس وقت اپنا دماغ بلکا کرنا چاہتا ہوں۔ طبیعت بھال ہو جائے گی اس کے بعد پرچہ لکھوں گا" خیر بڑی مشکل سے سمجھا بجا کر ان بالنسب ہی لے لی گئی۔

ان کے امتحان کا ایک واقعہ ایسا ہے کہ جب کبھی خیال آتا ہے تو سنت سنتے پرٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ نڈل کا امتحان سننا تاریخ کا پرچہ ہے یہ نہایت اطمینان سے بیٹھے مولوی ذاکر حسین کا خدمت تار سن ہند سامنے رکھے نقل کر رہے ہیں۔ ہیٹھ لے مولوی صاحب اس وقت کے گارڈ ہیں انہوں نے دیکھا کہ میں یہ کیا ہو رہا ہوں امتحان اور یہ دید و دلیری بڑے بڑے لبتے ڈگ بھرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ جو گفتگو ان میں ہوئی وہ لفظ بلفظ لکھتے ہوں۔ پڑھنے میں جب مزہ آئے گا کہ جہاں میں "تالی" لکھوں وہاں مولوی صاحب کی طرح آپ بھی پینتزاہل کر تالی بجا رہیں اور ایک ہاتھ سامنے اور دوسرا پیچھے لے جائیں۔ وہیں نہیں جہاں کہیں مولوی صاحب کی گفتگو آئے وہاں اس طرح کیجیے۔ اور سچ دیکھیے کہ ہمارے مولوی صاحب کیا طرف معجون تھے۔ اچھا تو اب دونوں میں یہ گفتگو شروع ہوئی

مولوی صاحب۔ ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ (تالی)
 یہ۔ کچھ نہیں نقل ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب۔ نکال دیے جاؤ گے (تالی)
 یہ۔ ہر کو کوئی نہیں نکال سکتا۔

مولوی صاحب نہیں نکال سکتا (تالی) ہم نکال سکتے ہیں (تالی) امتحان ہے (تالی) کوئی مذاق ہے (تالی)

یہ۔ جیسے جیسے اپنا کام کیجیے۔ ہمارے نقل کرنے میں سہج ہوتا ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔
 پرچہ بڑا ہے۔

مولوی صاحب - چلو۔ (تالی) اٹھو (تالی) صاحب کے پاس چلو (تالی)

یہ۔۔ چلے۔ ہم بھی دیکھیں آپ کے صاحب ہمارا کیا کر لیتے ہیں۔

الغرض یہ اٹھے، کتاب ہاتھ میں لی، آگے آگے مولوی صاحب اور بیچھے بیچھے یہ دوسرے

کمرے میں پہنچے۔ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے جاتے ہی تالی بجائی انہوں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

مولوی صاحب۔ غضب ہے (تالی) نقل ہو رہی ہے (تالی) بڑے گستاخ ہو گئے ہیں (تالی)

ہم سے نہیں ڈرتے (تالی) آپ سے بھی نہیں ڈرتے (تالی) کتاب کھولے بیٹھے ہیں (تالی) نقل

کر رہے ہیں (تالی) کہتے ہیں (تالی) صاحب ہمارا کیا کر لیں گے (تالی) بڑی مشکل سے لایا ہوں

(تالی) سخت سزا دی جائے (تالی)

صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا "جناب یہ مولوی صاحب میرے دشمن

ہیں۔ غم کے پہلے سے ان کے اور ہمارے خاندان میں دشمنی چلی آ رہی ہے نہ بردستی پر چہ

کھتے۔ کھتے مجھ کو یہاں گھسیٹ لائے کہ چلو میں صاحب سے کہہ کر تم کو نکلو ادیتا ہوں۔ خواہ مخواہ

کو الزام ہے آپ میری تلاشی لے لیں۔ کوئی میں دیوانہ تھا جو اس طرح سانسے کتاب رکھ کر نقل

کر تا۔ نقل کرتے ہیں تو چھپ چھپا کر نقل کرتے ہیں۔ نہ اس طرح کہ سامنے کتاب کھولے بیٹھے ہیں

نقل کر رہے ہیں،" صاحب کو بھی یہ بات نہ لگتی معلوم ہوئی ان کی خوب اچھی طرح تلاشی لے لی گئی

کتاب تو کتاب ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہ نکلا۔ آخر صاحب نے بچارے مولوی صاحب کو بہت

ڈانٹا کہ آپ فنسول امیدواروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ آئندہ ایسا کیا تو کم سے نکال

دوں گا۔ بہر حال مولوی صاحب شرمندہ شکل وہاں سے واپس ہوئے۔ آگے آگے مولوی صاحب

اور بیچھے بیچھے یہ مولوی صاحب پریشان تھے کہ یا اللہ آئے وقت کتاب اس کے ہاتھ میں تھی ایک

کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے آتے کہاں، سب ہو گئی۔ آخر نہ رہا گیا اور خود ان سے پوچھا

مولوی صاحب۔ کتاب کہاں ہے۔ (تالی) آئے وقت تمہارے ہاتھ میں تھی (تالی) راستے

میں کہاں غائب کر دی۔ (تالی)

یہ۔۔ کچھ نہیں راستے میں ایک ایک صفحہ کر کے کھا گیا۔

یہ سننا تھا کہ مولوی صاحب نے وہیں سے دسے تالی پہ تالی بجانی شروع کی۔
 مولوی صاحب - غضب ہے (تالی) کھا گیا (تالی) ساری کتاب کھا گیا (تالی)
 صاحب نے جو یہ تالیوں کی آواز سنی تو یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا معاملہ ہے حکم دے دیا کہ
 مولوی صاحب کو کمرے سے باہر کر دیا جائے۔ خیر بچارے نکال دیے گئے۔ اس واقعہ کو بیان
 کر کے برا بھلا کہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ دونوں آگے پیچھے چلے تو بجائے
 اس کے کہ کتاب خود لے لیتے۔ کتاب امیر وار صاحب ہی کے ہاتھ میں رہنے دی۔ کتاب تھی
 بہت چھوٹے چھوٹے بارہ ورق کی۔ و دراستہ میں چٹ کر گئے۔ بھلا تلاشی میں کیا نکلتا۔

سچ اچھے رہے خود آپ مگر ان کو ڈبو آئے

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان پر روسیوں کے حملے کا بڑا غل تھا۔ عجیب عجیب خبریں روز
 اڑا کرتی تھیں۔ کوئی کہتا روسی لاہور میں آگئے۔ کوئی کہتا میرٹھ لے گیا۔ غرض کوئی کچھ کہتا کوئی
 کچھ کہتا۔ انہی دنوں میں ہمارے دوست اور مڈل کی جماعت کے ماسٹر صاحب میں ان بن ہو گئی
 یہ۔ ماسٹر صاحب بڑے افسی تھے۔ ہوشیا بھی بہت تھے۔ مگر ذرا چندھے تھے۔ آپ نے
 پٹاس کا ایک بڑا گولہ لاکر ماسٹر صاحب کی کرسی کے پائے کے برابر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد
 کہا "ماسٹر صاحب۔ ابھی جو آپ نے سمجھا یا سنتے۔ ذرا پھر سمجھا دیجیے۔" وہ بچارے چاک لے
 سمجھانے پورڈ پر پلے۔ کرسی کا پایہ لگا گولہ میں گولہ دن سے اڑا۔ ماسٹر صاحب ایک طرف
 گرے اور کرسی اتنی دور اڑ کر گئی۔ انہوں نے غل مچایا روسی۔ تمام مدرسے میں روسی۔ روسی
 کا ہنگامہ پٹ گیا۔ جو ہے کمرے سے نکل روسی۔ روسی پکارتا بھاگا چلا جاتا ہے۔ بڑی دیر کے
 بعد سب کے اوسان درست ہوئے لیکن آخر تک کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ آخر یہ واقعہ کیا تھا۔

لڑکوں میں تو کیا بہت تھی جو ان کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالتے۔ ماسٹر بچارے کیا
 سمجھ سکتے تھے کہ یہ آواز کیا ہوئی اور کیوں ہوئی۔ چند روز بڑی گھڑ بڑ رہی۔ اس کے بعد گئی گزری بات
 ہوئی۔ مگر روسی، روسی کے غل کا زور بہت دنوں تک چلا۔ جہاں کہیں ذرا گھڑ بڑ ہوئی اور لوندوں
 نے غل مچایا روسی، روسی۔ ان بادشاہ سلامت کے دو وزیر باتدبیر بھی تھے ایک مسلمان
 دوسرے ہندو۔ مسلمان وزیر تو تلے اور بڑے آفت کے پرکالہ تھے۔ ہندو وزیر بنگال کے

بنے والے تھے۔ مگر غضب کے لڑاکا۔ ایک دفعہ تو ان دونوں نے ایسا ظلم کیا کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جتنا پرتیراکی کا میلہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر سے کہا گیا کہ چھٹی دی جائے انھوں نے انکار کیا۔ بادشاہ نے اپنے وزیروں کو حکم دیا کہ چھٹی کا کوئی بندوبست کیا جائے۔ ان دونوں بد معاشوں نے وہ کیا کہ خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مدرسے کے سامنے باغ تھا۔ باغ میں آم کے ایک درخت میں بڑی شہد کی مکھیوں کا چھتہ لگا ہوا تھا۔ ان دونوں نے باغلیوں سے چھتے پر غلے برسانے شروع کیے۔ مکھیوں نے مدرسے کا رخ کیا تمام لڑکوں اور ماسٹروں کو کاٹ کاٹ سو جا دیا۔ دو لڑکوں کو تو اتنی مکھیاں لپٹن کہ دونوں وہیں ڈھب ہو گئے۔ ایک دن کیا چار روز تک مدرسہ بند رہا۔ کمال یہ ہوا کہ باوجود یہ سب کچھ ہونے کے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مکھیاں کیوں اڑیں اور کس نے اڑائیں۔ یہ موز سلطنت تھے جو اب تیس برس بعد پبلک پرنٹا پر کیے جا رہے ہیں۔

مولوی دنبہ سے ہمارے بادشاہ سلامت بھی بہت چکراتے تھے۔ ان کی متانت ان کے ڈنڑے قبضے اور ان کی چٹکی کے مقابلے میں تو سب کی بہت پست تھی۔ چٹکی ایسے پیتے تھے کہ واہ واہ جس کے چٹکی یعنی ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑے ہوئے۔ ہاتھ میں کنجی لی۔ انگوٹھے اور کنجی کے بیچ میں لونڈے کے ڈنڑے کی مچلی دبا کر مسلنا شروع کیا۔ اب یہ کھڑے نہایت اطمینان سے گوشت مسل رہے ہیں۔ لڑکائے کہ تلمل رہا ہے۔ جب بچہ تکیف سے زمین پر لوٹنے ہی لگتا اس وقت کہیں جا کر اس چٹکی سے چھٹکا راملتا۔ ایک دن شامت اعمال سے مولوی صاحب نے ان کو بھی چڑکا دیا۔ سہلا ان کی تو بین ہو اور یہ خاموش رہیں۔ بارٹے کا موسم تھا۔ مولوی صاحب ٹھنڈک سے بچنے کے لیے ڈھسے لے کر آئے تھے۔ ڈھسہ پچھا کر سی کو نرم اور گرم کر لیا تھا۔ مولوی صاحب تو حساب سمجھانے بورڈ پر گئے۔ یہ چیکے چیکے کنی کاٹتے پختے پچاتے اپنی جگہ سے اتر کر سی تک پہنچے۔ مولوی صاحب کے ڈھسے کی اینڈرٹی بنائی اور وہیں سب کے سامنے کھڑے ہو کر

سے چٹکا دینا اس کمترین کا ایجاد کردہ لفظ ہے چٹکی لینا سے بنایا ہے افسوس ہے مولوی سلیم نے وہ اس لفظ کی تعریف کرتے مصنف سے اسے حیدرآباد میں اینڈری کو چٹا کہتے ہیں۔ اینڈری کپڑے کا وہ گول حلقہ ہوتا ہے جو پہناریاں پانی کا گھڑا یا مٹکا ڈکانے کے لیے سر پر رکھتی ہیں۔

نہایت اطمینان سے اس میں پیشاب کیا۔ اس کام سے فارغ ہو۔ پیجامہ باندھ اپنی جگہ آ بیٹھے۔ مولوی صاحب کی ادھر بیٹھ تھی۔ ان بچارے کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا۔ بھلا لڑکوں کی کیا ہمت تھی جو کچھ زبان سے نکالتے یا کہتے۔ غرض مولوی صاحب حساب سمجھا کر سی پر آ بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سین پہنچی۔ اب کبھی یہ پہلو بدلتے ہیں۔ کبھی وہ غضب یہ تھا کہ کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں لونڈے یہ نہ اڑادیں کہ مولوی صاحب کا پیشاب خطا ہو گیا۔ آخر گنڈا بن گیا۔ جماعت اٹھ گئی اور مولوی صاحب سوپتے کے سوپتے ہی رہ گئے۔ اب اس سے چارے سلطان وقت کے رعب کا اندازہ کر بیچے کہ یہ معاملہ ساری جماعت کی جماعت کو معلوم تھا مگر از سلطنت بنا رہا۔ اور کسی کے منہ سے بچا پ تک نہ نکلی۔

بیس سال میں اس مدرسہ کی چھٹی جماعت میں پہنچا۔ اسی سال انھوں نے اسکول چھوڑا اور مجھ کو اپنا جانشین مقرر کر کے تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ ایک چھٹی جماعت والے لڑکے کا والی مدرسہ ہونا تعجب نہ امت۔ بات یہ تھی کہ سلطنت مجھے ارشاد پہنچی۔ سلطان سابق میرے والد کے بیٹے بنے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے تخت سے دست برداری کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا اور مدرسے کے ہر چھوٹے بڑے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ "اگر اس لڑکے کے حکم کی خلاف ورزی کی یا اس کی مخالفت میں علم بناوت بند کیا تو مجھے دور نہ سمجھنا جب تک یہ حکومت کے قابل ہو اس وقت تک میں اس کا بھٹ ہوں۔ جینا مشکل کر دوں گا۔ مجھے بھی رازبانہ سلطنت سے آگاہ کیا۔ اور ہدایت کی کہ اگر کوئی مشکل ایسی پڑ جائے جس کا حل کرنا دشوار ہو تو بلا تکلف مجھ سے مشورہ کرنا۔ میں مختاری مدد کو ہر وقت تیار ہوں۔ بیچے گیا رو برس کی عمر میں ہم پر سلطنت کا بار پڑ گیا۔ میرا زمانہ حکومت کو ایسا درختاں تو نہ تھا جیسا میرے پیشرو کا تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ میں کبھی کسی سے دب کر نہیں رہا۔ مجھ میں اور سلطان سابق میں صرف یہ فرق تھا کہ ان میں صرف شرارت ہی شرارت تھی۔ میں جتنا شرارت میں تیز تھا اتنا ہی پڑھنے لکھنے میں بھی تیز تھا۔ پانچویں جماعت میں بھی مجھے سرکاری وظیفہ ملا۔ اور جب تک میں اس مدرسے میں رہا ہمیشہ وظیفہ لیتا رہا۔ جماعت میں کبھی کسی کو اپنے سے بڑھنے نہیں دیا۔ چنانچہ اب تک میرے تعلیمی کارنامے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔ جا کر دیکھ لیجئے۔

ع نسبت است بر جریدہ عالم دوام ما

میں نے حکومت کا چارج لیا ہی تھا کہ ٹھوکر کمانی میری جماعت میں ایک لونڈا تھا اپنے کو
 بڑا ہی خوبصورت سمجھتا۔ اور بڑی چٹک ٹک سے چلتا تھا۔ یہ اس سے تو مجھے کیا منس تھی۔ مگر
 اس میں چنلیاں کھانے کا برا مرض تھا۔ اس کے دو چار گہرے دوست بھی تھے یہ چغلی کھاتا وہ
 گواہی دیتے۔ ان لوگوں نے دو تین لڑکوں کو بلا وجہ پٹوایا۔ ہماری جماعت کے ماسٹر ایک بنگالی
 بابو تھے۔ کال رنگت 'وحشت زدہ شکل' فقیروں کا لباس، بڑی بڑی پریشان سفید موچھیں،
 حقہ بہت پیتے تھے۔ اس لیے موچھیں زرد ہو گئی تھیں آگے ساتنی بھکی ہوئی تھیں کہ ہمیشہ
 آدھی موچھیں ان کے منہ میں رہتی تھیں۔ بڑے بے وقوف آدمی تھے۔ اس لڑکے نے جو کچھ
 بنا کر کہا وہ انہوں نے مان لیا۔ پھر کسی سے نہ پوچھتے نہ گتھے اٹھ دوسرے لڑکوں کی مرمت
 کر دیتے۔ لڑکوں نے مجھ سے آکر شکایت کی۔ مجھے خود اس لونڈے کی باتوں سے نفرت تھی۔
 میں نے اس کو حکم دیا کہ یا تو وہ اس طریقہ عمل کو چھوڑے یا مدرسے سے نکل جائے۔ اس نے
 دوستوں سے مشورہ کیا انہوں نے کہا "ابے بکنے دے۔ وہ دن گئے جب خلیل ناں فاختہ ارا
 تھے۔ اب ہم خود ان کو ٹھوک دیں گے" "یہ کچھ دن یونہی گزر گئے اس لونڈے نے اپنے یاروں کے
 بل پر اور ہاتھ پاؤں نکالے۔ اس کی چغلیوں پر دو چار لڑکے اور پٹ گئے۔ یہ سبھی بغاوت تھی
 اور مجھے اس کا انتظام کرنا ضرور تھا۔ ایک دن صبح کے وقت مدرسے کے سارے لڑکے میدان
 میں جمع تھے۔ میں اپنی فوج کے دو افسروں کو لے کر پہنچا۔ اور اس لڑکے کی ایسی درگت بنائی کہ
 اس کی ساری چٹک ٹک ناک کے رستے نکل گئی۔ مدرسے کا گھنٹہ بجا۔ سب اپنی اپنی جماعتوں
 میں چلے گئے۔ اس لڑکے نے جا کر بابو جی سے شکایت کی۔ اس کے دوستوں نے گواہی دی رہا بو
 جی آگے بگولہ ہو گئے۔ بیت اٹھا میری طرف بڑھے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا "بس اب ایک قدم
 آگے بڑھایا تو اچھا نہ ہوگا" بابو جی وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ کہنے لگے "تو ہم سے غدر کرتا ہے"
 میں نے کہا "ہاں غدر کرتا ہوں۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے قلم سے کیجیے۔ اگر ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ توڑ دوں گا"
 بابو جی منہ میں بڑ بڑاتے رہے۔ جھکتے، بیٹھ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ وہاں جا کر خبر نہیں کیا
 سمجھایا۔ سمجھایا کہ بیٹھ ماسٹر صاحب نے میرا نام مدرسے سے خارج کر دیا۔ بیٹھے سر منڈاتے ہی اولے

پڑے سچ ہے۔ یہ ایسی مصیبت تھی کہ اس کا حل کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں سیدھا اپنے ایجنٹ کے پاس پہنچا۔ انھوں نے کہا "انھیں کیا بڑی بات ہے ابھی نام داخل ہو جاتا ہے"۔
 نیو وہ مجھ کو لے کر مدرسے آئے خود مدرسے کی دیوار پر بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا "دیکھو تین بجے ہیڈ ماسٹر صاحب پہنچانے جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلیں گے۔ وہ سامنے ان کا بیجانہ ہے۔ جب کرکٹ کے اس چھوٹے میدان کے پتھ میں پہنچیں اس وقت ان کا راستہ روک لینا۔ قلم دوات کا غنڈ اپنے پاس رکھو۔ جب تک ان سے اپنے داخلے کا حکم نہ لکھو اس وقت تک ان کو نہ چھوڑنا۔ اگر چھوڑ دیا تو تمام غنڈ داخل نہ ہو سکیں گے"۔ میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے اور دیکھتے رہیے۔ میں حرف بحرف آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا"۔ یہ کہہ کر میں بورڈنگ میں گیا۔ وہاں سے کاغذ قلم دوات لایا اور مدرسے کی دیوار پر اپنے محسن کے برابر ہو بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد چھپڑی لوٹا لے کر نکلا وہ پہنچانے میں لوٹا رکھ کر واپس جا رہا تھا کہ اس کو میرے ایجنٹ نے پکارا ان کی صورت دیکھتے ہی وہ بھاگا ہوا آیا۔ اور کہا "حسنو۔ آج آپ کہاں" انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "ان کے ایک کام سے آیا ہوں۔ آج ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ بیجانہ تک سونے گئے گا"۔ چھپڑی نے کہا "ہیں" انھوں نے کہا "تم پیچھے رو جاؤ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پکاریں گے تو نہ جانا۔ یہ کیوں کرو۔ میرے پاس کھڑے رہو جب میں کہوں اس وقت جانا"۔ وہ بے چارہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے کمرے سے نکلے۔ خوب پیسے ہوئے تھے چھوٹے جھانٹے آہٹ آہٹ جوں کی پال چلتے میدان میں آئے۔ وہ پتھ میدان میں پہنچے تھے کہ میں بھاگتا ہوا گیا۔ اور ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگے "بھئی تم کون ہو" میں نے کہا "جناب میں اسی مدرسے میں ہوں۔ چھٹی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ آج آپ نے بابو جی کے کہنے سے میرا نام خارج کر دیا ہے۔ میرا نام پھر داخل کر دیجیے نہیں تو میری پڑھائی کا ستیاناس ہو جائے کہنے لگے "اچھا بھئی۔ اب تو تم جاؤ۔ میں آکر بابو جی سے پوچھوں گا۔ گھبراؤ نہیں۔ تمہارا نام داخل ہو جائے گا"۔ میں نے کہا "تو ابھی لکھ دیجیے۔ کہنے لگے "جلدی کیا ہے۔ ابھی دو منٹ میں آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر ذرا کتر کر نکلنے لگے۔ میں نے ذرا ہٹ پھران کا راستہ روک دیا۔ اس پر انھوں نے ذرا غصہ ہو کر کہا "تم بڑے شریر معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ۔ اب کبھی تمہارا نام اس مدرسے میں نہیں لکھا جائے گا"۔

یہ اثر ہوا کہ میں بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا۔ اور دوسرے لڑکے بھی جان گئے کہ یہ پلپلا لونڈا نہیں ہے۔ اگر کچھ سر اٹھایا تو ٹھوک ہی دے گا میں نے مدرسے میں حکومت ضرور کی۔ مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ میری شرارت نے میری شرافت کو کبھی نہیں دبایا۔ گڑ بڑ ہمیشہ مچائی مگر شرافت کا پہلو کبھی نہیں چھوڑا۔ اور یہ ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ صرف شرارت کرنے ہم یہاں نہیں آتے ہیں کچھ پڑھنے بھی آتے ہیں۔

اگر کسی مدرسے میں باغ ہو تو سمجھ لو کہ باغ کی بھی تباہی ہے اور باغبانوں کی بھی تباہی۔ یہی چیز مدرسے میں سب سے بڑا جھگڑے کا جھونپڑا ہوتی ہے ہمارے مدرسے کے سامنے جو قطعہ تھا اس میں ہزار ہا امود کے درخت اور کرکٹ کے میدان سے ملا ہوا جو حصہ تھا اس میں سینکڑوں آم کے درخت تھے۔ میدان کی لبان میں شہتوت ہی شہتوت لگے ہوئے تھے۔ یہ سارے کا سارا باغ ٹھیکے پر دیا جاتا تھا۔ کوئی دن نہ جاتا ہو گا جو باغبانوں اور لڑکوں میں مار پیٹ نہ ہوتی ہو۔ لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ سلطان وقت کمانڈر ان چیف بنتے اور دس دس بارہ بار لڑکوں کی ٹولیاں بنا کر چاروں طرف سے باغ کو گھیر لیتے۔ سیٹی بھی اور ایک ٹولی امود کے کسی درخت پر گری۔ باغبانوں نے ادھر کا رخ کیا۔ ادھر ان کا منہ پھرا اور دوسری سیٹی بھی۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ دوسری ٹولی نے دوسرے تختے پر چھا پہ مارا۔ کچھ باغبان ادھر رہے کچھ ادھر آئے کہ تیسرے پہلو سے حملہ ہوا۔ غرض تھوڑی سی دیر میں اودھم مچ گیا۔ جب دیکھا کہ فون دب رہی ہے یا کافی مال غنیمت ہاتھ آچکا ہے تو اس وقت واپسی کا بگل بجا۔ سب حملہ آور اور دھجولیوں میں بھرے ایک جگہ جمع ہوتے۔ کچھ امود پھینک دیے گئے۔ پکے پکے سب میں برابر تقسیم ہو گئے۔ مندر رسیدوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اور دو ایک روز کے لیے لڑائی موقوف ہوئی۔ پھر ذرا امود گدرائے اور پھر دوسرے حملے کی تیاری ہوئی مجھے لڑکوں کا یہ جوش تو بہت پسند تھا اور لڑانے میں فراہمی بہت آتا تھا۔ مگر غریب باغبانوں کے نقصان سے رنج ہوتا تھا۔ شروع عہد حکومت میں چند حملے تو میں نے کیے۔ لیکن پھر اس لوٹ کھسوٹ سے دل بیزار ہو گیا۔ آخر ایک تجویز سوچی۔ چند ذرا کھاتے پیتے لڑکوں کو بلا کر کونسل کی اور کہا ”بھائیوں ان حملوں کو تو روکنا اچھا نہیں۔ کیونکہ اس سے ہم طالب علموں میں جرأت بڑھتی ہے۔ جوش بڑھتا ہے اور پٹنے

پٹانے کی مشق بھی ہو جاتی ہے۔ مگر ان بچارے باغبانوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ غریب پٹتے تبھی ہیں اور رقم کا نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ان لوگوں سے کچھ سمجھوتا کر لیا جائے۔ ہم حملہ کریں۔ یہ مقابلہ کریں آخر میں جو ان کا نقصان ہو وہ ہم آپس میں چندہ کر کے ادا کر دیں۔ ایک صاحب بڑے منطقی تھے۔ کہنے لگے کہ "جناب اگر یہ بد معاش سارا باغ لٹوا کر ہم سے پیسے مانگ بیٹھیں تو کیا ہو۔ لڑنے کا لطف نہ آئے اور پیسے مفت جیائیں" بات واقعی معقول تھی۔ سب نے تائید کی۔ آخر بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ اگر باغیاں جیسا اب کرتے ہیں ویسا نہ کریں تو ایک پیسے کے حق دار نہیں۔ ہاں پوری لڑائی کے بعد جو نقصان ہو گا وہ ادا کر دیا جائے گا۔ مدرسے بھر سے یہ تجویز پوشیدہ رکھنے کا عہدہ لیا گیا اور ملک کو بلا کر سب کچھ سمجھا دیا گیا۔ لڑکے جب حملہ کرتے تو یہ سمجھتے کہ ہم مالیوں کا مال لوٹ رہے ہیں مالی یہ سمجھتے کہ ہمارا مالی نقصان ہو رہا ہے اس لیے کسی نہ کسی طرح ان لڑکوں کو باغ سے نکلنے کی کوشش کرتے۔ ملک سمجھتا کہ جو نقصان ہو گا وہ مجھ کو مل جائے گا۔ اس طرح لڑائی ہوتی اور خوب ہوتی۔ آخر میں ملک سے جب حساب ہوتا تو زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آنے پیسے دینے پڑتے۔ آپس میں ایک ایک دو دو آنے چندہ کیا دے دیے۔ اگر کسی لڑکے نے بدوجہ کپے دو توڑے یا بلا نہ ورت درختوں کو بلا بلا کر ام و دوں کا ستیاناس کیا تو اس پر جرمانہ ہو گیا اور آئندہ کے لیے کچھ عرصے تک اس کو حملہ آوروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

آم کے درخت اونچے تھے۔ وہاں جو حملہ ہوتا وہ پتھروں سے ہوتا۔ وہ زنانہ پتھر پلٹنے کے خدا کی پناہ۔ مالیوں کے پاس گوہن تھے وہ ان سے لڑکوں کی خبر لیتے گوہن سے پتھر چلدا اور لڑکے درختوں کی آڑ میں ہوئے۔ پتھر کسی درخت کے تنے پر کھٹ سے بیٹھا اور پھر حملہ شروع ہوا۔ لطف تو اس وقت آتا تھا جب کوئی زرد زرد آم ٹپ سے گرتا تھا۔ ادھر سے لڑکے بڑھتے اور ادھر سے مالی اب نہ لڑکے آم تک جاسکتے ہیں اور نہ مالی صاحب۔ پینترے کٹ رہے ہیں۔ اس درخت کے پیچھے سے نکلے اس درخت کے پیچھے جا چھے۔ کوئی مالی ہمت کر کے ذرا سامنے آیا اور پتھر پڑا۔ اسی طرح چھپتے چھپاتے پختے بچاتے آم تک پہنچ ہی جاتے۔ آم پر کسی کا ہاتھ پڑا اور آم غائب ہوا۔ گیند کی طرح ہاتھوں ہاتھ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔

شہوت کا معاملہ ان سب سے مختلف اور مشکل تھا۔ درخت نہ اتنے پتلے تھے کہ ان کو ہلا کر شہوت جھاڑ سکیں اور نہ اتنے نیچے تھے کہ ہاتھ سے توڑ سکیں۔ جو شہوت زمین پر گر جاتے وہ کھانے کے قابل نہ رہتے۔ اس لیے درختوں پر چڑھ کر اور وہیں توڑ کر کھانا پڑتا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی لڑکا کسی نہ کسی درخت پر ٹنکا ہے۔ ان درختوں کی رکھوالی پر کوئی باغبان نہ رہتا تھا۔ کرکٹ کے میدان کے دوسری طرف آموں کے درختوں کے نیچے ان کی جھوپڑیاں تھیں۔ جہاں انھوں نے دیکھا کہ کوئی لڑکا کسی درخت پر چڑھا اور ان میں سے کوئی نہ کوئی لڑکا۔ اس کے میدان پار کتنے کرتے لڑکے نے اچھی طرح اپنا پیٹ بھر لیا۔ یہ قریب آیا اور لڑکا درخت پر سے کود رہا وہ جا۔ سامنے سڑک تھی سڑک پر کیا پہنچے کہ سہ پار ہو گئے۔ باغبان اس کا پیچھا چھوڑ درختوں کے نیچے آکھڑا ہوا۔ لڑکا کہیں ادھر ادھر پھیرا رہا۔ ادھر یہ بلا دفع ہوئی اور ادھر وہ لڑکا پھر درخت پر آ موجود ہوا۔ غرض شہوت کے درختوں کا تو برا۔ نام ہی ٹھیکہ تھا۔ اللہ کے فضل سے سائے شہوت لڑکے ہی کھا کھا درختوں کو خالی کر دیتے۔

ان ہی دن رات کی لڑائیوں نے ہمارے مدرسے کے لڑکوں کو اتنا ہمت والا کر دیا تھا کہ کسی دوسرے مدرسے والوں کو خاطر میں نہ لانے تھے۔ میں مڈل میں تھا کہ ایک مدرسے سے بڑا بڑا دست مقابلہ ہو گیا۔ ہمارے مدرسے سے شہر کو جانے کے لیے ریل کے پل پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایک دوسرا بڑا مدرسہ شہر میں تھا۔ وہاں کے لڑکوں کو اپنے بورڈنگ ہاؤس آنے کے لیے اس پل کو دوسری طرف سے عبور کرنا ہوتا۔ دونوں مدرسوں میں ایک ہی وقت چھٹی ہوتی اور لڑکوں کی یہ مخالفت۔ وہیں آٹھ پل کے بیچ میں ملتیں کبھی کبھی کچھ نوک جھوک بھی ہو جاتی۔ مگر باقاعدہ لڑائی کی نوبت نہ آتی۔ خدا معلوم یہ اتفاق تھا یا شرارت کہ ایک دن ان لوگوں نے ہمارے مدرسے کے ایک لڑکے کی ٹوپی پل پر اتار ڈالی۔ ٹوپی پل کے نیچے جا پڑی۔ اس لڑکے نے آ کر مجھ سے شکایت کی یہ مدرسے کی عزت کا معاملہ تھا۔ فوراً کونسل آف وار ہوئی پچیس تیس لڑکوں کی ایک پلیٹن مخالفین کی تہنید کے لیے بنائی گئی۔ صبح کے مدرسے تھے۔ بارہ بجے چھٹی ہوئی اور پل کے عین وسط میں دشمنوں پر ہلہ بول دیا گیا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ بری طرح پٹ گئے۔ دوسرے دن اس مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کے

پاس آئے۔ دونوں انگریز تھے۔ اس لیے ڈر ہوا کہ کوئی آفت نہ آجائے جب وہ چلے گئے تو صاحب نے مجھ کو بلایا۔ واقعہ پوچھا۔ میں نے صحیح صحیح حال کہہ دیا۔ کہنے لگے "میں تمہاری کارروائی سے بہت خوش ہوا۔ ابھی صاحب سے میں نے کہہ دیا ہے کہ میں ایسی باتوں سے اپنے مدرسے کے لڑکوں کو نہیں روک سکتا۔ اپنے مدرسے والوں سے کہ دو کہ اگر حجت ہے تو مقابلہ پرائیں نہیں تو پل کے نیچے کھڑے رہیں۔ جب ہمارا مدرسہ گزر جائے اس وقت پل پر قدم رکھیں اور دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر پٹ کر آئے تو مدرسے سے نکال دوں گا۔ لڑو اور خوب لڑو بارے تو مجھے منہ نہ دکھانا۔" بیڈ ماسٹر کے اتنے کہنے نے ہم کو اور شیر بنا دیا۔ اس وقت سارے لڑکے جمع ہوئے، باقاعدہ فوج مرتب ہوئی، عہدہ تقسیم ہوئے، نکلنے کی ترتیب قائم ہوئی۔ بارہ بجے چھٹی کا گھنٹہ بجایا۔ اور مدرسے کے دروازے سے سلسلے وار فوج نکلنی شروع ہوئی۔ خدا بہتہ جانتا ہے کہ اس وقت وہ نقشا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے لڑکوں میں وہ جوش تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ آگے آگے ہر دستے کے افسر تھے۔ سامنے مضبوط مضبوط لڑکے ان کے پیچھے ذرا کمزور لڑتے۔ مگر کمزوروں کا بھی یہ حال تھا کہ پیچھے سے ہاتھ تھے۔ آہستہ آہستہ یہ سیلاب پل کی طرف بڑھا۔ اور اس طرح بڑھا کہ پل پر چلنے کا رستہ بالکل بند کر دیا۔ لڑائی کا یہ نقشا قائم کیا گیا تھا کہ پہلے دشمنوں کو دھکیل کر پل کے اس طرف اتار دیا جائے جہاں وہ آئے ہیں کیونکہ پل بہت پتلا اور بہت اونچا تھا۔ ڈر تھا کہ کوئی اس لڑائی میں پیچھے نہ جا کرے۔ سب سے آگے میں اور میرے دو کپتان تھے۔ ہم کوئی آدھے پل تک پہنچے ہوں گے کہ دوسرے مدرسے والے بھی پوری تیاری کے ساتھ پل کے دوسرے کنارہ پر نمودار ہوئے۔ ہم نے ترتیب کے ساتھ ذرا قدم بڑھایا کہ پل کے کنارے ہی پران کو روک دیں۔ وہ پل کے کوئی بیس پیچیس قدم ادھ آئے ہوں گے کہ دونوں فوجیں بالمتقابل ہو گئیں۔ میں آگے بڑھا اور کہا "دیکھیے حضرات۔ لڑائی کی ابتداء پر سوں آپ نے کی ہے۔ اگر آپ معافی مانگ لیتے ہیں تو لڑائی ابھی ختم ہو جاتی ہے۔ نہیں تو فیصدا قسمت کے ہاتھ ہے۔" ان کے ایک کالے سے ماسٹر سامنے آئے اور کہنے لگے کہ "یہ سہ کارہی پل ہے اس کو روکنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ ہم پولیس میں رپورٹ کر دیں گے۔ میں نے کہا "آپ شوق سے پولیس میں جائیے۔ مگر آپ کے پولیس میں جانے سے پہلے آپ کی یہ دستار مبارک پل کے نیچے

جاتی ہے۔ میں نے یہ کہہ ان کی پیکڑی اچھال دی۔ اور وہ تھوڑی ہی دیر میں ٹھوکر میں کھاتی
 خدا جانے کہاں کی کہاں پہنچ گئی۔ اب کیا اتحاد و نون فریق لڑنے کا ارادہ کر کے پہلے سے آئے تھے۔
 اتنی سی کارروائی آگ لگا دینے کے لیے بہت کافی تھی۔ بس چل گئی۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے
 اور ہم پیچھے ہٹانے کی۔ ہاتھ پائی کا دونوں میں سے کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ صرف فٹ بال کے
 نونوں کے تلے ہو رہے تھے کوئی دس منٹ کی دھکا پیل کے بعد دشمن نے جگہ چھوڑی اس کا بگ
 سے ہٹنا تھا کہ پیچھے سے ریلا پڑا۔ اور ریلے کے ساتھ ہی ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پل سے اتر کر انھوں
 نے سڑک پر پھر پورا جمایا۔ اور اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ مگے بھی چلے۔ کشتیاں بھی ہوئیں
 ہاتھ پائی بھی ہوئی۔ غرض ساری سڑک میدان جنگ بن گئی۔ تعداد سے دیکھا جائے تو وہ لوگ
 ہم سے کہیں زیادہ تھے۔ لیکن تعداد ایک جدا چیز ہے اور ہمت اور استقلال دوسری چیز ہے۔
 بیس ہی منٹ میں دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور سب اسی طرح بے تنہا شاہجاگے کہ بہت سی کتابیں
 جوتے اور ٹوبیاں وہیں چھوڑ گئے۔ مال غنیمت جمع کیا گیا۔ زخمیوں کی دیکھ بھال ہوئی اور سب
 ایک فتح مندانہ جوش کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ ادھر تو
 لڑکوں میں مقابلہ ہو رہا تھا اور ادھر دونوں مدرسوں کے ماسٹروں میں لڑائی شروع ہو گئی۔
 ہمارے تھوڑے ماسٹر صاحب بڑے ٹکڑے تھے۔ کشتی بھی جانتے تھے۔ ان کا مقابلہ ایک بڑی لمبی ڈاڑھی
 والے ماسٹر ہو گیا۔ تیر انھوں نے اس بچارے کو جوتے دئے سو دئے اس پاڈکی میں
 اس کی آدھی ڈاڑھی بھی نوچ لائے اور یہ ڈاڑھی مال غنیمت کا ایک جزو قرار پائی۔

دوسرے روز صبح کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بلایا اور لڑائی کے حال پوچھا۔ میں نے
 تمام واقعات اذالفت تالیے ان سے بیان کر کے جو مال اس جنگ میں ملا تھا سامنے رکھ دیا۔
 ڈاڑھی کو دیکھ کر وہ بہت ہنسے اور ان سب چیزوں کو ایک چھٹی کے ساتھ اس مدرسے کے ہیڈ ماسٹر
 صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ہم کو بہت کچھ شاباشی دی اور ہم سمجھے کہ چلو چھی ہوئی۔ اس روز جو ہم پھر
 اسی طرح فوج کا سلسلہ قائم کر کے پل پر آئے تو کسی مخالف کو وہاں کا نہ پایا۔ معلوم ہوا کہ وہاں
 والوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ جب تک ہمارا مدرسہ پل سے نہ گزر جائے اس وقت تک پل پر
 قدم نہ رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ شرافت کی کہ پولیس میں اس واقعے کی رپورٹ کر دی۔

لڑائی کے شاید چوتھے روز اُس مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہمارے مدرسے میں آئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ان کے ساتھ تھے۔ آتے ہی دونوں کے دونوں ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے نہیں گئے۔ وہاں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم سب کو اور خاص کر سٹوڈنٹ ماسٹر صاحب کو بڑی تشویش تھی کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے کوئی گھنٹے پون گھنٹے کی گفتگو کے بعد میری اور میرے دو تین ساتھیوں کی طلبی ہوئی اور جاتے ہی ڈپٹی کمشنر صاحب نے سوال کرنے شروع کر دیے۔ میں نے جو کچھ واقعہ ہوا تھا بے کم و کاست بیان کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہنستے اور مسکراتے رہے۔ آخر میں اس مدرسے کے ہیڈ ماسٹر سے کہنے لگے "مسٹر... کیا اگر یہی لڑائی ولایت کے دو مدرسوں میں ہوتی تو اس کی رپورٹ پولیس میں کی جاتی اور کیا اس طرح فوج داری مقدمہ پانے کی استدعا کی جاتی۔ اس کا آپس میں تصفیہ ہو جائے تو بہتر ہے" ہمارے ایک کپتان صاحب بولے "صاحب اس طرح تصفیہ نہیں ہوگا۔ پہلے یہ ہارمان لیں اس وقت ہم ان کو چھوڑ دیں گے۔ ہمارے کسی سے دب کر رہنے والا نہیں ہے" ان کے جوش پر سب ہنس پڑے اور ہنستے کہا گیا کہ اب تم لوگ جاؤ۔ ہم چلے آئے۔ معلوم نہیں کہ آپس میں کیا باتیں ہوئیں۔ آخر یہ قرار پایا کہ جب تک ہمارا مدعا پل پر سے نہ گزر جائے اس وقت تک دوسرے مدرسے والے پل کا دوسری طرف لین باندھنے کھڑے رہیں۔ ہم جب ان کے پاس سے گزرتے تو اس شان سے اینٹھتے ہوئے گویا ایک فوجی قوم ایک مضبوط قوم کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہوئی گزر رہی ہے۔ کچھ دنوں ہی زنگ ربا اس کے بعد ٹورنمنٹ کے زمانے میں آپس میں میل ملاپ ہو گیا۔ اب کبھی کبھی اس لڑائی کا خیال آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ اگر اس طرح کی پھر کوئی جنگ ہو جائے تو تعزیرات کی دفعہ ۷۷ ہم کا خیال آتے ہی انشاء اللہ سب سے پہلے میں وہاں سے بھاگوں۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کا زنگ تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ان کی بڑھائی کا ڈھنگ بھی ملاحظہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ وہ طالب علم ہی نہیں جس کے پاس ڈکشنری اور ایٹلس نہ ہو۔ جماعت میں گھستے ہی پہلا کام ان کا یہی ہوتا تھا کہ ہر لڑکے کے پاس یہ دونوں چیزیں دیکھ لیں میں حلف لینے کو تیار ہوں کہ میں نے ان سے دو سال تک پڑھا اور کبھی یہ چیزیں نہیں خریدیں لطف یہ ہے کہ کبھی صاحب کو پتا نہیں چلا کہ میں دوسروں سے ڈکشنری اور ایٹلس لے کر کام

چلا رہا ہوں۔ ہوتا یہ تھا کہ صاحب نے ایک سر سے سے تنقیح کرنی شروع کی۔ اور وہ کتابیں ایک سے دوسرے پر کمر کے پیچھے ہی پیچھے منتقل ہونی شروع ہوئیں شاید ہی کوئی بد قسمت لڑکا ہوتا ہوگا جس کے پاس ان کو یہ دونوں چیزیں موجود نہ ملتی ہوں۔ اور مزایہ تھا کہ پچاس ساٹھ لڑکوں کی جماعت میں صرف دس یا گیارہ کے پاس یہ کتابیں تھیں۔ بہر حال اپنا اطمینان کرنے کے بعد انہوں نے پڑھانا شروع کیا۔ جغرافیہ خوب پڑھاتے تھے اور بورڈ پر چاک سے نقشہ تو ایسا بناتے تھے کہ ہاتھ چوم لینے کو جی پاتا تھا۔ اب رہی انگریزی تو وہ ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن پڑھانے میں ولایت کا ذکر نہ سے زیادہ کرتے تھے۔ جب کوئی مثال دیتے تو انگریزوں ہی کی مثال دیتے۔ ایک دن ایک صاحب زادے صاحب ان سے سوال کر بیٹھے کہ ”صاحب آپ ولایت کا تو اتنا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی آپ ولایت گئے بھی ہیں۔ یا نہیں۔ کیا کہوں یہ سن کر ان کو کتنا غصہ آیا۔ اور غصہ آنے کی وجہ بھی تھی۔ کیوں کہ یہ ویسی صاحب تھے یعنی تھے تو ولایتی ماں باپ کے بیٹے مگر ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان ہی میں پرورش پائی تھی۔ اور آخر ہندوستان ہی میں مے۔ سوال کا جواب تو کیا دیتے۔ ہاں ہوا یہ کہ غصہ کے مرے جماعت سے باہر نکل گئے اور برابر گھنٹ بھر باہر ٹہلنے رہے۔

ان کے غصے کی کچھ نہ پوچھو۔ بہ وقت ناک پر دھرا رہتا تھا۔ مدرسے سے ملا ہوا ہی باغ تھا۔ جانور آتے درختوں پر بیٹھتے اور چھیپتے تھے۔ ان کے نازک دماغ پر جانوروں کا ہونا گراں گذرتا تھا۔ دو چہرے اسی ان جانوروں کے اڑانے پر متعین تھے۔ ایک روٹے جمع کرتا۔ دوسرا بیٹھ مارنے کو تیار بیٹھا رہتا۔ ادھ کوئی جانور درخت پر آ کے بیٹھا اور ادھر اس نے پتھر مارا۔ اگر کہیں نہ اٹھا سکا تو کسی درخت پر بول گیا تو چہرے اسیوں کی شامت آگئی۔ صاحب اس قدر غل مچاتے کہ خدا کی پناہ۔ برا بھلا کہا۔ جرمانہ کیا اور زیادہ غصہ آیا تو کسی نہ کسی چہرے کو محفل کر دیا۔ غمناک ان چہرے اسیوں کا صاحب کے ہاتھ سے ناک میں دم تھا۔

انہوں نے لڑکوں کو مارنے کا طریقہ مدرسے میں بائبل مسودہ کر دیا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی ماسٹر کسی لڑکے پر ہاتھ اٹھا سکے البتہ ڈکار لینے سے ان کو سخت نفرت تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ ماش کی دال کھائیں وہ ڈکار نہ لیں تو اور کیا کریں۔ باسی ماش کی دال کھانے والے

لڑکے جماعت میں بہت سے تھے۔ جہاں کسی نے ڈکاری اور انھوں نے آکر منہ پر کتاب ماری۔ لڑکوں میں مستعدی پیدا کرنے کے لیے ان کی جماعت میں پنج ذرا دیوار سے ہٹا کر بچھا دیے گئے تھے تاکہ کوئی لڑکا دیوار کا بہارا نہ لے سکے۔ ایک دن یہ ہوا کہ یہ جماعت میں ٹہلتے ہوئے پڑھا رہے تھے۔ ایک لڑکے کے پاس سے جو گزرنے لگے تو اس کو اسی وقت ڈکار آئی اور اس نے "ہاڈ" کر کے ایسا بڑا منہ کھولا کہ حلق کا کوا بھی دکھائی دینے لگا۔ صاحب نے اسی طرح ٹہلتے ٹہلتے اس کے منہ پر کتاب ماری۔ وہ بچارہ اپنی ڈکاری دھن میں ذرا ڈھیلہ بیٹھا تھا۔ پنج پر سے قلابازی کھا کر نیچے جا پڑا لیکن ان حسرت نے کچھ پروا نہ کی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ کہیں ٹھاہ بے ٹھاہ چوٹ تو نہیں لگ گئی۔ اس طرح پڑھانے میں مشغول رہتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

صبح کا جب مدرسہ ہوتا ہے تو اکثر لڑکے بچوں پر بیٹھے اذیتیں کرتے ہیں۔ صاحب بہادر کو ان کی یہ حرکت بہت ناپسند تھی۔ جہاں دیکھا کہ کوئی لڑکا ذرا اونگھ رہا ہے اور اٹھوں نے چپاٹی کو آواز دے کر حکم دیا کہ اس لڑکے کو لے جا کر کٹ فیٹہ کے پانچ چدر دلاؤ پانچ چدر دینے کے معنی یہ سمجھو کہ پورا سومیل ہو گیا۔ ان چدروں کے بعد جو یہ لڑکا آتا تو بالکل "تین" ہوتا۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ مارتے بالکل نہ تھے۔ مگر ایک لڑکے کو اٹھوں نے ایسا مارتا ہے کہ سوہتی بھلی۔ ہوا یہ کہ انٹرنس کلاس میں ایک لڑکا تھا اور بڑا پوشیا رہتا مگر خداجانے کیوں اس کو مدرسے سے بھاگنے کا مشورہ پڑ گیا تھا۔ گھر سے کہہ کر آتا کہ مدرسے جا رہا ہوں اور خیر نہیں سارے دن کہاں رہتا۔ آخر یہ ہوا کہ نام کٹ گیا۔ نام کٹنے کی خبر اس کے والد کو دی گئی۔ وہ ایک دن اپنے صاحب زادے کو لے کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس آئے اور کہا "سرکار یہ تو روز مدرسے آتا ہے۔ پھر اس کا نام کیوں کاٹ دیا گیا؟" صاحب نے جیٹر منگا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دو دن نہیں پوسے تین مہینے مدرسے سے غائب ہے۔ جب ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تو یہ حضرت بھی تھوڑے صاحب نے ان کے باپ سے پوچھا کہ اب آپ اس کو سزا دیتے ہیں یا میں دوں۔ اس بچارے نے کہا کہ آپ ہی دیجیے۔ کہا کہ کل صبح اس کو لے کر آؤ۔ اس کے جانے کے بعد اگلے صبح نے ایک بیت منگوائی رات بھر اس کو ناند میں ڈبو کر رکھا۔ صبح کو وہ لڑکا اور ان کے والد صاحب پھر آئے۔ تمام سکول جمع کیا گیا۔ ان صاحب زادے کو پنج پر اونڈھا لٹا کر باندھ دیا گیا۔ اور اس کے بعد جو میرے شہینے

بیت لے کر سوتا شروع کیا ہے تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو جان سے مارے بغیر نہ چھوڑے گا۔ سارے لڑکوں کا یہ حال تھا کہ کانپ رہے تھے۔ ماسٹروں کے ہوش پران تھے۔ آخر جب بے ہوش ہی ہو گیا اس وقت کہیں جا کر انہوں نے ہاتھ روکا۔ مگر صاحب اس لڑکے کا باپ بھی اس بلا کا تھا کہ کیا کہوں۔ دیکھ رہا تھا کہ بچے کا دم نکلے جاتا ہے اور کہے جاتا تھا کہ مارو اور مارو۔ ایسے بد معاش کی یہی سزا ہے۔ اس مار کے کہیں پندرہ روز کے بعد وہ بچا رہ اس قابل ہوا کہ مدرسے آئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب سے خود میرے دو مقابلے ہوئے۔ میں ایک میں جیتا اور ایک میں یہ جیتے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک سال حکم حاصل کر لیا کہ گرمیوں میں صبح کا مدرسہ نہ کیا جائے لڑکوں نے تو شام میں کیں ماسٹروں نے بہت کچھ کہا مگر ہمارے صاحب بہادر کیا ماننے والے تھے آخر جب کچھ بن نہ پڑی تو اسٹاٹک کی سوچھی یہ سننے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں اسٹراٹک کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ میں اس زمانے میں نویں جماعت (پری میٹرک) میں پڑھتا تھا۔ میں نے اپنی جماعت کے سارے لڑکوں کو جمع کر کے کہا کہ کل اگر کوئی مدرسے آیا تو میرے سے برا کوئی نہیں کل ساٹھ نو بجے سب کی عافری کپنی باغ میں لی جائے گی۔ اس تجویز کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ دوسرے دن اول وقت کے تین گھنٹے ہیڈ ماسٹر صاحب کے تھے۔ سارے مدرسے کی عافری انہی کے کمرے کے سامنے لڑکوں کو لین سے کھڑا کر کے ٹھیک دس بجے لی جاتی تھی۔

اس روز جو سب جمع ہوئے تو پوری کی پوری ایک جماعت غائب۔ تمام مدرسے میں غل مچ گیا صاحب کو خبر ہوئی وہ بھی کمرے سے نکل کر باہر آئے۔ ماسٹروں سے پوچھا کہ نویں جماعت کہاں ہے۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ ایک ماسٹر صاحب نے کہا کہ میں نے تیس چالیس لڑکوں کو کپنی باغ کے کنوئیں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ یہ سن کر صاحب کمرے میں چلے گئے۔

اب ہماری سینیے۔ ہم لوگ نو بجے سے باغ میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ ایک آیا۔ دو آئے تین آئے۔ غرض ساٹھ نو بجے تک پورے انچاس لڑکے جمع ہو گئے۔ جب یہ اطمینان ہو گیا کہ جماعت بھرا کوئی لڑکا مدرسے نہیں گیا ہے تو اس کے بعد فٹ بال شروع ہوئی۔ ساٹھ گیارہ بجے تک یہ شعل رہا۔ جب اس سے بھی فراغت پائی تو خیال آیا کہ اب کیا کریں۔ سب نے کہا کہ چلو اب مدرسے چلیں۔ غرض سب کے سب لڑکے باندھے۔ غل مچاتے مدرسے آئے۔ ابھی صاحب کا ایک گھنٹہ

باقی تھا۔ تصفیہ طلب یہ امر تھا کہ کون جماعت میں پہلے جائے۔ سب نے مجھ سے کہا کہ حضرت یہ مصیبت آپ ہی کی لائی ہوئی ہے پہلے آپ ہی جائیے خیر میں بھی جی کر پا کر کے کمرے میں گھس رہی گیا۔ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم ڈالتا اپنی سیٹ تک آیا اور بیٹھ گیا۔ دو لڑکے سامنے کی کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔ جب یہ دیکھ لیا کہ میں اپنی جگہ جا بیٹھا اور صاحب نے کچھ نہیں کہا تو دوسرے صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور میرے برابر بیٹھے۔ غرض اسی طرح کوئی سات آٹھ منٹ میں پوری جماعت اندر آگئی۔ صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور یہ سے برابر آ بیٹھے۔ غرض اسی طرح کوئی سات آٹھ منٹ میں پوری جماعت اندر آگئی۔ صاحب بھی کئی منٹوں سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب سارے پنج بھر گئے تو انہوں نے قلم ہاتھ سے رکھا۔ جماعت پر ایک نظر ڈالی۔ اور پوچھا۔ "سب آگئے؟" میں نے بوجہ "جی ہاں" پوچھا "کس مضمون کا گھنٹہ ہے؟" میں نے کہا "جغرافیہ کا" انہوں نے میز کی دراز کھول کر خرافہ نکالا۔ اپنی کرسی سے اٹھے۔ اور ٹہل ٹہل کر اس طرح بڑھانے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد جب جماعت چلنے لگی تو مجھ سے کہا "تم ٹھہر جاؤ" میں سمجھا کہ میاں فرحت آج خیر نہیں۔ وہ مار پڑے گی کہ ساری حکومت ناک کے سستے نکل جائے گی کبھی سوچتا کہ بھاگ جاؤں کہ بی خیال آتا کہ نہیں۔ اب دوسروں کو مصیبت میں ڈالا ہے تو یہ شرافت سے بعید ہے کہ وقت پر دعادی جائے۔ صاحب اگر ہاتھ اٹھائیں تو تو بھی مارنے مرنے کو تیار ہو جا۔ دو ماریں گے تو کم سے کم ایک تو کھائیں گے۔ بہر حال میں اسی اٹھ بن میں تھا کہ صاحب کرسی پر جا بیٹھے اور مجھ سے کہا "پاس آؤ، میں قریب گیا۔ لیکن اتنے قریب بھی نہیں کہ میرا ہاتھ پکڑ سکیں۔ دل کہتا تھا کہ اب جنگ ہوئی لیکن بجائے اس کے کہ وہ ہاتھ پکڑنے کا ارادہ کرتے نہایت نرم آواز میں بولے کہ "اب تک نم کہاں رہے؟" میں نے کہا "کیسی باغ میں" کہا "کیوں" میں نے کہا "دیکھیے صاحب! اگر آپ صبح کا مدرسہ نہ کریں گے تو آج ایک جماعت گئی ہے اور کل سے ساڑھے سات بجائے ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس بارے میں سارے کوسا اسکل ہمارے ساتھ ہے" کہنے لگے "میں تمہاری اسپرٹ سے بہت خوش ہوں۔ اگر تمام دنیہ میرے ساتھ ہوتی تو صبح کا مدرسہ کرتا۔ لیکن تمہاری جرأت دیکھنے کے بعد میں اپنا ارادہ بدل دیتا ہوں۔ جاؤ، سب سے کہ دو کل سے صبح کا مدرسہ ہے سہ کار سے حکم بعد میں حاصل کر لیا جائے گا" میں پچ

کہتا ہوں کہ ان کی باتوں سے میرے آنسو نکل آئے اور میں نے دل میں کہا کہ ”فرحت۔ غمہ کسی کو ہیڈ ماسٹر دے تو ایسا دے۔“ میں شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر منہ سے ایک حرف نہ نکلا۔ وہ بھی سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ ”جاؤ تمہاری حالت ایسی ہے کہ الفاظ میں کسی شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کمرے سے باہر آنے کے بعد جس جوش و محبت سے لڑکوں نے گھیر کر مجھ سے ہاتھ ملائے ہیں اس کی خوشی کو کچھ میرا دل ہی جانتا ہے اب تک دنیا میں ہزاروں خوشیاں دیکھیں مگر وہ خوشی ایسی تھی جس کا نہ جواب ہو ابے اور نہ ہوگا۔

اب دوسری لڑائی کا قصہ سنئے۔ لڑکوں میں کھیل کود کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ٹورنمنٹ مقرر کی۔ جتنے مدرسے باقی اسکول کے ماتحت تھے وہ سب جمع ہوتے۔ ہر طرح کے مقابلے ہوتے اور آخر میں جیتنے والوں کو مٹھائی بٹتی۔ میں اس زمانے میں انٹرنس میں تھا خد معلوم یہ خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ ایسے ٹورنمنٹ میں شریک ہونا اور بچوں کے ساتھ بھاگنا دوڑنا انٹرنس والوں کی توہین ہے ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ساری جماعت والے میرے ہم خیال ہو گئے۔ اور ہم سب نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اس پر صاحب نے یہ سزا مقرر کی کہ جو لوگ ٹورنمنٹ میں شریک نہ ہوں وہ سوگڑ کی دوڑ دوڑیں یہ ہم نے منظور کر لیا۔ ہر مہینہ سوگڑ بھاگتے اور چھٹی پاجائے۔ ہماری دیکھا دیکھی نویں جماعت والوں نے بھی ٹورنمنٹ کی شرکت چھوڑ دی۔ صاحب کو یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ مرض پھیل کر میری اسکیم کو بے کار نہ کر دے۔ اس لیے انھوں نے یہ کیا کہ میدان میں پنج بچھوادیے۔ اور بچوں پر پہلی دوری جماعت کے لڑکوں کو بٹھا کر ہمیں علم دیا کہ اب تم لوگ سوگڑ بھاگو اور ان بچوں کے پیچھے سے لوٹ کر نکلو۔ پہلے نویں جماعت والوں کو لیا گیا وہ بھاگے۔ مگر جب بچوں کے پیچھے سے نکلنے لگے تو جو بچے اوپر بیٹھے تھے انھوں نے خوب لاتیں چلائیں۔ چار قطاروں میں یہ پنج بچھائے گئے بچاروں کو ہر جگہ یہی مصیبت پیش آئی۔ بہر حال یہ سب اسی طرح لوٹے لٹتے لاتیں کھاتے رسی تک پہنچ ہی گئے میں نے جو یہ حالت دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”بھئی۔ تمہارا جو چاہے سوگڑو۔ میں تو مز بھی جاؤں گا تو اس طرح نہ دوڑوں گا سب نے کہا کہ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ میں نے کہا ”تو چلو۔ میرے ساتھ آؤ۔“ غرض ساری جماعت وہاں سے چل مدرسے کے دوسرے میدان میں جا بیٹھی۔ پہلے ہمارے پاس تھرڈ ماسٹر صاحب

آئے اور کہا "چلو صاحب بلا تے ہیں" ہم نے کہا "جیسے ہم نہیں آتے۔ اگر سیدھی طرح سو گئے۔ دوڑائیں تو ہم آتے ہیں۔ یہ نہیں تو ہمیں دوڑنے سے انکار ہے" انھوں نے جا کر صاحب سے کہہ دیا۔ اس کے بعد سکندڑ ماسٹر صاحب آئے ان کو یہی جواب دے دیا۔ آخر میں سائنس ماسٹر صاحب آئے ان کی ہم لوگ بڑی عزت کرتے تھے اور صاحب بھی ان کا بہت کہا مانتے تھے۔ انھوں نے آکر ہمیں سمجھایا۔ اور کہا "چلو جی۔ میں بچوں کے نیچے لوٹنا معاف کر دیتا ہوں ان کی بات پر یقین کر کے ہم سب کے سب پھر اس میدان میں آئے اور لائین باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ خدا اس سائنس ماسٹر کو سمجھے اس نے ایک حرف ہمارے لیے نہیں کہا۔ صاحب کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" ارادہ یہ تھا کہ ہم سب خاموش رہیں اور سائنس ماسٹر صاحب ہماری وکالت کریں۔ مگر بے ادھ اور جو حضرات کھڑے تھے انھوں نے اپنے شانوں سے بچھے کچھ اس طرح دھکیلا کہ میں کوئی دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اب صاحب بجائے اس کے کہ ساری جماعت سے کوئی سوال کرتے مجھ سے سوال کرنے لگے۔ میں نے بھی دیکھا کہ اب خاموش رہنا ٹھیک نہیں ہے ان سے حجت کرنی شروع کر دی جب انھیں معنوم ہوا کہ اس طرح باتوں سے کام نہیں چلے گا تو حجت قطع کرنے کے لیے یہ کہا کہ میں صرف دوست دیتا ہوں جن کو اس طرح بھاگنا ہے وہ آگے نکل آئیں اور باقی یہاں سے چلے جائیں۔ وہ گھڑی نکال کر وقت دیکھنے لگے اور سوائے دو لڑکوں کے ہم سب وہاں سے چلے گئے ان دو لڑکوں میں ایک تو تھوڑے ماسٹر کے صاحب زادے تھے۔ اور دوسرے ایک کشمیری پنڈت کے لڑکے جو حال ہی میں داخل ہوئے تھے۔ غرض یہ دونوں دوڑے اور دونوں نے خوب ہی لاتیں کھائیں۔ ٹورنمنٹ ختم ہوئی اور اب ہم کو فکر ہوا کہ دیکھیے اب صاحب کیا کرتے ہیں۔

دوسرے روز جو ہم سکندڑ ماسٹر صاحب کے کمرے میں گئے تو انھوں نے ذرا مسکرا کر کہا کہ تم لوگوں نے کل بہت زیادتی کی۔ صاحب تم سے خفا ہیں ان سے جانتے ہی معافی مانگ لو وہ ضرور معاف کر دیں گے" ہم نے کہا "بہت اچھا" دوسرے ہی گھنٹے صاحب کا تنہا۔ جماعت جا کر بیٹھی۔ وہ منتظر تھے کہ پہلے معافی مانگی جائے۔ اس کے بعد پڑھا نا شروع ہو رہی تھی اس لڑکے کو اشارہ کیا جو ٹورنمنٹ میں ہم سے الگ ہو کر دوڑا تھا۔ اور جو بچوں کی خوب لاتیں کھا چکا تھا اس نے

کھڑے ہو کر کہا "جناب والا۔ کل جو قصور ہم سے ہوا ہے وہ معاف فرمایا جائے۔ ہم اپنے لیے پر
 نادم ہیں" اب جو میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی معافی کے اس طریقے سے صاحب
 کی بڑی توہین ہوئی غضب خدا کا قصور تو کرے کوئی اور معافی وہ مانگے جس نے قصور نہیں کیا۔
 اس لڑکے کا معافی مانگنا تھا کہ صاحب بگڑ ہی تو گئے۔ کہنے لگے "تم کیوں معافی مانگتا ہے معافی
 وہ مانگے جس نے قصور کیا ہے" میں نے دل میں کہا کہ آج نہیں کل معافی مانگ لیں گے جلد ہی
 ہی کیا ہے کوئی ہم یا صاحب بھاگے تھوڑی جاتے ہیں۔ جب صاحب نے دیکھا کہ کوئی معافی
 کے لیے نہیں اٹھتا تو انہوں نے کتاب بند کر میز کے خانے میں رکھی اور کچھ بڑ بڑاتے ہوئے چلے
 گئے اور جب تک ہماری جماعت وہاں رہی کمرے کے اندر نہ آئے۔ ہمارا تیسرا گھنٹہ تھرڈ ماسٹر
 کے ہاں تھا۔ ابھی جا کر بیٹھے ہی تھے کہ مدرسے کی آڈریٹ آئی۔ لکھا تھا کہ "فرحت اللہ کو ہدایت
 کر دی جائے کہ وہ آج سے میرے کمرے میں نہ آئے۔ یہ حکم سن کر آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً جماعت
 سے اٹھا۔ ماسٹر صاحب نے کہا "میاں بیٹھو۔ صاحب کے ہاں نہ جایا کرو۔ وہاں کا سبق میں
 پڑھا دیا کروں گا۔ تھوڑے دنوں میں صاحب کا غصہ بھی دھیمّا پڑ جائے گا" میں نے کہا "حضرت
 معاف کیجیے۔ میں اس مدرسے ہی میں نہیں پڑھتا۔" وہاں سے نکل دفتری کے پاس آیا۔ درخواست
 لکھی کہ یہ انام کاٹ دیا جائے۔ اور صداقت نامہ حاضری دیا جائے۔ چہر اسی کے ہاتھ یہ درخواست
 صاحب کو پہنچی۔ اس پر حکم ہوا کہ "طالب علم کو ایسی درخواست دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کے ولی کی
 جانب سے درخواست پیش ہونی چاہیے" ہم اس وقت گھر آئے۔ واقعہ بیان کیا اور بڑی شکل سے
 والد صاحب قبلہ کے دستخط اس درخواست پر لیے۔ بھاگے بھاگے پھر مدرسے گئے۔ اور درخواست
 اندر پہنچوائی۔ حکم ہوا "نامنظور" اور ساتھ ہی دوسرا حکم جاری کیا کہ فرحت اللہ کو بلا تعین مدت
 معطل (SUSPENDED) کیا گیا۔" اب تماشا دیکھیے کہ انٹرنس کا امتحان سر پر آ گیا۔ نہ مدرسے
 میں پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے اور نہ نام کاٹا جاتا ہے اور یہ ناممکن تھا کہ بغیر سارٹیفکیٹ کے
 کوئی دوسرا مدرسہ مجھ کو لے لیتا۔ غرض کچھ عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس میرے پارنے اپنے
 حکم میں ذرا تبدیلی نہ کی۔ اُنیس روز تک یونہی ادھر میں ٹھکائے رکھا۔ گھر میں سب پریشان تھے
 کہ لڑکے کا ایک سال ضائع ہوا۔ ہوتے ہوتے سب کی نظر میرے ایک چچا پر پڑی کہ ان کو صاحب

بھیجنا پاپا ہے۔ ہمارے یہ چچا بھی کچھ عجیب رنگ کے چچا تھے۔ نہایت اچھی انگریزی جانتے تھے۔ اور شکل دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کو انگریزی کا ایک حرف بھی آتا ہے۔ بہت عالم فاضل تھے۔ لیکن صورت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بالکل گنوار کا لٹھ ہیں۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا لیکن کپڑوں کی حالت ڈارٹھی موچھوں کی کیفیت بالوں کی پریشانی اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مفلس فلاں شخص ہے۔ غرض ان کو بلا کر سارا معاملہ سمجھا گیا۔ ہم اور وہ دونوں مدرسے پہنچے۔ صاحب کو اطلاع کرائی گئی۔ انھوں نے صرف ان کو بلایا۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ صاحب اور یہ دونوں ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ پھر تو دونوں میں وہ گھٹی کہ دو گھنٹے لگے۔ گئے۔ باتیں ہو رہی ہیں اور کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتیں اور ہم ہیں کہ پریشان صورت باہر کھڑے چچا صاحب کا انتظار کر رہے ہیں خدا خدا کر کے یہ باہر آئے۔ مجھے ساتھ لے کر گھڑی کی طرف چلے۔ میں نے پوچھا کہ "بتائیے تو آخر کیا ہوا؟" انھوں نے کہا کہ گھڑی چل بناؤں گا۔ غرض گھر پر آئے۔ سب گھر والوں نے ان کو گھیر لیا۔ پہلے تو مذاق کرتے رہے کہ صاحب نہیں مانتے۔ آخر میں کہا کہ "کل جاؤ اور نہ بتاؤ معافی مانگ لو تم کو مدرسے میں شریک کر لیا جائے گا۔ صاحب تم سے بہت خوش ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ تم ان کے مدرسے سے نکلو۔ ان کو ٹھارے ڈورنٹ میں شریک ہونے سے متعلق بھی شکایت نہیں ہے ان کو شکایت ہے تو یہ ہے کہ تم نے ایسے شخص سے معافی مانگوانی جو بے قصور تھا۔ اگر تم اس وقت کھڑے ہو کر معافی مانگ لیتے تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔"

چچا صاحب دوسرے روز ہم مدرسے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سارا مدرسہ صاحب کے کمرے کے سامنے جمع ہے۔ ہمارے پہنچتے ہی سکندڑ صاحب نے ایک تحریری معافی نامہ ہم کو دیا اور کہا کہ "جب صاحب باہر نکلیں۔ تم اس کو پڑھ دو۔ میں کیا بتاؤں کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ پسینہ میں شرابور تھا۔ غصے کے مارے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ اور جی پاتا تھا کہ پڑھنے لکھنے کو لعنت بھیج اور یہاں سے چلے۔ اتنی دیر میں صاحب بھی کمرے سے باہر آئے میری حالت دیکھ کر سمجھ گئے کہ اس وقت اس سے کچھ پڑھوانا ٹھیک نہیں کہنے لگے "تم معافی مانگتا ہے" میں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا "جی ہاں" میرا یہ کہنا تھا کہ وہ آگے بڑھے اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لے اور سب سے کہا "اب جاؤ" جماعتیں رخصت ہوئیں

اور وہ مجھے بڑی دیر تک سمجھاتے اور ولاسا دیتے رہے ان کی محبت کی باتوں سے میرا دل بھرا آیا۔ اور میں نے واقعی روکر ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اور انھوں نے بھی تسلیم کیا کہ اس طرح بچوں پر چھوٹے چھوٹے بچوں کو بٹھا کر اونچی جماعت والوں کو لاتیں کھلوانا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی (ECC = RESPECT) خودداری کی وجہ سے کیا اس لئے تم بالکل بے قصور ہو۔

بہر حال اس کے بعد صاحب نے مجھ پر وہ وہ عنایتیں کی ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتیں! ان کا ذکر انشاء اللہ کبھی آئندہ کروں گا۔ فی الحال خدا حافظ۔

ہم اور ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ ذوق مرحوم فرمائے میں:

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
منس کر گزارے یا اسے رو کر گزار دے

بعض انسان دنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض روشن پہلو کو ایک ہی چیز ایک کو بری معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لیے آفت جان ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے نسیب ان ہی دو رخوں کو دو صاحبوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں دکھایا ہے۔ اس کے روشن رخ کا کچھ حصہ رسالہ افادہ میں چھپا تھا مگر وہ رسالے کے حق میں غالب کا قصیدہ ہو گیا اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادہ کا خاتمہ بالآخر ہو گیا۔

اب یہ دونوں رخ رسالہ نمائش کے لیے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھاپ دیجیے تاکہ آپ کے رسالے کا حشر بھی اس کی نحوست سے کہیں وہ نہ ہو جو رسالہ افادہ کا ہوا۔ اگر چھاپنے کی سبت نہ ہو تو مضمون واپس کر دیجیے جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالے کی بنیاد کو بہت قوی سمجھتے ہیں ان کو بھیج دوں گا۔ دیکھوں وہ بھی اس مکر کی تاب لاتے ہیں یا نہیں۔ والسلام۔

(مرزا الم نشرح)

تصویر کا ایک رخ

نہ ہونی گرمیرے پرچوں سے تسلی نہی : امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

سہ یہ دو مضامین 'تصویر کا ایک رخ' اور 'تصویر کا دوسرا رخ' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ اول الذکر (باقی اگلے صفحہ)

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے۔ آخر امتحان ایسا کیا ہوا ہے
دو ہی صورتیں ہیں "فیل یا پاس" اس سال کامیاب نہ ہوئے۔ آئندہ سال سہی میں اپنے دوستوں اور ہم
جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس تڑپاں، ان کا دماغ مختل اور
ان کی صورت اتنی سی نکلتی آتی تھی۔ بندہ درگاہ پر امتحان کا نہ رتی برابر اتر پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ گو امتحان سے
فارغ ہو چکا ہوں لیکن اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے۔ امیدواروں کا مجمع نئی نئی صورتیں عجیب عجیب
خیالات یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہو سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوئے جائے لیکن پڑھنے
اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دی جائے۔ میری سنیے کہ دو سال میں لاکلاس کا کورس پورا کیا۔ مگر کس طرح، شام کو
یاروں کے ساتھ ٹہلنے بکھٹنا، واپسی کے وقت لاکلاس میں بھی جھانک آنا۔ منشی صاحب دوست تھے اور لکچرار
صاحب پڑھانے میں مستغرق۔ حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ لاکلاس میں شریک
ہونے سے میرے کس مشغلے میں فرق آ سکتا تھا؟ والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا
ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کرتے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تک تو کوئی محنت
کے لیے کہ نہیں سکتا۔ بعد میں دیکھیے کون جیتا ہے اور کون مڑتا ہے۔ لیکن زمانہ آنکھ بند کیے گزرتا ہے۔ دو
سال ایسے گزر گئے جیسے ہوا۔ لاکلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا والدین امتحان وکالت کی تیاری
کے لیے سر جو گئے۔ بگڑ میں بھی ایک ذات شریف ہوں۔ ایک بڑھیا اور ایک بڑھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات
ہے۔ میں نے تقاضا کیا کہ علاحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑ بڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔
چند روز اسی تیلے سے ٹال دیے۔ لیکن تاکہ بڑی بی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال
چلا، دروازوں میں جو شیشے تھے ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سو جانا اور
صبح نو بجے اٹھنا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈال جاتا ہے
اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا تو کہہ دیا کہ میں پڑھنے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ
کوئی مجھے وق نہ کرے۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ لمپ بھڑک کر چینی سیاہ ہو گئی اور میری زیادہ محویت و
محنت کا نتیجہ سمجھی گئی۔ بعض وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ لیکن میں زمانے کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے)

چوں کہ زیادہ دل چسپ ہے اس لیے انتخاب میں صرف اسی کو جگہ دی گئی ہے۔ (مرتب)

ترقی کا نقشا پچ کران کا دل خوش کر دیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی اور امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لیے جیسا چاہیے ویسا تیار نہیں ہوں لیکن میری مسلسل حاضری، لاکلاس اور شبانہ روز کی محنت نے اُن کے دلوں پر سکے بٹھا رکھا تھا۔ وہ کب ماننے والے تھے۔ پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لیے ان سے کہہ دیا اگر میں فیملی ہو جاؤں تو اس کی ذمے داری مجھ پر نہ ہوگی۔ کیوں کہ میں ابھی اپنے آپ کو امتحان کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن والد صاحب مسکرا کے بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرے جاؤ جو جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہو جاؤ۔ کامیابی و ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔

مرد باید کہ ہر اسان نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لکچر دے کر ثابت کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں۔ تقدیر سے تمام دنیا کے کام چلتے ہیں۔

قصہ مختصر درخواست شرکت دی گئی اور منظور ہو گئی اور ایک دن وہ آیا کہ ہم ہال کسٹ لیے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گویا نہیں کیا تھا لیکن دو درجے سے کامیابی کی امید تھی "اول نو امداد غیبی" دوسرے پرچوں کی آٹھ پھیر، شاید وہ حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ اس مضمون کو نہ سمجھیں اس لیے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں "امداد غیبی" سے مراد امیدواران امتحان کی اعطال صحیح ہے۔ مدد ہے جو ایک کو دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کار سے یا عندالموقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے۔ یہ چوں کی آٹھ پھیر کو بتا کر مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے۔ بعض شریف کم حیثیت ملزم ایسے بھی نکل آتے ہیں جو بہ امید انعام پرچے بدل دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تدبیر و تقدیر کا مسلہ جیسا اس کارروائی میں حل ہوتا ہے دوسری کسی صورت میں حل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں۔ اس لیے ان پر بھروسہ زیادہ نادر ہے۔ خیر آدم بر سر مطلب پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ ہر گز مرہ امتحان میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک بہت خلیق اور منبس مکھ نگران کار تھے۔ مجھے جگہ نہیں ملتی تھی۔ میں نے اُن سے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہوئیے جگہ بتائی اور بڑی دیر تک منبس منبس کر باتیں کرتے رہے۔ میں سمجھا چوبہرا پار ہے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

کھٹیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا

کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے چہرے پر اطمینان تھا شاید ہی کسی کے چہرے پر ہوگا۔ خود تو اس پرچے کے متعلق اندازہ نہ کر سکا لیکن نگران کار صاحب کو یہ کہتے ضرور سنا کہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اول سے آخر تک اس کو پڑھ گیا لیکن نہ معلوم ہوا کس مضمون کا ہے۔ جوابات کی کاپی دیکھی۔ اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں۔ صفحہ اول کی خانہ پرسی کی اور کھڑا ہو گیا۔ کارڈ صاحب فوراً ہی آئے۔ میں نے ان سے کہا جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے وہ مسکرائے، زبان سے تو کچھ نہ بولے مگر پرچے کے عنوان پر انگلی رکھ دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ "اصول قانون" کا پرچہ ہے دل کھل گیا، اب کیا تھا میں نے بھی قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کیوں کہ اصول کے لیے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے ہی نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قائم کرتا ہے۔ دوسرا اس کو توڑ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا پابند کریں۔ میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی۔ کچھ ادھر ادھر لگا دہی دوڑائی مگر وہ کارڈ صاحب میری حالت کو کچھ ایسا ناڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے رہتے تھے۔ ذرا میں نے ادھر ادھر گردن پھیری اور انھوں نے آواز دی کہ "جناب اپنے پرچے پر نظر رکھیے"

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان کارڈ صاحب ہی سے پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے۔ میں نے دریافت کیا کہ جناب والا اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے؟ وہ مسکرائے اور کہا کہ "مجھے معلوم نہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں۔ ان سے پوچھ دیجیے اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لجانا آتا ہے تو ذرا ادھر ٹہلنے ہوئے تشریف لے جائیے میں خود پوچھ لوں گا۔ مگر وہ کب ہلنے والے تھے۔ قطب ہو گئے ان کا مسکرانا پہلے تو بہت اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن پھر آخر میں تو زہر ہو گیا۔ میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انہیں صاحب سے ہونی ہے ان کا وہ مسکراتے ہوئے ٹھنسا مجھے ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے اذہ کیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر یہ مسکرائے تو ضرور گلخپ ہو جاؤں لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں اینجن چھوڑ کر گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ اس لیے چیپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کے گزر گئے لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے۔ میں تو ہر روز ادھ گھنٹے کے بعد ہی مکرے سے نکل آتا۔ لیکن مصیبت یہ ان

پڑھی کہ والد صاحب روزگیا رہے سے آجائے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آجاتا تو جو رب میں نے دو سال کے عرصے میں قائم کیا تھا وہ سب ہوا ہوجاتا۔ اس لیے قہر درویش برجان درویش آخری وقت تک مکہ امتحان میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد صاحب سے پرچے کی سختی کی ضرورت شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تشفی کے لیے ممتحن کو بہت برا بھلا کہتے لیکن ان کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا۔ امتحان ختم ہوا اور امید نمبر ایک اور دو کا خون ہو گیا۔ اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوچھی۔ والد صاحب ایک زبردست چھٹی سفارش کی لے کر ایک صاحب کے ہاں پہنچے۔ وہ چھٹی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے۔ آنے کی وجہ دریافت کی۔ والد نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے۔ اگر آپ کچھ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ ممنون احسان رہے گا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے۔ یہ عجیب درخواست ہے۔ ان کا بیٹا امتحان دے اور کوشش میں کروں۔ بندہ خدا اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بے چارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد نتیجہ بھی شائع ہو گیا اور کم ترین جملہ مضامین میں بدرجہ اعلیٰ فیصل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کون سے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انھوں نے دو نمبر بھی دیے۔ باقی نے تو صرف پڑنا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ نمبروں کو نقل حاصل کی اور باآخری رائے قرار پائی کہ کسی بد معاش تپڑی نے پرچے بدل دیے۔ ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین گھنٹے لکھا جاتا اور صرف دو۔ مجھے بھی تعجب تھا۔ کیوں کہ میں نے پرچے کچھ ایسے بڑے نہیں کیے تھے۔ فیصلے کے دو پرچوں کے جوابات تو مجھے کچھ یاد ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے پیش کر کے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق مجھے خود یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلے سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائے گا۔ فیصلہ دیرانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا کہ ایک مکان گروہی ہے۔ مرثیہ کتنا ہے کہ مکان رہن باوفا تھا، مدت ختم ہو گئی اس لیے مکان اب میرا ہو گیا۔ راہن کتنا ہے کہ مرثیہ کا قبضہ غاصبانہ ہے۔ دونوں طرف سے شہادت پیش ہوئی ہے۔ مرثیہ کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن باوفا ثابت تھا اور راہن کی شہادت سے قبضہ غاصبانہ میں نے اس کا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کر کے زمین اور محلہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے لیے چیدہ بیانات سے پڑی ہے اس لیے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمے کا خیر چاہنے سے دلایا جائے۔ میں اب بھی نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ مرثیہ کو شکایت کہ میرا مقدمہ خارج ہوا۔ اور نہ راہن کو شکایت کہ اس کا مکان مفت میں دوسروں کو دے دیا گیا۔

اب اس فیصلے پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر زدیں تو وہ جانیں اور ان کا دین ایمان جانے۔

فوج داری کے مقدمے کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملزم نے مار ڈالا تھا۔ بے چاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرنے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ایک بیان کرتا ہے کہ اس کا منہ شمال کی طرف تھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا منہ جنوب کی طرف تھا۔ ذرا انصاف کیجیے کہ جب یہ صورت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی۔ اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ پورا ہوا اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں۔ دوسرے جب یہ پیٹھ پھیرے کھڑے تھے تو کیا ان کی آنکھیں میٹھی پر تھیں۔ جو انہوں نے اس واقعے کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں چھوٹے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو دو سال سزائے قید با مشقت اور سو سو روپیہ جرمانہ کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا جائے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بے چاری مستغینہ بیوہ ہو گئی۔ اس لیے اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغینہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو وہ اس نکاح میں صرف کی جائے۔ اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے رکھنے اور پرورش کرنے میں تامل ہوگا۔ اس لیے دونوں یتیم خانے میں بھیج دیے جائیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہو سکتا ہے۔ اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیصلہ کر دیں تو اس کو نظام نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے۔ انصاف آپ نامرین کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سناے۔ انہوں نے بہت تعریف کی۔ مجھوں کو بہت برا جھلا کہا۔ میری بہت اشک شروی کی اور فرمایا بیٹا گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سال نہیں آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ خیر ح

سیدہ بورد بلائے وئے سخی گزشت

جو کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی

میری داستان

یعنی

چونتیس برس کی قیدِ بامشقت کے کچھ حالات و واقعات

ہر قدم پر ہوتی ہے سبیلِ حادثہ پائے بوس
یہ ہماری زندہ گی ہے جس پر یہ کچھ ناز ہے

تنبیہ | جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے سب ہی کہتے آئے ہیں کہ یہ ایک تہی نمانہ ہے۔ اور کہتے بھی سچ ہیں۔ پہلے ہر آنے والے ماں کے پیٹ میں قید رہتا ہے۔ پھر بڑے بوڑھوں کی قید میں رہتا ہے۔ اس کے بعد مدرسے کی قید میں رہتا ہے۔ بعد ازاں نوکری کی قید میں رہتا ہے اور آخر چل چلا کر ہمیشہ کے لیے قید میں قید ہو جاتا ہے۔ میں بھی سوائے اس آخری قید کے بقیہ ساری قیدیں نجات چڑکا ہوں اور باندھ کے فضل سے اس آخری قید کا زمانہ بھی قریب آ گیا ہے۔ اس سے پہلے اس آخری قید کی معینہ شروع ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ اپنی "جنم ٹائم" کے کچھ حالات لکھ دوں تاکہ "داستانِ قید" ہو سکیں۔

سبھوں کی طرح میرا پہلا جیل خانہ ماں کا پیٹ تھا۔ جہاں تک میرا علم ہے اس جیل خانے کی قید کا حال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ڈاکٹروں، حلیموں اور ویدوں نے اس کے متعلق کچھ کچھ

غیر مقلد باتیں ضرور کی ہیں۔ لیکن اس "کال کوٹھری" میں قید تنہائی کے کس طرح نو مہینے گزرتے ہیں اس کا حال کچھ اللہ ہی بہتہ جانتا ہے۔ ایسی صورت میں تھوٹی سچی باتیں بنانے کی بجائے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ممکن ہے آئندہ زمانے میں انسانی ترقی اس جیل خانہ کے حالات کو بھی منظر عام پر لائے۔ اور وہاں کے قیدیوں کے افعال کو بجلی کی روشنی میں دکھایا جاسکے۔

پیدا ہونے کے بعد بڑے بوڑھوں کی قید میں بچوں کی جس طرح گزرتی ہے وہ ناقابلِ اظہار ہے۔ یہ بزرگ سمجھتے ہیں کہ بچے ہمارے دست نگر اور بجز ہماری مدد کے جی نہیں سکتے۔ اس لیے ہم کو حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں ان کو چلائیں اور جس طرح چاہیں ان کو ستائیں۔ جس کام سے چاہیں ان کو روکیں۔ اور جس کام کو چاہیں انہیں کرنے دیں۔ یہ اختیارات استعمال ہو رہے ہیں یا نہیں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

فرض کیجیے کہ ایک بچہ ہے وہ ماں کے گھر کئے پر خفا ہو کر بھاگتا ہے۔ اور کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس کو اس کے بزرگ پسند نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنی طاقت کے زور پر اس کو یہ کام کرنے سے روک دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی ارشاد فرمائیے کہ کیا اس بچے کی آزادی پر جبر نہیں ہے۔ اور کیا یہ اس کی آزادی خیال اور آزادی افعال کے گرد ایک گھیرا نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ایک طرح اپنے آپ کو خالق اور بچے کو مخلوق سمجھتے ہیں۔ مگر سچی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ کیا کریں۔ تم کو بچوں سے محبت ہے۔ ممکن ہے کہ ہو۔ مگر بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت نہیں۔ ضرورت ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جہاں محبت کے ساتھ غرض کا دم چیلہ لگ جاتا ہے۔ تو وہ محبت نہیں۔ سچی ضرورت ہو جاتی ہے۔ آپ اس مسئلے کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی شخص بطور نقتنِ طبع چوری کرتا ہے، ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس اصول کو نظرِ اکبر آبادی نے یوں بیان کیا ہے کہ :

نٹ لکھٹ، اچکے، چور، دغا باز، راہ مار

عیار، جیب کترے، نظر باز، ہوشیار

سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار
کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں مشکا۔

بلی بھی مارتی ہے چو ہا پیٹ کے لیے

جس طرح بلی اپنے پیٹ کے لیے چو ہا مارتی ہے اسی طرح ہمارے بزرگ اپنا دل خوش کرنے کے لیے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ "اور کوئی خدا کے واسطے نہیں کرتا پیارا" خیر یہ تو فلسفہ کا ایک بڑا گہرا مسئلہ ہے۔ اس کو چھوڑیے اور اصل مطلب پر آئیے۔ یعنی یہ کہ پیدا ہونے کے بعد ہر بچہ کسی نہ کسی طرح بزرگ کی قید میں رہتا ہے۔ لیکن مزا تو یہ ہے کہ بعد میں کوئی بھی ان بزرگوں کے خلاف کچھ نہیں سکتتا اور شاید اس لیے نہیں سکتتا کہ ایک دن اس کو خود بڑا بننا اور اس خطرناک مقولہ کی تائید کرنا ہے کہ: ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست!

میں نے اپنے اس بچپن کی قید اور مدرسے کی قید کے بہت سے واقعات اپنے ایک مضمون "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" میں لکھے ہیں۔ اب ان کا یہاں دہرانا بے فائدہ ورت اور بے موقع ہے۔ چونکہ قید یعنی ملازمت کے حالات کھنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیں۔ و قید با مشقت ہے جو سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور جس میں "دم نہ مارو، شکر گزارو" کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے عمر کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا حصہ بیت جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ سنتی اور رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اول تو میری باتوں پر شاید سو میں سے دو چار صاحب ہیں اعتبار کریں گے۔ دوسرے یہ کہ سچی بات سننا اور سہنا بقول شخصے کہ "کارے داد" آخر خدا خدا کر کے اس قید کا زمانہ ختم ہوا۔ کچھ کچھ آزادی کی ہوائ لگی۔ اور اس وقت خیال آیا کہ میاں جو کچھ سکھنا ہے وہ جلدی لکھ لکھا کر ختم کر دو سب سے بھی قید کا زمانہ سامنے آگیا ہے۔ بہت ہے کہ اس قید کی معیاد شروع ہونے سے پہلے کچھ لکھ کر چھوڑ جاؤ۔ تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر قوم اور ہر ملت کو اپنی "روایات و حکایات" جمع کرنے کا شوق ہے۔ اور رہا ہے کیونکہ یہی چیزیں ان کی تاریخ ہیں لیکن افسوس تو اس کا ہے کوئی اللہ کا بندہ اپنے

افسردہ اور بالادستوں کے کارنامے اور ان کے پتے حالات اور واقعات خوش مذاقی کی چاشنی دے کر نہیں بکھتا۔ کیوں کہ بے چارہ ڈرتا ہے کہ اگر لکھ بیٹھا تو نوکری جائے گی اور نوکری لگتی تو پھر "اناللہ" ہونا ہے میں کیا کوئی کسر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ہمارے کسی مضمون نگار صاحب نے اس "قید سخت و بامشقت" کے متعلق کچھ لکھنے پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ اور یہ "روایات و حکایات" سینہ بہ سینہ اور "زبان در زبان" باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے پر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ شخص ڈرتا اور دغا کرتا ہے کہ: "یا اللہ بچا مجھ کو اس معیبت سے جو فوج داری عدالتوں میں تھ لیفوں پر نازل ہوتی ہیں" میں ہمت کر کے یہ مضمون لکھ تو رہا ہوں مگر تعزیرات کی دفعہ ۴۲۵ ہر وقت پیش نظر ہے۔ پھر بھی مجھے یقین کامل ہے کہ ایک سے تک فوج داری میں کام کرنے کی وجہ سے میری تحریر کا یہ لفظ "دفعہ محولا بالائے مستثنیٰ اول میں داخل ہو سکے گا۔ یا داخل کیا جاسکے گا۔ اب رہا یہ امر کہ میری اس تحریر پر اعتبار کیا جائے گا، یا نہیں تو اس کے متعلق میں نہ ہرگز یہ عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ میرے تمام دوست و راجب اس وقت تک مجھے ایک بڑا سچا آدمی سمجھتے چلے آئے ہیں۔ اب آپ ان تھ لیفوں کی بات کا یقین نہ فرمائیں تو اس کا یہ سہ پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں۔ یہ نہ ورکے دیتا ہوں کہ جو حالات اور واقعات میں نے دوسروں کی زبانی کہے ہیں۔ ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کا میں کسی طرح ذمے دار نہیں ہوں۔ براہ کرم دروغ برگردن زوی کی مثل نبوت متعلق نہ کی جائے۔ البتہ جو کچھ اپنی آنکھوں دیکھا میں نے لکھا ہے۔ اس کے متعلق یقین مانتے کہ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور التذریاں کے ساتھ بھی ان واقعات کی نہ تک اس مضمون کو سننے کے لیے میں بائبل تیار ہوں۔ اور "میں باور کرنے کی وجہ رکھتا ہوں کہ اگر میرے کرامن کو تمہیں کی تحریر بھی میرے جیسی ہے تو یقیناً ان حالات سے متعلق میری اس تحریر اور میرے نامہ اعمال کی تحریر میں رتی برابر فرق نہ ہوگا تو پھر "چل رہے خام بسم اللہ"

تلاش روزگار | تعلیم کے جرم کی تکمیل کرنے کے بعد فکر ہوتی ہے کسی بڑے جیل خانہ کی تلاش کی جائے تاکہ وہاں نہ اکی معیاد پوری کی جاسکے اس کے لیے سب سے پہلے تحریر اقبال جرم کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ہم نے تعلیم پانے کا جرم کتنا، کہاں

کس طرح اور کس خوبی سے کیا ہے۔ اس تحریر کو عرف عام میں "درخواست ملازمت" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ محکمہ تعلیمات کے مجسٹریٹوں کے فیصلے بذمہ تصدیق شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اکثر و بیشتر یہ ساری کارروائی اکارت جاتی ہے اور ہر جگہ سے یہی جواب ملتا ہے کہ اس جیل خانے میں گنجائش اتنی نہیں ہے کہ آپ کے لیے کوئی کونہ نکل سکے۔ کسی دوسرے جیل خانے کی تلاش کی جائے۔ آخر سہ

سک خدا تنگ نیست پائے گدائنگ نیست

کانیال کر کے دوسری جگہ اپنی قسمت کا رونا رو یا جاتا تا تب اور وہاں سے بھی دھکتے کھا کر وہاں ہونا پڑتا ہے وہ جو مثل ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے آخر کسی نہ کسی جگہ نقد پر لڑائی جاتی ہے اور حکم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو کم سے کم چھپس برس کے لیے اس جیل خانے میں پاب نہ خیر قید پامشقت میں رکھا جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ چلو شکل آسان ہوئی۔ اب سوائے اپنے عہدے دار کے دین اور دنیا میں کہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارے رزق کا تعلق اللہ میاں سے منقطع ہو کر "جیل کے داروغہ صاحب" بالقاہم سے ہو گیا ہے۔

تہ یہ کہ ملازمت کی یہ قید بھی ایک عجیب قید ہے۔ نہ یہاں اقبال جرم

رامپور کا سفر | کام دیتا ہے اور نہ مجسٹریٹ تعلیم کا کوئی فیصلہ اور اکثر و بیشتر اس وقت تک کوئی جیل خانے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مالکان اور قابضان جیل خانہ کے پاس کسی زبردست شخص کی سفارش نہ پہنچے۔ ہم کو بھی یہی مصیبت پیش آئی اور سفارش کے لیے کسی بڑے آدمی کی تلاش کرنی پڑتی۔ پھرتے پھرتے چاروی نظر ہنہ ہائینس رائیہ الدین خاں نواب لوہارو پر پڑی۔ خدا مغفرت کرے۔ یہ نواب صاحب درجے میں تو بڑے تھے مگر "دماغ داری" میں بڑے نہیں تھے۔ ہمارے رشتے دار تھے۔ اور گورنمنٹ میں بااثر بھی اس لیے

۱۳۱۴ھ و ۱۳۱۵ھ میں بی۔ اے اور شروع ۱۹۰۶ء میں ایم۔ اے میں پڑھنے کے بعد ہم لفٹنٹ گورنر الہ آباد کے نام سفارشی خط لینے کے لیے ان کے پاس گئے۔ انھوں نے دو خط دیتے۔ ایک لفٹنٹ گورنر کے نام اور دوسرا ہنہ ہائینس نواب صاحب رامپور کے نام۔ لفٹنٹ گورنر اس

زمنے میں مینی تال میں تھے اور نواب صاحب اپنے دارالحکومت رامپور میں۔ خیال آیا کہ چلو پہلے نواب صاحب ہی سے مل لیں۔ ان کا مالک متحدہ کی گورنمنٹ میں بہت اثر ہے۔ ضرور کام نکل جائے گا۔ اسباب و سباب باندھ، رامپور پہنچے، پہلے سیدھے نواب عبدالصمد خاں صاحب کے پاس گئے، جو نواب صاحب لوہارو کے عزیز اور نواب صاحب رامپور کے وزیر تھے۔ یہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ نواب صاحب اس زمانے میں رام گنگا کے اس پار مقیم تھے۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ اس لیے کشتی میں پار ہونے کا موقع نہ تھا کئی روز تک رامپور میں ٹھہرے مگر دریا کو ہم سے کچھ ایسی مخالفت ہو گئی تھی نہ اس کو اترنا تھا اور نہ اُترا۔ انتظار کرتے کرتے تھک گئے چوں کہ کالج سے نئے نئے نکلے تھے اور دنیا کے اس رنگ سے ملو اقف تھے اس لیے سب سے بگڑ بیٹھے۔ نواب عبدالصمد خاں صاحب نے کہا بھی کہ خط مجھ کو دے دو۔ میں سفارشی چٹھی منگوادیتا ہوں، لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا۔ اور اس لیے انکار کر دیا کہ وہاں کے بعض لوگوں نے کہا کہ دریا کے چڑھاؤ کا بہانہ ہے۔ دراصل تم کو پیشی میں بھیجنے سے پہلو تہی کی جا رہی ہے۔ بھلا کوئی تعلیم یافتہ آدمی ایسی بات سُنے اور اس کو تاؤ نہ آجائے۔ ہم کو بھی تاؤ آ گیا۔ اور ہم ایک دن بغیر کچھ کہے سُنے ”مہمان خانے“ سے بھاگ کر سیدھے اسٹیشن پہنچے اور دہلی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب لوہارو سے ملے۔ انھوں نے واقعات دریافت کیے۔ ان کے پاس نواب عبدالصمد خاں صاحب کا خط آ گیا تھا۔ اور اس میں ہماری فراری کے واقعات سے اطلاع دی گئی تھی۔ نواب صاحب لوہارو نے ہمارا بڑا مذاق اڑایا اور کہا کہ ”تم دو چار روز اور ٹھہر جاتے یا نواب صاحب رامپور کو میرا خط بھجوادیتے تو سفارشی چٹھی مل جاتی۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ اطلاع ہونے کے بعد بغیر ملے چلے آئے۔ اب پھر جاؤ اور جب تک ملنا نہ ہو رامپور ہی میں ٹھہرے رہو۔ تم نے کیا نواب صاحب رامپور کو بھی نواب صاحب لوہارو سمجھ لیا۔ میں نے کہا: ”معاف فرمائیے! میں مر بھی جاؤں گا تو رامپور نہ جاؤں گا۔ خدا کی قسم وہاں بعض وقت تو خود کشتی کرنے کو بھی چاہتا تھا۔“ کہنے لگے: ”یہ کیوں؟“ میں نے کہا: یہ اس لیے کہ کئی کمرے ٹھہرنے کو مجھے ملے تھے۔ لیکن نوکروں کی یہ حالت تھی کہ ہم نے گھنٹی بجائی کوئی نوکر آیا۔ اس سے کام کو کہا۔ اس نے وہ کام پورا کیا اور چلا گیا۔ جانتا تھا کہ نواب صاحب

لوہارو کے عزیز نہیں۔ ان سے بات کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بیچھے پھر ہم ہیں اور وہی خالی کرے۔ اتنے دنوں تک کوئی ایک آدمی بھی تو بات کرنے کو نہیں ملا۔ نواب عبدالصمد خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ ان کو کام سے فرصت ہی نہیں تھی۔ ان کی سٹی کوٹھی بن رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کو دن میں ایک دفعہ آتے تھے۔ اس وقت کچھ بات ہو جاتی تھی۔ ورنہ ہم تھے اور قید تنہائی۔ بعض وقت تو یہ جی چاہتا تھا کہ دو ایک آدمیوں کا گلا گھونٹ کر خود چھت پر سے کود پڑوں ماب آپ فرمائیں یا اور کوئی کہے۔ میں تو راہپور جانے کا نہیں۔ آپ کا خط لے کر لاٹ صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ نوکری ملی تو ملی نہیں تو جائے جہنم میں؟ نواب صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے: میاں فرحت! ابھی تم نے دنیا کی ٹھوکریں نہیں کھائی ہیں۔ دماغ میں نوابی کے خیالات بھرے ہیں۔ میاں یہ دنیا ہے۔ یہاں وہی ابھرتا ہے جو پس کر خاک ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا: ”آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا ابھی تو میں اپنی خودداری کھونے کو آمادہ نہیں ہوں“ غرض اس گفتگو کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ سر جیمس لارنسن لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ سے مل لیا جائے، آگے یا قیمت یا نصیب۔

اس تصفیے کے بعد پھر اسباب باندھا۔ اور سفر وسیلہ

لفٹنٹ گورنر سے ملاقات

ظفر پر عمل ہونے لگا۔ ہماری اس بھاگ دوڑ میں لفٹنٹ

گورنر بہادر کے دورے کا زمانہ شروع ہو گیا۔ اب آگے آگے وہ ہیں اور پیچھے پیچھے ہم۔ جہاں جاتے ہیں وہاں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کیمپ اٹھ گیا۔ کھنڈ میں تو ان سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے الہ آباد میں ہماری اور ان کی سواری ایک ساتھ اُتری۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں گئے اور ہم اپنے بھائی میاں رحمت اللہ بیگ کے ساتھ۔ ان کے خالو عبد المجید خاں کے ہاں گئے جو فوج میں ہیڈ کلرک تھے۔ ان کا مکان کنٹونمنٹ میں گنگا کے کنارے پر قلعہ الہ آباد کے قریب تھا۔ جاتے ہی لفٹنٹ گورنر صاحب کے سکرٹری کو اپنی تشہیف آوری کی اطلاع دی اور یہ بھی سکھا کہ ہم نواب صاحب لوہارو کا خط لائے ہیں۔ ملاقات کا وقت مقرر کر دیا جائے تو ہم خود آکر یہ خط پیش کریں گے۔ جواب آنے میں کئی دن نکلے۔ لیکن الہ آباد میں دل نہیں گھبرا یا۔ اور کیوں گھبراتا۔ میاں رحمت موجود تھے۔ ان کے خالو کے بچے موجود تھے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ گنگا مانی موجود تھیں۔ صبح اٹھے، ناشتہ کیا۔ گنگا کے کنارے گئے۔ کشتی میں بیٹھے۔ اُس پار پہنچے۔

وہاں مٹنگ کی گیارہ بارہ بجے واپس آئے۔ کھانا کھایا۔ کچھ دیر سو رہے۔ تیسرے پہر کو اٹھے شہر چلے گئے۔ رات کو آئے کھانا کھایا سو رہے۔ شہر میں میرے ایک بڑے پکے دوست اعجاز حسین بھی رہتے تھے۔ ان کی صحبت میں وقت معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب گزر گیا اور کیسے گزرا۔ غرض اس طرح وہاں رہتے رہتے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا۔ ایک روز جو شہر کے چکر سے واپس آئے تو یہ بڑی لال مہر کا ایک خرط ملا۔ سمجھا تھا کہ آپ کل صبح آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر آسکتے ہیں۔ یہ کارڈ ساتھ لے جایا جائے۔ چلو یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

دوسرے دن صبح ہی اٹھو، ہاتھ منہ دھو، کپڑے، بدل، سبز پھول دار اطلس کی ٹیڑوانی اور سرخ رنگ کی ترک ٹوپنی پہن ہم گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ میاں رحمت ساتھ تھے۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ برآمدے میں س سے س سے آس سے تک آدمی ہی آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب نے ہمارا کارڈ دیکھا۔ ایک اور کرسی پر ہم کو متماں کر آیا۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی نئی جگہ جا کر بیٹھا ہے تو ادھر ادھر نظر میں ضرور دوڑاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی کیا جو صاحب ہاؤس برابر بیٹھے تھے وہ گھڑی گھڑی اپنا کارڈ نکالتے تھے۔ پڑھتے تھے، کچھ مسکراتے تھے اور پھر جیب میں رکھ دیتے تھے۔ مجھے بڑی فکر ہوئی کہ یا اللہ! کارڈ تو ان کا بھی ایسا ہی ہے جیسا میرا ہے۔ پھر آخر یہ پڑھتے کیا ہیں اور مسکراتے کیوں ہیں۔ آخر نہ رہا گیا، اور جب انہوں نے کوئی بیسویں دفعہ اپنا کارڈ نکال تو میں نے ان سے کہا کہ: کیا میں آپ کا کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟ انہوں نے کھنکھوڑا انداز سے کہا: ”جی ہاں! شوق سے“ میں نے کارڈ لے کر دیکھا۔ اس کی عبارت وہی تھی جو میرے کارڈ کی تھی۔ ہاں وقت ملاقات بجائے ۵۔۴۰ کے ۸۔۵۰ لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری ملاقات کا وقت صرف پانچ منٹ ہے۔ بھلا اس پانچ منٹ میں کیا بات ہو سکے گی۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ: ”ذرا اپنے برابر والے صاحب کے کارڈ کو تو دیکھیے۔ ان کے ہاں وقت ملاقات کیا لکھا ہے“ کارڈ دیکھا گیا تو وقت ملاقات ۵۵۔۸ نکلا۔ اب کیا تناسب بیٹھنے والوں نے اپنے اپنے کارڈ نکال کر وقت ملاقات شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی کو بھی پانچ منٹ سے زیادہ ملنے کا وقت نہیں دیا گیا ہے۔ میرے برابر جو صاحب بیٹھے تھے، کہنے لگے: ”اے غضب! غضب خدا کا، ملنے کا وقت اور

منٹ، آپ کی جان کی قسم، پانچ منٹ میں تو مزاج پُرسی ہی نہ ہو سکے گی، میں نے کہا: ”آپ مزاج پُرسی کیوں کرتے ہیں، جانتے ہی مطلب کی باتیں شروع کر دیجیے کہنے لگے: ”اے جناب! آپ کیسا فرماتے ہیں۔ لٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملنے جاؤں اور ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت بھی نہ پوچھوں۔ ہم پر انے زمانے کے لوگ ہیں۔ اپنے پرانے ادب آدا کے طریقے کو کہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ کام ہونہ ہو۔ صاحب کی خیریت تو معلوم ہو جائے گی۔“ ابھی تو دونوں میں یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ ایک چوہدار نے آکر آواز لگائی: ”مرزا فرحت اللہ بیگ“ ہم اٹھے ذرا بیروانی درست کی اور نہایت ٹھاٹھ سے کم سے میں داخل ہوئے۔ ہمارا کمرے میں داخل ہونا تھا کہ سامنے سے ایک بڑے لمبے ترانگے صاحب بہادر فسٹ کلاس سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بہت مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا: ”آپ ہی مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں“ میں سمجھا لاٹ صاحب یہی ہیں۔ نہایت فیشن سے انگریزی طریقے پر گردن کو جھکا کر کہا: ”یور آنا میں ہی فرحت اللہ بیگ ہوں ڈائریٹ اس کہنے پر ان صاحب نے کہا: ”مذمت فرمائیے گا، آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں لٹنٹ گورنر نہیں ہوں۔ ان کا سکریٹری ہوں“ اس کے بعد آپ سمجھ دیجیے کہ مجھے کتنا پسینہ آیا ہوگا۔ وقت کم تھا اس لیے سکریٹری صاحب نے بھی اس غلط فہمی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ مٹے آگے بڑھے، سر منٹے والے دروازہ کھولا اور کہا: ”مرزا فرحت اللہ بیگ، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی سی میز کے سامنے ایک نوپ فیشن کی داڑھی والے ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں پہلو میں ایک چھوٹی سی میز ہے۔ اس پر ایک چوکھٹا کھلا ہے۔ اور چوکھٹے کے اندر جو کاغذ ہے اس پر نہایت خوبصورت حروف میں لکھا ہے ڈی لائٹس لٹنٹ گورنر لکھا ہوا ہے۔ یہ معامہ ٹھیک تھا اور یہاں کسی غلط فہمی کا اثر لیشہ نہیں تھا۔ اس لیے بے لگان ہم آگے بڑھے لاٹ صاحب بھی کرسی سے اٹھے، میز کے پہلو میں جو آق بیٹھی ہوئی تھی اس پر بیٹھنے کا انھوں نے اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ انھوں نے نواب صاحب کی خیریت پوچھی اور کہا: ”کیا آپ ان کا کوئی خط لائے ہیں؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں!“ کہنے لگے: ”بہتہ متواکہ آپ یہ خط پہلے سے میرے سکریٹری کے پاس بھیج دیتے۔ کیونکہ سرکاری طریقے ہی ہے“ میں نے بہت متانت سے جواب دیا اور جو یہ خط آپ کے سکریٹری صاحب کہیں کھودیتے تو یہ سن کر

وہ مسکرائے اور خط لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے خط دیا۔ انھوں نے خط لیا اور پڑھنا شروع کیا معلوم نہیں تو اب صاحب لوہارو نے اس خط میں کون سی امیر حمزہ کی داستان کھی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی نو صفحے ہو گئے تھے۔ لاٹ صاحب خط پڑھتے رہے۔ اور ہم سٹنٹ والی گھڑی کی طرف دیکھتے رہے ۵ (پانچ) منٹ ہوتے ہی کیا ہیں؟ انھوں نے خط ابھی ختم ہی نہیں کیا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ "اب میں اجازت چاہتا ہوں" کہنے لگے "کیوں؟" میں نے کہا: "اس لیے کہ ۵۰۔۸ سے ایک دوسرے صاحب کو ملاقات کا وقت دیا گیا ہے۔ یہ سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑنے اور کہنے لگے: "وہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا: میں ان کا نام تو نہیں جانتا۔ لیکن وہ فرما رہے تھے کہ مجھے کہنا تو بہت کچھ ہے مگر ملاقات کے پانچ منٹ شاید لاٹ صاحب کے خاندان کی خیریت معلوم کرنے میں گزر جائیں۔ اور پھر کسی اور دن ملاقات کے لیے آنا پڑے" کہنے لگے: "تمہاری طبیعت میں مذاق بہت ہے؟" اس میں مذاق کی کون سی بات ہے۔ آپ ۵۔۸ والے صاحب کو بلو کر پوچھ لیجیے کہ وہ آپ کے سائے خاندان کی خیریت دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں یا مطلب کی بات کرنا؟ کہنے لگے تم بیٹھے رہو۔ یہ جتنے لوگ آتے ہیں، سب اسی قسم کے ہیں۔ ہر سفتے ملنے چلے آتے ہیں۔ اور میرا اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؛ غرض ہم اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اب ہر پانچ منٹ کے بعد سکرٹری صاحب گھنٹی بجاتے یہاں سے جواب نہیں ملتا۔ اور ہر پانچ منٹ پر ایک صاحب بلا ملے رخصت کر دیے جلتے۔ لاٹ صاحب سے ہماری جو باتیں ہوئیں وہ بس سننے کے قابل تھیں انگریز پروفیسروں اور خالص کرپورنٹسی۔ ایف۔ اینڈ۔ وز کی صحبت میں رہتے رہتے دل کھل گیا تھا اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں طبیعت میں مذاق تھا۔ اس لیے اگر کوئی دلچسپ بات دل میں آتی تھی تو اس کے صاف صاف کہنے میں باک نہیں تھا اور یہ خیال تک نہیں رہتا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے تھے اور کہاں کہہ رہے ہیں۔ ادھر یہ حال تھا اور ادھر ایک جہاں دیدہ، خوش خلق، ہنس مکھ، بڑے میاں تھے۔ سمجھتے ہوں گے کہ اس بے وقوف کی باتیں ہی سن لو اب میری اور ان کی جو گفتگو ہوئی وہ ذرا غور سے سنیے۔

لاٹ صاحب: تو آپ اس علاقے میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر منتخب ہونا چاہتے ہیں۔

میں : جی ہاں! اگر یہ نہ ہوتا تو میں اتنی دور آتا ہی کیوں۔

لاٹ صاحب: مرزا صاحب آپ کو یہاں کا قانون معلوم ہے؟

میں : جی نہیں۔

لاٹ صاحب: قانون یہ ہے کہ جب تک اس علاقے میں کوئی چھ سال تک نہ رہا ہو اس وقت

تک اس کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ یہاں چھ سال تک رہے ہیں؟

میں : جی نہیں۔

لاٹ صاحب: تو پھر میں مجبور ہوں۔ قانون تو قانون ہی ہے

میں : کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟

لاٹ صاحب: ضرور۔

میں : جناب والا! آپ کے علاقے میں میرے خاندانی حقوق بھی ہیں۔ جائیداد بھی

مگر میں خود یہاں چھ سال نہیں رہا ہوں۔ اس لیے مجھے آپ کے علاقے میں نوکری

نہیں مل سکتی۔ علاقہ پنجاب میں میری سکونت رہی ہے۔ مگر وہاں نہ میرے خاندانی

حقوق ہیں اور نہ جائیداد اس لیے وہاں میرا انتخاب کسی خدمت پر نہیں ہو سکتا۔

اب رہے ہندوستان کے دوسرے احاطے اور علاقے تو نہ وہاں میں کبھی رہا

ہوں، نہ وہاں میری کوئی جائیداد ہے، اور نہ وہاں میرے خاندانی حقوق۔

اس لیے وہاں بھی مجھے کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ تو گویا میں سمجھ لوں کہ مجھ پر سارے

ہندوستان میں ملازمت کا دروازہ بند ہے۔

(یہ سن کر لاٹ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ مارا۔ اور کہا:)

لاٹ صاحب: ویل مائی بوائے! یو آراے پرفکٹ

Well my boy you are a perfect.

دو میاں صاحبزادے، تم تو بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ دیکھو میں تم سے ایک بات

پوچھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ اس علاقے میں تمہاری جائیداد بھی ہے اور تمہارے کچھ

عزیز بھی دوسرے صفت ہیں۔ تم کبھی کبھی اپنی جائیداد دیکھنے یا عزیزوں سے ملنے تو

ضروریہاں آتے ہو گے۔ کیا یہ سب مدت مل ملا کر چھ سال نہیں ہو گئی ہوگی۔
میں: میں نے اس کا کوئی حساب تو رکھا نہیں۔ ممکن ہے کہ ہو گئی ہو۔ ممکن ہے کہ نہ
ہوئی ہو۔

لاٹ صاحب: نہیں بھی ہوئی ہو تو تکمیل منابطل کے لیے تم کہہ دو کہ ہو گئی ہے۔ یہ میری زندگی میں
پہلا موقع ہے کہ ایک اتنا بڑا آدمی مجھے جھوٹ بولنے کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ آپ کی
خاطر کہے دیتا ہوں کہ چھ برس ہو چکے ہیں۔

(یہ سن کر انھوں نے میری درخواست پر کچھ سکھا اور کہا)

لاٹ صاحب: مشکل یہ آن پڑی ہے کہ میں اب عنقریب پنشن پر جا رہا ہوں۔ اس سال کے
انتخاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے فی الوقت تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔ ہاں تمہاری درخواست
کے جو مشکل مرحلے ہیں اٹھے کیے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ سال اس
درخواست کی منظوری میں کوئی وقت پیش نہ آئے گی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ تم
نیتی تال میں آکر مجھ سے کیوں نہیں منے۔ نواب صاحب کا جو خط تم لائے ہو وہ کئی
ہفتے پہلے کا ہے۔ اگر اسی زمانے میں میرے پاس آگے ہوتے تو جب ہی انتخاب
ہو جاتا۔ میں نے اس پر راپور کے سارے واقعات بیان کر دیے، اور یہ بھی کہا کہ
آپ کے دورے کی وجہ سے مجھے خدا معلوم کہاں کہاں بھاگنا پڑا ہے۔ یہ سن کر
وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے:

لاٹ صاحب: میں پنشن پر تو ہٹ رہا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اپنے جانشین کے ساتھ مجھے
کچھ دنوں اور اس لیے کام کرنا ہوگا کہ امیر کابل آرہے ہیں اور شاید ہم دونوں کو
ان کی خدمت میں رہنا پڑے۔ میں جنوری ۱۹۰۷ء میں اسفندار اللہ خان میں
آگرہ میں ہوں گا۔ میرے جانشین سر جان بیوٹ بھی وہیں ہوں گے اور نواب صاحب
نوبار بھی وہیں ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہیں تمہارے انتخاب کا تصفیہ ہو جائے۔
غرض اس قسم کی گفتگو میں کوئی پون گھنٹہ لگ گیا یہ سوچ کر کہ اس وقت تک لاٹ صاحب
سے ملنے والے نو دس آدمی رخصت ہو چکے ہوں گے۔ اور خدا معلوم مجھے دل میں کیا کچھ بڑا بھلا

کہ گئے ہوں گے اور جو بیٹھے ہیں وہ کیا کچھ بُرا بھلا کہہ رہے ہوں گے میں نے اجازت طلب کی۔ لاٹ صاحب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ گھنٹی بجائی۔ سگریٹری صاحب نے دروازہ کھولا۔ ہم سلام کر کے سکرانے ہوئے باہر نکلے۔ سگریٹری صاحب نے پہلے سے کہیں زیادہ ہماری آؤ بھگت کی۔ ہم برآمدے میں آئے۔۔۔ ایک دوسرے پانچ منٹ والے صاحب اندر گئے۔ ہم اور میاں رحمت نانگے میں بیٹھے اور گھر واپس آئے۔ گھر پر آ کر سارا قصہ اپنے میزبان عبدالمجید خاں کے سامنے دہرایا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ ایسی گفتگو لائے صاحب سے شاید ہی کسی نے کی ہو، تو کی ہو۔ وہ تو کہو کہ بڑا شریف انگریز ہے ہنس ہنس کر تمھاری یہ مسخرے پن کی باتیں سنا کیا۔ کوئی سُر پھر انگریز ہوتا تو ٹھوکر سے خبر لیتا۔

میں نے کہا: "جی ہاں! ٹھوکر سے خبر لیتا۔ مجھے تو کوئی ایسا بڑے باپ کا بیٹا نظر نہیں آتا جو ایک مارے اور دو نہ کھائے۔" کہنے لگے: "مرزا صاحب! کیوں خفا ہوتے ہو۔ ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی ہے جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کچھ دن نوکری میں گزارو۔ اس کے بعد پوچھیں گے اب کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

لاٹ صاحب کی ملاقات کے بعد ہم دو تین روز الہ آباد میں رہے۔ پھر دہلی آ گئے۔ نواب صاحب دوبارہ دہلی ہی میں تھے۔ ان سے ملے۔ تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دیے وہ بڑے جہانمیرہ شخص تھے اور زمانے کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ کہنے لگے کہ: "میری رائے میں تمہارا مسخرہ پن میرے خط سے کہیں زیادہ کام کر گیا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا: جناب والا! میں نے کون سا مسخرہ پن کیا، جو سچی بات تھی وہ صاف صاف کر دی۔ کہنے لگے: "تم نہیں جانتے۔ ایسے بڑے لوگوں کے سامنے اس طرح کوئی صاف صاف باتیں نہیں کرتا۔ اور خاص کر ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا جس سے اُن کا مذاق اڑتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسی باتیں کرتا ہے تو وہ دبو انا سمجھا جاتا ہے یا مسخرا۔" جیل خانے کی تعلیم کا یہ پہلا سبق تھا جو ہم کو اس روز ملے۔ کچھ دنوں کے بعد لاٹ صاحب کا خط نواب صاحب کے پاس آیا۔ وہ انھوں نے میرے پاس بھیجوا دیا۔ خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ واقعی شریف آدمی اس کو کہتے ہیں۔ خط میں وہ تمام واقعات مختصراً لکھے تھے جو اس عجیب رنگ کی ملاقات میں گزرے تھے۔

میری زندہ دلی اور صاف گوئی کی بہت تعریف کی تھی۔ میرے انتخاب کے متعلق اپنی تحریک کا ذکر کیا تھا۔ اور آخر میں اشارتاً یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اپنے بھانجے صاحب کو یہ ضرور سمجھا دیجیے کہ صاف گوئی اچھی ہے لیکن طبیعت کے موقع و محل سے ہو۔ اور خوش مذاقی خدا کی ایک دین ہے بشرطیکہ اس کا استعمال مناسب موقع پر کیا جائے۔ نواب صاحب نے یہ خط مجھے بطور سرٹیفکیٹ لکھنے کو بھیجا تھا میں سمجھا کہ شاید دیکھنے کو بھیجا ہے۔ پڑھ کر واپس کر دیا۔ دو چار روز کے بعد جا کر پوچھا تو پتا نہیں چلا کہ کہاں لکھو گیا۔

شروع شد، م ۱۳۱۶ ف میں ہم آگرہ پہنچے، وہاں امیر حبیب اللہ خاں شاہ کا بل بھی آئے۔ مرحبان بیوٹ بھی آئے۔ نواب صاحب لو بار و بھی آئے۔ نہیں آئے تو جنمیں لافش۔ معلوم ہوا کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے ولایت چلے گئے۔ یہاں نواب صاحب نے لٹ صاحب کے سکرٹری سے ہماری درخواست کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا: لاؤش صاحب صاحب اس درخواست پر ایسا نوٹ لکھ گئے ہیں کہ اس کو منظور ہی سمجھیے۔ اس سال ڈپٹی کلکٹر کا جو انتخاب ہو گا اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام نہ اور آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کسی فکر کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اس لیے امیر کا بل کے کیسپ کو اپنا گھر بنا یا۔ اور وہاں دعوتوں اور تماشا میوں کا لطف اٹھایا اور خوب اٹھی یا۔

دیکھا جائے تو انسان کی قسمت بھی ایک تماشہ ہے، کہیں جڑتی ہے تو کہیں ٹوٹتی ہے اور کبھی ٹوٹتی ہے تو کبھی جڑتی ہے۔

حیدرآباد جانے کا شوق
اور لو بارو کا سفر!

ہماری شادی عہدہ البجید خواجہ کی بہن سے ٹھہری تھی وہ بیچاری

ایک دفعہ ہی چل بسی۔ اب دوسری بیگہ کی تلاش ہوئی اور آخر میں ہماری نسبت اپنے ایک بچپانہ مرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی لڑکی سے ٹھہر گئی۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا سارا خاندان حیدرآباد میں تھا۔ اور یہ سب کے سب اچھی خدمتوں پر تھے۔ میرے والد صاحب بھی حیدرآباد میں رہتے تھے۔ البتہ میں دہلی میں اس وجہ سے رہتا تھا کہ میری بھوپھی صاحبہ نے مجھ کو بیٹا بنا لیا تھا۔ کیونکہ میری والدہ کا انتقال اس زمانے میں ہو گیا تھا جب میں نو دس دن کا تھا۔ مرزا ساجد بیگ صاحب حیدرآباد میں ناظم ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) تھے۔ اپنی

منگیتز کو میں نے دیکھا ضرور تھا مگر یہ دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر تھا۔ کیونکہ اس وقت تک اس لڑکی کی عمر ۳ سال کی اور میری نو سال کی۔ نسبت ٹھہرنے کے بعد یہ وحشت ہوئی کہ کسی طرح حیدرآباد چلو اور اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھو۔ ایک روز میں اور میرے عزیز دوست میاں رانی سے پہرے کے وقت پریڈ کے میدان میں سے ہو کر کالج گراؤنڈ جا رہے تھے کہ یہی ذکر نکلا۔ انھوں نے کہا کہ: "میرا دل بھی حیدرآباد دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ تم یہ کہہ کر وہاں جاؤ کہ نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔ میں بھی کسی نہ کسی ترکیب سے وہاں آ جاؤں گا۔ رسالت بہت اچھی تھی۔ دل کو لگ گئی۔ بجائے کالج جانے کے ہم گھر واپس آئے۔ چھوٹی صاحبہ کو الٹ سیڑھی سے بہت کچھ سمجھایا۔ وہ بے چاری ان چکروں کو کیا سمجھ سکتی تھی۔ راضی ہو گئی۔ دو سے ہی دن میں اور میرے ماموں زاد بھائی مرزا سلیم بیگ ریل سے روانہ ہو کر بھوانی پہنچے۔ بھوانی سے دوبارہ کوئی (۱۵) کوس ہے۔ پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لیے رات سے سواری کا کوئی انتظام نہیں ہوا تھا۔ جتنا راستہ تھا۔ سب کا سب ریل میں تھا۔ بھوانی سے راولپنڈی کر آیا۔ پریا اور چل دیے۔ راستے میں بڑے زور کا مینڈ برس۔ مگر اتنا تو یہ تھا کہ دونوں کا منہ ایک ہی پہلو بھینکا۔ اور دوسرا بالکل خشک رہا۔ مگر بے راولپنڈی کی وجہ سے یہ ہوا ہو مگر یہ امر واقع ہے کہ جب ہم دونوں جوٹی پہنچے تو ایک طرف سے جیب کھینچ کر چوڑا ہو گئے تھے اور دوسری طرف پانی کی ایک چھینٹ بھی نہیں پڑی تھی۔ رات جوٹی میں گزارنی روہاں کے چھوٹے اور کھلموں نے ہماری جس طرح خبر لی اس کی شکایت اب لا حاصل ہے۔ غرض صبح آٹھ بجے پھر راولپنڈی پر سوار ہوئے اور لوہارو پہنچ گئے۔ نواب صاحب سے ملے اور کہا کہ سفارشی خط لکھ دیجیے۔ یہ سن کر وہ ذرا خفا ہوئے اور کہا کہ: "ملازمت کا جب ایک جاگہ انتظام ہو گیا ہے تو اب بے ضرورت حیدرآباد کیوں جاتے ہو؟" لیکن جب ہم نے حیدرآباد جانے کی اصل غرض کا اظہار کیا تو وہ مسکرائے۔ اور دو خط لکھ دیے۔ ایک بلی صاحب۔ نیز پریڈ حیدرآباد کے نام تھا اور دوسرا سرگپسن وا کر معین الہام فیانس کے نام۔ یہ دونوں خط لینے کے بعد ہم کئی دن تک لوہارو میں رہے اور بڑے مزے سے رہے۔ ماموں علی بیگ (مرحوم) نے پستے ادا م کھلا کھلا کر معرہ خراب کر دیا اور ماموں بسنت بیگ (مرحوم) نے شام نامہ سنا سنا کر دماغ

پریشان کر دیا۔ آخر لوہارو سے نکلے اور بڑے ٹھاٹھ سے نکلے کئی سائڈ نیاں ساتھ تھیں ایک پر میں اور سلیم بیگ تھے۔ دوسرے پر شاہ رخ مرزا فرزند نواب صاحب لوہارو اور ان کے ایک دوست تھے۔ تیسری پر ان کے دو صاحب اور چوتھی پر پولیس کے دو جوان تھے۔ رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ ہم نے لوہارو چھوڑا۔ ریت میں قدم رکھتے ہی سائڈ نیاں بیل گئیں۔ گردن لمبی کر کے جو قدم بڑھانے شروع کیے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دربار میں کشتی بھی جا رہی ہے۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک طرف سے دو اور سائڈ نیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاہ رخ مرزا نے آواز دے کر ان کو روکا۔ ان دونوں سائڈ نیوں پر دو ٹھاٹھ اور ان کے دو نوکر سوا تھے۔ پوچھا: کہاں جاتے ہو؟ جواب ملا: ”شکار کے لیے“۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شکار کو جانے کے معنی میں ڈاک ڈالنے کے لیے اور ان کا یہ کمال بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنی سائڈ نیوں پر پہچاس سائڈ میل جاتے ہیں۔ ڈاک ڈالتے ہیں، اور صبح سے پہلے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ غرض وہ تو شکار کے لیے چلے گئے اور ہم آگے بڑھے۔ چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی۔ شاہ رخ مرزا نے اپنی سائڈ نی بڑھائی۔ ان کے ہمراہیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اور دگے کون ہا کہ ہم اور مرزا سلیم بیگ۔ ہم بھلا ان کا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ نظروں سے غائب ہو گئے۔ اب ہماری حالت زار کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ جنگل بیابان، کف دست میدان ہے۔ راستہ کا نام و نشان نہیں۔ کچھ اونٹوں کے پاؤں کے نشان ہیں۔ مگر ان نشانوں نے ایک دوسرے کو اس طرح کاٹا ہے کہ خاصہ جھول سمیوں کا ناقابل حل نقشہ بن گیا ہے۔ ہم دو عدد شخص ہیں۔ اور اونٹ کی پیٹھ ہے۔ نیچے ریت ہے اور چاندنی۔ اور آسمان کے اوپر التدمیاں۔ جب سائڈ نی کو بھگاتے بھگاتے تھک گئے اور ”نشانِ بانہ ملا تو لاپتہ رہ گئے“، شور سے ہوئے غور کیا گیا۔ اور التمد کا نام لے کر سائڈ نی کی ڈوری ڈھیلی کر کے اس کو اجازت دے دی گئی کہ تیرا جہاں جی چاہے لے چل۔ سائڈ نی نے فراتے بھنے اور ہم نے اس کے اوپر جھٹکے کھانے شروع کیے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ ڈور سے چاندنی میں دو اونٹ کھڑے نظر آئے۔ ڈر ہوا کہ کہیں یہ وہ ”شکاری“ ہی نہ ہوں لیکن کیا کیا جاتا۔ سائڈ نی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی ساخران اونٹوں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ شاہ رخ مرزا اور ان کے ساتھی آرام فرما رہے ہیں۔ وہاں ہم بھی اترے تھوڑی دیر آرام

یہ اور چل کھڑے ہوئے۔ جوٹی کے پاس تھوڑا سا پہاڑی حصہ اور خاصہ اچھا اتار ہے۔ اس جگہ ہماری سائڈنی نے ٹھوکر کھائی۔ میاں سلیم بیگ نے ڈوری زور سے گھسیٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوری چٹ سے ٹوٹ گئی۔ وہ تو کہو کہ سائڈنی اس گھسیٹ گھاٹ سے سنبھل چکی تھی، جو سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ورنہ ہم دونوں کو ختم ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ چلتے وقت سگریٹ کے ایک بڑے سے ڈبے میں کوئی ڈیڑھ سو پان لے کر چلے تھے۔ یہ ڈبے میرے پاس تھا۔ میں "شغل تنہائی" اس تیزی سے کیا کہ جوٹی پہنچے پہنچتے یہ "دلی خالصدان" سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔ سائڈنی کے کسنھنے کے بعد میاں سلیم بیگ نے پان مانگا۔ بھلا اب پان کہاں دھرا تھا۔ یہ سن کر انہیں بہت تاؤ آیا۔ مگر یہ سمجھ کر کہ اونٹ پر بیٹھ کر غصہ کرنا یا ہاتھ پاؤں ہلانا خالی از خطرہ نہیں ہے چپ ہو گئے۔ مسیو ہم بھوانی پہنچے اور چار بجے "داخل دئی" ہو گئے۔

حیدر آباد | اب کیا تھا۔ حیدر آباد جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور ہم نے تیسرے ہی روز ہلی چھوڑ دی۔ یہ جلدی اس لیے کی گئی تھی کہ کہیں حیدر آباد جانے کی اصلی وجہ نہ کھل جائے اور ساری کی کرائی محنت برباد ہو جائے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۱ مہر ۱۳۶۶ کو صبح کے ۸ بجے پنجاب میل سے روانہ ہوئے، دوسرے دن ۱۲ بجے کے قریب منٹاڑ پہنچے۔ انبے چھوٹی لائن سے منٹاڑ چھوڑا۔ اس زمانے میں لاہور کے اسٹیشن پر قرنطینہ تھا۔ اس سے ڈر گیا تھا۔ کیونکہ سنا تھا کہ مسافروں کو زیر دستی یہاں اتار کر کسی روز تک رکھتے ہیں۔ لیکن ہماری تو یہاں صرف نبض دیکھی گئی۔ اور ایک حکم نامہ دے دیا گیا کہ افضل گنج اسپتال میں جا کر روزانہ ۸ دن تک معائنہ کرایا کرو بے چارے درجہ سوم کے مسافروں پر مصیبت آئی۔ سب کے سب اتار لیے گئے۔ اور ساری گاڑی خالی ہو گئی۔ اورنگ آباد کے اسٹیشن پر بھائی حیدر جیون بیگ ملے، جو یہاں ناظم فیصلہ دڈسٹرکٹ جج) تھے۔ یہاں سے نکل کر جوگاڑی نے جوں کی چال چلنی شروع کی تو طبیعت بے زار ہو گئی۔ دوسرے دن شام کے ۵ بجے حیدر آباد پہنچے، منٹاڑ سے تار دے دیا تھا۔ اس لیے اسٹیشن پر والد صاحب قبلہ اور بھائی مرزا حسین احمد بیگ اور مرزا رفیق بیگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ عابد کی دوکان سے ہوتے ہوئے اور رزیڈنٹس کے پہلو سے گزرتے ہوئے چنچل گوڑہ پہنچے اور بھائی خواجہ امیر الدین (مرحوم) کے ہاں جا اترے۔ پیچھے ایک مشکل آسان ہو گئی۔

جزیرہ بورنیو کا سفر نامہ

اب اس کو موجودہ طریقہ تعلیم کی خرابی سمجھو یا ہمارے دماغ کی قوتوں کا انحطاط۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہم لوگ جتنی زیادہ تعلیم پاتے جاتے ہیں اتنی ہی زیادہ خود غرضی۔ خود بینی اور خود نمائی ہم میں بڑھتی جاتی ہے۔ دوسروں کو کیوں کہو۔ خود میری ہی حالت کو دیکھ لو۔ جب تک مدرسہ اور کالج میں رہا ہمیشہ امتحان میں اول نکلا۔ ہمیشہ وظیفہ اور انعام لیا۔ ہمیشہ تعریفیں ہونے لگیں۔ ہمیشہ دل بڑھایا گیا۔ یہاں تک کہ انجینئری کے امتحان میں ایسے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوا کہ گورنمنٹ نے چھوٹے ہی بلا مانگے ساڑھے چار سو کی نوکری دے دی۔ اگر چاہتا تو ملک کو اپنے کام اور اپنے دماغ سے بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ لیکن بجائے اس کے چھوٹے ہی بسم اللہ یہ کہ جس ہانڈی میں کھاتا تھا اسی میں چھید کرنا شروع کیا۔ یعنی لیڈر بننے کے شوق میں گورنمنٹ کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ سمندر سے ٹوٹ جوہڑ میں جا ملا۔ یعنی عدم تعاون پر کاربند ہو کر انگریزوں کا ممبر ہو گیا۔ میرے ہم پیشہ دوستوں نے بہت سمجھایا۔ چیف انجینئر صاحب نے بہت نصیحت کی۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ اور کیوں سنتا میں اپنے آپ کو افلاطون نماں سمجھتا تھا۔ جانتا تھا کہ ان لوگوں کی کوئی غرض ہے جو مجھ کو اس سیدھے راستے سے روک رہے ہیں۔ اب رہا میں۔ تو میں خدا کے فضل سے ایم۔ اے ہوں۔ انجینئریوں۔ بیٹی میں سے سونا نکال سکتا ہوں۔ میرے ہزار خریدار ہیں۔ کوئی گورنمنٹ ہی میرے رزق کی کفیل نہیں۔ گورنمنٹ کو مجھ جیسے کم ملیں گے۔ مجھ کو گورنمنٹ جیسے ہزاروں مل سکتے ہیں۔ غرض اسی قسم کے خیالات تھے کہ میں خدمت سے استعفار دے کر انگریزوں کا سرگرم ممبر بن گیا۔ پہلے ہی سالانہ جلسے میں

۱۔ یہ مضمون کافی طویل ہے۔ یہاں اس کا صرف ابتدائی حصہ شامل کیا گیا ہے جو آپ ایک دل چسپ مضمون ہے۔ حالانکہ

مکمل مضمون کے اصل مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

وہ دھواں دھارا تقریر کی اور گورنمنٹ پر ایسے آواز سے کہے کہ اخباروں میں میری دھوم مچ گئی۔ لیڈروں نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ پریسیڈنٹ نے مجھے کانگریس کی روح رواں کہا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے رجسٹروں میں مجھے بد معاش لکھا گیا اور گورنمنٹ کے ہاں میرے نام کے سامنے مشتبہ کا حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

اب کیا تھا۔ کھانا پینا کانگریس کا۔ ریل کا سفر کانگریس کا۔ سارا خرچ کانگریس کا۔ مزے سے اول درجے میں سفر کرتا۔ جہاں چاہتا جاتا۔ جہاں چاہتا رہتا۔ اور جو چاہتا کرتا۔ بس میرے ذمے یہ کام تھا کہ لکچروں کے ذریعے سے لوگوں کو عدم تعاون کی تعلیم دوں میں نے لغات دیکھ کر بڑے موٹے موٹے اور چندہ الفاظ نکال لیے تھے اس لیے میرے لکچروں میں مضمون تو شاید ہی کچھ ہوتا ہو، تو ہوتا ہو ہاں وہ وہ تول تول کر گورنمنٹ کو صلواتیں سناتا وہ وہ آواز سے کتا اور وہ وہ مذاق اڑاتا کہ زمین اور آسمان تالیوں کی آوازوں، اللہ اکبر کے نعروں اور بندے ماترم کے شور سے ہل جاتے اور لکچر کے ختم پر اس قدر کھولوں کے بار مجھے پہنائے جاتے کہ ان کی قیمت سے ہزاروں بھوکے مہینہ بھرتک باسانی پل سکتے۔

مجھے امید تھی کہ دوسرے سال کانگریس میں پریسیڈنٹ میرے سرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر میں نے دیکھا کہ یہاں تو اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھر اپنوں ہی کو دے کا رنگ ہے۔ روپیہ پیسہ مانگو تو دینے میں ذرا انکار نہیں۔ ہاں کانگریس کی پہلی صفت میں آنا چاہو تو دھکے دے کر پیچھے ہٹا دیں۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ یہ کانگریس کیا ہے یا روں کی لیٹڈ کمپنی ہے بہت جی چاہا کہ چھوڑ بیٹھوں۔ پھر سوچا۔ کون جا کر دھوپوں میں پھرے۔ جریب گھسیٹے۔ قلبوں اور میٹوں سے تو تو، تیں، میں کرے یہیں پڑے رہو۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہو۔ دنیا دیکھتے ہو۔ اچھے سے اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہو۔ بڑے سے بڑے لوگوں میں گھرے رہتے ہو۔ دعوتیں کھاتے ہو۔ شریفوں سے اپنی گاڑیاں کھجاتے ہو۔ اور کرتے کیا ہو۔ بس یہی نا کہ گورنمنٹ کو بے نقط سنا دیتے ہو۔ ایسی اچھی نوکری کہاں ملے گی۔ غرض جوش نے کانگریس میں شریک کر لیا تھا۔ اور ضرورت نے کانگریس میں اٹکایا۔ میں تو ایسا کایاں تھا کہ قیامت تک بھی جیل نہ جانا۔ اور یونہی تمام عمر مزے اڑاتا۔ مگر کیا کروں اُن قدر بھکت

و ان ساقی نماں کی صورت پیش آئی۔ لمیڈ ٹیکنی کے اکثر ڈاکٹر کر جیل خانے پہنچے۔ ان کی جگہ دوسرے عارضی ممبر مقرر ہوئے۔ مگر ان کو چندہ کون دیتا۔ اور چندہ نہ ملتا تو ہم جیسے بے فکروں کا خرچ کیوں چلتا۔ آخر یہ ہوا کہ ایک دم ساری کشتی کی کشتی بیٹھ گئی۔ ہم نے بھی تیرنے کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر رزق کا سندر ایسا گہرا تھا کہ کسی چٹان پر پاؤں نہ ٹکا۔ گورنمنٹ میں عرضی پر زہ کیا۔ اپنے کیے سے بہت کچھ توبہ تلا کی۔ آئندہ کو ملک اور کانگریس کو گالیاں دینے کا وعدہ کیا مگر بھلا گورنمنٹ کیا سننے والی تھی سمجھتی تھی کہ ذرا ان کو زمانے کی ٹھوکریں کھانے دو۔ پھر معلوم ہوا کہ امن کیا ہے اور بد امنی پھیلانے کے کیا نتیجے ہوتے ہیں۔ جب یہاں قسمت نے یاری نہ کی تو پھر ان روپیہ والوں کی طرف رجوع کیا جنہوں نے اکثر مہری گاڑیاں گھسیٹی تھیں۔ اب دیکھتا ہوں تو وہاں کا کبھی رنگ بدلا ہوا ہے جب لوگوں نے دیکھا کہ عدم تعاون کا بیڑا غرق ہو گیا تو کانگریس سے ٹوٹ کر گورنمنٹ سے آئے۔ ان کو گورنمنٹ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کیوں نہ لیتی۔ انہی کے ٹیکسوں سے سرکار کا خرچ چلتا ہے اور یورپ کا بھلا ہوتا ہے۔ اب رہ گئے ہم تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ مگر حضرت میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اول تو میں خود ہی ہوشیار تھا دوسرے دنیا کی ہوانے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ میں اس الٹ پھیر میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ بغیر لوگوں کے دنیا کیوں کر چلائی جاسکتی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں دم نہ تھا نہ سہی۔ قلم میں روانی اور سر میں بھیجا تو تھا۔ صرف جون بدل لینا کافی تھی۔ لیڈروں کے زمرے سے نکل اہل قلم کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم نے بتا دیا تھا کہ دنیا میں مضمون کی بہ نسبت الفاظ کی زیادہ ضرورت ہے کسی کو دلائل سے قائل کرنا دشوار ہے۔ ہاں پھتیاں کہہ کر اور آواز سے کس کر بڑے سے بڑے کا خاکہ اڑایا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زمانے نے مجھے یہ بھی سکھا دیا تھا کہ کسی ایک فریق کا ساتھ دینا گویا اپنے آپ کو تباہ کر لینا ہے۔ غرض ان ہتھیاروں سے تیار ہوا میں پھر میدان جنگ میں اتر آیا۔ مگر یہاں بھی پانسہ الٹا پڑا۔ میرے مضمون بڑے شوق سے لیے گئے اور بہت تعریفوں سے چھاپے گئے لیکن مضمون لکھنے کی جو اصل غرض تھی۔ یعنی نقد مہر و دم، وہ حاصل نہ ہوئی۔ ہر مہینے میرے پاس اتنے پرچے آجاتے کہ پڑھتے پڑھتے بیزار

ہو جاتا۔ مگر پرچے کھانے سے تو رہا جو پیٹ بھرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ردی کے بھاؤ بیچ دیتا۔ آخر کہاں تک اس پیشے کو بھی چھوڑنا پڑا۔ پیری مریدی کا سلسلہ ڈالا۔ مگر یہاں بھی دیکھا تو سوائے رجسٹر شدہ کمپنیوں کے اور کسی کا گزارہ نہیں۔ آخر تھک تھکا کر نوکری یا ہجرت کی سوچی۔ مگر اس کے لیے بھی سفارش اور روپیے کی ضرورت تھی۔ اللہ کسی کو عقل دے تو میری سی دے۔ ایسی ترکیب نکالی کہ سبحان اللہ مجذوب بن گیا۔ جس ریل میں چاہتا بیٹھ جاتا اور جہاں چاہتا اتر جاتا۔ کھانے پینے کو مسافر کچھ نہ کچھ بغیر مانگے دے دیتے۔ جس شہر میں جاتا۔ خاصا بھلا چنگا بن ایک آدھ روز نوکری کی تلاش کرتا۔ نہ ملتی تو پھر ریل میں بیٹھ دوسری جگہ جا پہنچتا۔ آخر پھرتا پھرتا کلکتہ پہنچا۔ پتہ چلا کہ بالینڈ والوں کو ایک انجینئر کی ضرورت ہے۔ وہاں گیا۔ منیجر کو میری حالت دیکھ کر یقین نہ آیا کہ میں انجینئر ہوں۔ میں نے اپنے واقعات بیان کیے۔ اس نے نوٹ کر لیے۔ دوسرے دن آنے کو کہا۔ اس عرصے میں اس نے پولیس سے میرے متعلق دریافت کیا۔ وہاں سے مشتبہ اور سخت خطرناک کے خوشمال لفظ سے میری ڈگریوں میں امانت کر کے واقعات کی تصدیق کی گئی۔ بھلا بالینڈ والے اس سے کیا ڈرتے تھے۔ مجھے دوسرے ہی دن چار سو روپیے مہینے اور اخراجات سفر پر نوکر رکھ لیا گیا۔ جزیرہ بورنیو میں بالینڈ کا جو علاقہ ہے اس کے بعض حصوں کی پیمائش ہونے والی تھی۔ اس کے ہم انجینئر مقرر ہوئے اور اس طرح ملازمت اور بیت دونوں ایک ہی وقت "نصیب یاران" ہو گئی۔ درجہ اول کے ٹکٹ کے ساتھ ہزار روپے سامان سفر کے لیے ملے۔ اور چند ہی دن میں ہم سوٹ بوٹ سے لیس ہو کر بورنیو جانے کو تیار ہو گئے۔ یہاں سے جو ہم نے لمبی لی تو سیدھے کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے فرانسیسی جہاز میں سوار ہونا ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان والوں کو خدا حافظ کہتے ہیں اور "ملک خدا تنگ نیست پائے مرانگ نیست" کا وظیفہ پڑھتے ہوئے نئے نئے پانی کا رُخ کرتے ہیں۔

میں تھے۔ وہ ایسے ایسے فقرے بول جاتے تھے کہ ان کا سمجھنا مشکل ہوتا تھا۔ مقدمہ مردم بھی ان کا ایک فقرہ ہے جو نقدہ و حرمتہ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ مرحوم کی یاد نے اصلی فقرہ کی بجائے ان کا فقرہ استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔

ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پر اگندہ صفحے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ عرصے سے فکر میں تھا کہ رسالہ نمائش کے لیے کوئی مضمون لکھوں مگر اس کے لیے فرصت چاہیے۔ مجھے دفتر سے چھٹکارا نہیں۔ چند روز ہوئے پیارے لال پساری کے ہاں سے گھر میں کچھ سودا آیا تھا میں دفتر سے آکر بیٹا تھا۔ پڑیوں پر نظر پڑی۔ اٹھا کر دیکھنے کا۔ معلوم ہوا کہ کسی کی سوانح عمری کے صفحات ہیں مضمون دل چسپ اور خط صاف تھا۔ تمام پڑیاں کھون ڈالیں۔ دیکھوں تو عجب پر لطف واقعات ہیں۔ اسی وقت پیارے لال کے ہاں پہنچا وہاں اور بھی حید کاغذات ملے۔ مگر سب متفرق و ہریشان۔

جو کچھ ملے اس کی نقل روانہ کرتا ہوں۔ یہی محنت سے بچا اور آپ کو ایک دل چسپ مضمون مل گیا لیکن افسوس اس کا بے کر ڈائری کا مکمل نسخہ ملا اور نہ اب ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ خیر حاضر میں محبت نہیں۔

والسلام

(مرزا الم نشرح)

دیباچہ ڈائری

یہ ناپچیز خادم ملک و ملت نواب اسد یار خاں ناظرین کرام کی خدمت میں عرض پر داز ہے کہ اس

کمترین کوکتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہنی بھی چاہیے۔ کیوں کہ جب باری تعالیٰ نے ان ناپاک ہستیوں کو نجس العین فرمایا ہے تو انسان ضعیف البیان کی کیا ہستی ہے کہ ان احکام کی خلاف ورزی کرے اور جب ہمارے ہادی برحق نے کتوں سے کنارہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے تو اب کس کی مجال ہے کہ ان ہدایتوں پر عمل کرنے سے گریز کرے۔

اکثر اصحاب اس ناچیز سے دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کتوں سے نفرت کرنے کی وجہ کیا ہے اس کا جواب میں پہلے تو ٹیکسپسٹر کے اس فقرے سے دیتا ہوں کہ ”جذبات انسانی طبیعت کے تابع ہیں۔ طبیعت اپنے حسب دل خواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جس طرف چاہے پھیر دیتی ہے“ دوسرے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال ناقص میں کتوں کا ہلاک کرنا کارِ ثواب ہے۔ ثواب ہی نہیں بند جہاد اور جہاد بھی کیسا کہ جہاد اکبر۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کافر نجس میں نجس العین نہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ کتے نجس العین ہیں۔ جب نجس کو ہلاک کرنا جہاد ہے تو نجس العین کو مارنا یقیناً جہاد سے بھی کچھ افضل ہے۔ یہی خیالات تھے جس کی وجہ سے میں کتوں کا جانی دشمن ہو گیا۔ جہاں پاتا۔ مارتا۔ اور جہاں دیکھتا کم سے کم دو تین لائیں تو ضرور رسید کر دیتا۔ البتہ بعض کتے بڑے زبردست اور خوفناک ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں چوں کہ اپنی جان کی حفاظت فرض ہے اس لیے احتیاطاً کوکام میں لانا۔ کبھی کچھ سے کبھی کسی اور طرح ان کو ٹھکانے لگانا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری محنت مشکوٰۃ بونی اور میری اس سرگرمی کی یہ داد ملی کہ پبلک نے مجھے ”غازی کے بجائے“ ثواب کتے مارناں“ کا خطاب دیا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

جو جو مشکلات اور مقابلے مجھے اس جہاد میں پیش آئے ان کو میں نے اپنی ڈائری سے لے کر ایک جگہ جمع کیا اور اس کا نام ”فتوح الکلاب“ رکھا ہے

نوشتہ بماند سیہ بر سفید

نوسیندہ رانیت فردا امید

امید ہے کہ قارئین کرام ان حالات کو پڑھ کر فائدہ اٹھائیں گے۔ اگر میری اس تحریر نے بعض اصحاب کے دل میں کتوں سے نفرت پیدا کر دی اور وہ میری طرح کتوں کو مارنے میں ہر شکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہے۔

نصیحت کسے سود مند آیدش
کہ گفتار سعدی پسند آیدش

والسلام علی من تبع الہدی
خاکسار نواب کتے مارخان

نوٹ: اس کے بعد کے چند صفحات غائب ہیں۔

کتا پیٹھ میں مکان ملا۔ سامنے ہی ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ اُن کا بڑا کارخانہ تھا۔ میری شومی قسمت (یا خوش قسمتی سے) ایک بڑا زبردست کتا بھی ان کے ہاں پلا ہوا تھا جب دیکھو دروازے کے باہر بیٹھا ہے۔ اور برآنے جانے والے پر بھونکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مارنا مجھ پر فرض ہو گیا۔ آمنے سامنے کے مقابلے کی تو ہمت نہ پڑی۔ ہاں یہ ترکیب اختیار کی کہ جب ادھر سے گزرتا کوئی نہ کوئی چیز اس کے کھانے کو ڈال دیتا۔ اس کو بھی کھانے کا چسکا پڑ گیا اور چند دنوں میں مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گیا۔ آخر ایک دن وہی میں کچلے دے کر اس کو جہنم واصل کر دیا۔

نواب صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ میرے خطاب اور حالات سے واقف تھے۔ مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میرا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے۔ چلو گئی گزری بات ہوئی۔

ایک روز میں باہر گیا ہوا تھا۔ کوئی دس گیارہ بجے جو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دروازے کے سامنے کتوں کا جگمگاٹا ہے اور میونسپلٹی کا چپراسی ایک ٹوکری بغل میں مارے کتوں کو گوشت پھینک رہا تھا۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا۔ بچتا بچتا چپراسی صاحب کے پاس تک پہنچا اور کہا ”بد معاش یہ تو نے کیا گڑ بڑ مچائی ہے۔ کیا اپنے باوا کی فاتحہ کا کھانا تقسیم کرنے کو میرا ہی دروازہ ملا۔ اب یہاں سے جاتا ہے یا نہیں یا پھر اور طرح خیروں۔“ چپراسی ناک بھوں چڑھا کر بولا ”اجی جاؤ جی جاؤ۔ ہم سرکاری حکم کو تعمیل کر رہے ہیں۔ حکم ہوا ہے کہ روز دس بسر گوشت اس جگہ کتوں کو ڈالا جائے۔ سرکاری سڑک ہے ایسا ہی برا معنوم ہوتا ہے۔ تو جا کر ہمارے نام کی نالیش کر دو۔“ گوشت کی بو پا کر ادھر ادھر سے کتے ڈٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں ہزاروں تاجم جمع ہو گیا۔ راستہ بند۔ گھر میں جاؤں تو کس طرح جاؤں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ایسی بڑی فوج کو چیر بھاڑ کر گزر جاؤں۔ آخر سوچتے سوچتے یہ سوچھی کہ اس بارے میں کسی وکیل سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ان دنوں لالہ شیو سیوان مل کی وکالت زوروں پر تھی یہی رہا

ان کے پاس پہنچا۔ تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ نواب بخول خاں پر میرے جانب سے استغاثہ دائر کر دیجیے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کارروائی نواب صاحب ہی نے کی ہے۔ میں نے کہا کہ ”ہونہ ہو یہ بھی کی کارستانی ہے۔ وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں۔ انھوں نے اس نامعقول چیراسی کو اس لشکر کی تقسیم پر مقرر کیا ہے۔“ وکیل صاحب نے کہا کہ قیامات پر کسی کو ملزم نہیں بنایا جاسکتا۔ میں نے کہا کہ تو میونسپل کمیٹی کو ملزم بنا دیجیے۔ انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو میں نے حل کر کہا تو اچھا کتوں ہی کو ملزم بنائیے۔

وکیل صاحب:..... معاف فرمائیے میں کتوں کو ملزم بنانا کر اپنی وقعت کھونا نہیں چاہتا۔
میں..... معلوم ہوتا ہے کہ کتوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ان میں اپنی وقعت کم ہونے سے آپ گھبراتے ہیں۔ یا شاید پہلے جنم میں آپ کہتے تھے کہ اپنے سابقہ رشتے داروں اور دوستوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے۔

وکیل صاحب نے بہت نیلے پیلے ہو کر میری طرف دیکھا مگر سمجھ گئے کہ ہاتھ پاؤں سے مجھ پر ورانا مشکل ہے۔ اس لیے کہنے لگے ”جناب میں نے عدم تعاون کے اصول پر کاربند ہو کر وکالت ترک کر دی ہے آپ کسی دوسرے وکیل کی تلاش کیجیے۔“

یہاں سے کورا جواب مل گیا تو میں نے دل میں کہا کہ چلو خود ہی قانون دیکھ ڈالو۔ انھیں وکیل صاحب میں کیا سرخاب کا پر ہے کہ یہی قانون سمجھتے ہیں دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ راستے میں آتے آتے تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری خرید لیا۔ گھر پر پہنچ کر تمام رات میں ان دونوں کتابوں کو دیکھ ڈالا۔ معاملہ کوئی پے چیدہ نہ تھا۔ قانون صاف تھا۔ کتوں کے افعال سے جرم مزاحمت بے جا پورا بنتا تھا۔ چنانچہ دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند کے تحت استغاثہ مرتب کیا۔ ترتیب استغاثہ کے وقت یہ دقت پیش آئی کہ آخر ملزمین کن کو بنایا جائے قانون پر غور کرنے کے بعد میں نے استغاثہ کا عنوان اس طرح قائم کیا۔

نواب اسد یار خاں مخاطب بہ کتے مار خاں بہادر۔ مستغیث

بنام

جمع سگان خورد وکلاں بازاری رفتار العقل، بولایت میونسپل کمیٹی... ملزمین

علت

مزاحمت بے جا زیر دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند

استغاثہ میں تمام واقعات مذکورہ بالا کی صراحت کر کے استدعا کی گئی تھی کہ چونکہ فاترالعقل ہونے کی وجہ سے کئے مستثنیات عامہ کی دفعہ ۸۴ میں داخل ہو جاتے ہیں اس لیے بعد تحقیقات میونسپل کمیٹی کو سزا قانونی صادر فرمائی جائے۔

استغاثہ مرتب کر کے دوسرے دن ڈپٹی کلک علی خاں صاحب مجسٹریٹ ضلع کے اجلاس پر داخل کر دیا۔ میرے حلفی بیان کے بعد عدالت سے میونسپل کمیٹی کے نام سمن جاری ہوئے اور تاریخ پیشی پر مقدمہ پیش ہوا۔ میونسپل کمیٹی کی جانب سے مسٹر کون ہیرسٹریٹ لا کونسل تھے۔ اپنی طرف سے میں نے خود پیروی کی۔

سب سے پہلے کونسل مزمین نے یہ بحث چھیڑی کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ کتوں کے فاترالعقل ہونے کی کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں ان مباحث کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں نے بحث کی کہ میرے فاضل دوست نے اپنی بحث کی ابتدا ہی غلط کی ہے کہ پہلے ولایت کا مسئلہ چھیڑا ہے اور بعد میں کتوں کے فاترالعقل ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ پہلے کتوں کے فاترالعقل ہونے پر بحث کی جاتی اگر وہ فاترالعقل قرار پاتے تو اس صورت میں ولایت کی بحث کی جاتی۔

بہر حال پہلے میں اپنے فاضل دوست سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ انھیں کتوں کے فاترالعقل تسلیم کرنے میں کیا کیوں تامل ہے؟

مسٹر کون: میں بغیر ثبوت کے کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔
ڈپٹی صاحب: میرے خیال میں بعض کتے اپنے مالکوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔
مسٹر کون: جناب والا صحیح ارشاد فرماتے ہیں۔ خود میرا کتا ٹوٹی ایسا ہی ہے۔
میں: ممکن ہے کہ مسٹر کون کا کتا خود ان سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کتے فاترالعقل نہیں ہوتے بلکہ اگر منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہ نکل سکتا ہے کہ مسٹر کون کتوں سے بھی زیادہ فاترالعقل ہیں۔

مسٹر کون: جناب والا میں ان الفاظ کی برداشت نہیں کر سکتا۔

نوٹ: یہ کچھ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے نواب صاحب کو مکان ملا تو کتا بیچھ میں۔ مقابلے تو بخول خاں۔ ہیرسٹریٹے تو مسٹر کون کی۔ ڈپٹی صاحب نے تو محبت علی خاں کو کس صاحب نے تو شہید سوانہ ل۔ غرض کتوں کے طرز سے کہیں نجات نہیں ملی ہے۔ واقعی یہ اتفاقات میں رہنے کے

میں : حضور اس مسئلے کا صغریٰ اور کبریٰ خود مسٹر کوئی نے قائم کیا ہے۔ میں نے تو صرف اس کی بنا پر نتیجے کا اظہار کیا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مسٹر کوئی کتنوں سے زیادہ بے وقوف ہیں انہوں نے خود اپنی عقل کا معیار ظاہر کیا تعجب ہے کہ اسی کے دہرانے کو یہ اپنی توہین خیال فرماتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب : اچھا اب آپ اپنی بحث کی طرف رجوع کیجیے۔

میں : جناب والا کسی کے عاقل یا فاتر العقل ہونے کا اندازہ اس کے افعال سے لگایا جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتے بازاروں میں کھڑے بڈیاں چبوتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر شرم تک نہیں آتی تو ان کو فاتر العقل کہتے ہیں۔ کون امر مانع ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ خود ان کے افعال ان کے فاتر العقل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

مسٹر کوئی : میرے خیال میں ان کا اس طرح بڈیاں چبانے کے فاتر العقل ہونے کا ثبوت قطعی نہیں ہے۔ میں : اگر میرے فاضل دوست سڑک پر کھڑے ہو کر بڈیاں چبانے لگیں اور کوئی ان کو فاتر العقل نہ کہے تو میں کتنوں کو کبھی فاتر العقل کے زمرے سے نکال دینے پر بالکل تیار ہوں۔

مسٹر کوئی : میں معزز عدالت کو توجہ دلانا ہوں کہ مستنڈیٹ نے جو الفاظ میری نسبت استعمال کیے ہیں وہ میری توہین کی حد تک پہنچتے ہیں۔

میں : جناب والا میرے فاضل دوست نے ثبوت طلب کیا۔ میں نے منطق سے اس کا جواب دیا۔ اگر یہ میرے اعتراض کا عملی ثبوت دینے پر تیار نہیں ہیں تو یہ کتنوں کو فاتر العقل تسلیم کریں۔ چلو چھٹی ہوئی نہ مجھ کو محبت نہ ان کو شکایت۔

ڈپٹی صاحب : بہتر ہوگا کہ اگر آپ اس منہم کی تمثیلات سے پرہیز کریں۔

میں : جناب والا۔ قانون ہمیشہ تمثیلات سے اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اگر تمثیلات سے جناب کو ایسی ہی نفرت ہے تو مناسب ہوگا کہ قانون سے ان کو خارج کر دینے کی تحریک فرمادی جائے۔

ڈپٹی صاحب : آپ خیال رکھیں کہ یہ گفتگو آپ کہاں کر رہے ہیں ممکن ہے کہ آپ کے الفاظ کی بنا پر تحقیر عدالت کا مقدمہ آپ پر قائم ہو جائے۔

میں : حضور والا کی تقریر سے خود میری محبت کی تائید ہوتی ہے۔ عدالت کوئی عاقل شخص نہیں ہے جس کی تحقیر ہو سکے۔ اگر خدا نخواستہ تحقیر ہوگی تو جناب والا کی اور اگر مقدمہ قائم ہوگا تو اس

عنوان سے قائم ہو سکے گا کہ

”عدالت (فائر العقل) بولایت صاحب مجسٹریٹ بہادر مستغیث“

ڈپٹی صاحب: آپ اپنی بحث میں احتیاط کیجیے اور آگے چلیے۔

میں: دوسری بحث فریق مخالف کی جانب سے کی جاتی ہے کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ نہیں ہے۔ اس کا جواب میں میونسپل کمیٹی کے ضابطے سے دینا چاہتا ہوں۔ میرے فاضل دوست اس امر کو تسلیم کریں گے کہ تمام رعایا کے مکانات سے میونسپل کمیٹی ٹیکس وصول کرتی ہے۔ لیکن جو جائیداد خود میونسپل کمیٹی کی ہے اس پر ہوس ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ اصول یہ ہوا کہ میونسپل کمیٹی کی جو چیز ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اس کا غٹس ملاحظہ کیجیے۔ رعایا کے کتوں پر میونسپل کمیٹی ٹیکس لیتی ہے۔ لیکن بازاری کتوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگلی کتے میونسپل کمیٹی کی ملک میں اور چوں کہ جیسا کہ میں اور پڑھا کر آیا ہوں) یہ کتے فائر العقل اس لیے ہیں کہ ان کا ٹاکہ و قابض یعنی میونسپل کمیٹی ان کی ولیہ جائز ہے۔

مسٹر کوئی: میں معزز عدالت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دوست کے ان فقروں سے میرے موکلین کی توہین ہوتی ہے۔

میں: میں اپنے فاضل دوست سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے موکل کتے ہیں یا میونسپل کمیٹی؟ اس صراحت کی مجھے اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ مستغیث کی نگاہ میں بحیثیت ملزمین اس مقدمے میں کتوں اور میونسپل کمیٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسٹر کوئی: میں معزز عدالت کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ یہ دوسرے پہلو سے میرے موکلین پر حملہ کیا جا رہا ہے۔ میں: میرے فاضل دوست نے میرے سوال کا جواب عنایت نہیں فرمایا۔

مسٹر کوئی: میں میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیروی کر رہا ہوں۔

میں: جب مسٹر کوئی کتوں کی طرف سے کونسل نہیں ہیں اور یہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ بھی تسلیم نہیں کرتے تو میں یہ پوچھتا چاہتا ہوں کہ یہ کون سے قاعدے کی رو سے کتوں کی طرف سے بحث کر رہے ہیں۔ ان کو چاہیے تھا کہ اپنے موکل کا نام زمرہ ملزمین سے خارج کرانے کی کوشش کرتے۔ بقیہ ملزمین اور ہم خود آپس میں بھگت لیتے۔ بحالت موجودہ میونسپل کمیٹی نے جو ایک بیسٹر مقرر

کر کے رعایا کا روپیہ برباد کیا ہے اس کے متعلق میں عدالت سے نہایت ادب کے ساتھ درخواست کروں گا کہ مجھے رعایا کی جانب سے میونسپل کمیٹی پر خیانت مجرمانہ زیر دفعہ (۴۰۵) تعزیرات ہند مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی جائے۔

ڈپٹی صاحب: آپ صرف اپنے مقدمے سے سروکار رکھیے۔

مسٹر کولی: میں مستغیث کے ان مباحثہ قانونی کا کوئی جواب دے کر عدالت کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ معزز عدالت خود ان کی وقعت پر غور کر کے فیصلہ صادر فرما سکتی ہے۔ مجھے صرف ایک قانونی بحث اور کرنی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ تعزیرات ہند میں صرف افعال اشخاص سے بحث کی گئی ہے جانوروں کے افعال اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اگر میں تسلیم کروں کہ چند کتے مستغیث کے دروازے کے سامنے جمع ہوئے اور بفرص محال ان کے سداہ کھبی ہوئے تو ان کے افعال ان کو مزاحمت بے جا کے جرم کے تحت میں نہیں لاسکتے۔

میں: میں اپنے فاضل دوست کی اس بحث کی قدر کرتا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نھوں نے تعزیرات ہند کو نہایت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ میں ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میونسپل کمیٹی قانوناً "شخص" کی تعریف میں داخل ہو سکتی ہے؟

مسٹر کولی: ہو سکتی ہے۔

میں: یہ کیوں کر؟

مسٹر کولی: کیوں کہ چند میونسپل کمشنروں کے ثبوتے کا نام میونسپل کمیٹی ہے۔ اس وجہ سے لفظ "شخص" کا اطلاق قانوناً اس پر ہو سکتا ہے۔

میں: میرے فاضل دوست نے خود اپنے اس جواب سے اپنے اعتراض کو رفع کر دیا۔ جب چند جانداروں کے مجموعے پر لفظ "شخص" کا اطلاق ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کتوں کا مجموعہ لفظ "شخص" کے تحت میں کیوں نہ آئے اور جب کتوں کا مجموعہ لفظ "شخص" سے قانوناً تعبیر کیا جاسکتا ہے تو جو افعال اس کتوں کے مجموعے سے سرزد ہوئے ہیں ان سے تعزیرات ہند کے جرائم متعلق ہو جائیں گے۔

مسٹر کولی: میں اس بحث کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔

میں : مجھے آپ کے دماغ سے یہی امید تھی کیا اچھا ہوتا اگر آپ اپنے کتے کو بھی ساتھ لے آتے۔ شاید دونوں مل کر اس بحث کو سمجھ لیتے۔

ڈپٹی صاحب : اچھا آگے چلیے۔

میں : اب رہی یہ بحث کہ کتوں کا سدرہ ہونا مزاحمت بے جا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ تو میں اس کے متعلق نہایت زور سے کہوں گا کہ ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے میں اپنی اس بحث کو ایک تمثیل سے بہت اچھی طرح ذہن نشین کرا سکتا ہوں۔ فرض کیجیے۔ ہمارے بیرسٹر صاحب اپنے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور ہمارے ڈپٹی صاحب ان کے سدرہ ہوتے ہیں۔ اور اسی کش مکش میں ہمارے فاضل دوست کے دو چار ٹھوکریں بھی پڑ جاتی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مزاحمت بے جا جرم مکمل ہو گیا ؟

مسٹر کون : جرم ضرور ہوا مگر جن الفاظ میں وہ بیان کیا گیا ہے وہ عدالت کی توجہ کا محتاج ہے۔

میں : اب بیرسٹر صاحب کے دروازے پر ڈپٹی صاحب کو کتنا سمجھ لیجیے۔ اگر یہ اس کش مکش میں ہمارے فاضل دوست پر بھونکیں اور کاٹ بھی کھائیں تو کیا جرم مزاحمت بے جا مکمل نہیں ہوا۔

مسٹر کون : مفروضات کو قانون میں دخل نہیں ہے۔

میں : یہ قانونی مفروضات ہیں۔ میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ کتے لفظ ”شخص“ کی تعریف میں قانوناً آسکتے ہیں اور آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ڈپٹی صاحب بھی قانوناً شخص ہیں اس لیے اپنی بحث میں اگر میں نے یہ فرض کر لیا کہ ڈپٹی صاحب کتے ہیں تو کیا ظلم کیا۔ بہر حال جب ڈپٹی صاحب کا سدرہ ہونا جو مسٹر کون سے کوئی عینم یافتہ ہیں مزاحمت بے جا ہے تو کتوں کا سدرہ ہونا بدرجہ اولیٰ مزاحمت بے جا ہے۔ کیوں کہ ہمارے فاضل دوست تسلیم کرتے ہیں کہ بعض کتے ان سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔

(اس سے آگے کے صفحات غائب ہیں)

خدا خدا کر کے مکان مذکورہ مکان کو چھوٹا تھا۔ لیکن میری ضرورت کو کافی ہے گھر میں تھا کون میں، میری بلیاں اور ایک کھوسٹ ماما۔ دیوار بیچ موٹوی قسطیہ صاحب کا مکان تھا۔ بے چارے بڑے بھلا آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مجھ سے آکر ملے۔ حالات دریافت کیے۔ باتوں باتوں میں کتنا پیٹھ کے مکان

چھوڑنے کا بھی ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے تمام واقعات بیان کیے کہنے لگے: 'بھئی معاف کرنا۔ میرے ہاں بھی ایک کتا پلا ہوا ہے مگر بہت غریب ہے اور میں کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو آکر تکلیف نہ دے۔ کتے کا ذکر سنتے ہی جو وقعت مولوی صاحب کی میرے دل میں قائم ہوئی تھی وہ بیک قلم جاتی رہی۔ اس کے بعد میں نے ان سے کچھ اگھڑی اگھڑی باتیں کیں اور وہ کسی قدر کشیدہ خاطر ہو کر میرے پاس سے اٹھ گئے۔

چار روز تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ پانچویں روز میں صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک نہایت بد صورت کالا کتا پانخانے کی مہری سے نکل کر بہت اطمینان سے اندر آیا اور اس طرح ٹہلنے لگا گویا اس کے باوا کا مکان ہے۔ میں نے بہت دھت دھت کی لیکن اس نے یہ بھی نہ جانا کہ کون کتا بھونک رہا ہے۔ میں نے فہمین کو پکارا۔ وہ باورچی خانے سے نکڑی لے کر دوڑی، جب کہیں جا کر یہ بلا دفع ہوئی اب مشکل یہ آپڑی کہ پے خانہ کے برابر وانی دیوار مولوی قسطیہ صاحب کی تھی اور مہری بھی انھی کی تھی۔ مہری بند کس طرح کرتا! آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب سوچی، کوئی دو من کا پتھر لے کر عین مہری کے اوپر منڈیر کے بالکل کنارے پر رکھا، پتھر میں رستی باندھی اور مہری کے سامنے بیچوں بیچ ایک مہی سیس لگائے اور رستی کوتان کر اس کا دوسرا سر اکیل میں باندھ دیا۔ اور دل میں کہا: "نو بیٹا اب تم آنا کھوپڑی چورم چور نہ ہو جائے تو میرا نام نواب کتے مار خاں نہیں۔"

وہ دن تو خیر سے گزر گیا۔ دوسرے دن صبح ہی کو مولوی صاحب کے کتے نے میرے مکان میں مہر گشت کا ارادہ کیا۔ میں صحن میں بیٹھا ان کی کارگزاری دیکھ رہا تھا انھوں نے نہایت اطمینان سے مہری میں سر ڈالا۔ سر رستی سے نکل آیا، ادھر انھوں نے زور کیا ادھر پتھر آہستہ آہستہ منڈیر سے کھسکا شروع ہوا۔ ادھر یہ مہری سے باہر نکلے ادھر پتھر اوپر سے آیا، قیں سر کے وہاں ٹھنڈے ہو گئے۔ مولوی صاحب کی بیوی نے جو آواز سنی تو غل جچایا، ہائے ہائے مولوی صاحب اس حرام زادے نواب نے میرے کتے کو مار ڈالا۔ خدا اس کو غارت کرے! ایک لمحہ نہ گزرا تھا کہ مولوی صاحب میرے مکان میں آئے اور بغیر سلام علیک کہے سیدھے مہری کے پاس پہنچے۔ کتے کو پتھر کے نیچے سے نکالا اور اسی طرح چپ چاپ واپس چلے گئے۔ مجھے خیال تھا کہ کچھ گل خپ ہو جائے گی لیکن ان کے اس تحمل پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ چلو منفت میں ایک کتا تو کم ہوا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ اگر معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب کا سکون طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہے تو میں پہلے ہی سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

اس کے بعد بی نہیں کا مومئی صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھا۔ جب دیکھو باورچی خانہ خالی پڑا ہے میں نے کہا ”بی نہیں اس طرح راہ و رسم بڑھانا اچھا نہیں تمہیں میرے پاس رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو ورنہ خدا حافظ۔ تمہیں نوکری کی کمی نہیں اور مجھے نوکریوں کا توڑا نہیں۔“ بی نہیں نے کہا ”میاں میں آپ کا کام کاج کر کے دو گھڑی رحمت کی ماں کے پاس جا بیٹھتی ہوں اگر آپ کو یہ ناگوار ہے تو آج سے نہ جایا کروں گی۔“ یہ سن کر میں چپ ہو رہا۔

دوسرے دن شام کو بی نہیں باغیچے کا پتی میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں ”میاں مجھے بنجا چڑھ رہا ہے۔ آپ اجازت دیں تو گھر جو آؤں۔ کھانا پکا دیا ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی اگر آپ کھانا کھا کر سامان باورچی خانے میں رکھ دیں تو انشاء اللہ میں کل صبح آکر دیکھ لوں گی۔“

میں نے کہا ”اس میں کیا ہرج ہے۔ جاؤ گھر جو آؤ۔ مگر کل صبح ضرور آ جانا۔ ورنہ مجھے تکلیف ہوگی۔“ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی اور میں نے باہر کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کم سخت بھی مومئی صاحب سے مل گئی تھی۔ بنجا کا بہانہ تھا مجھے صرف تنہا مکان میں چھوڑ جانا مقصود تھا۔

خیر بختوری دہر بعد میں نے اٹھ کر وضو کیا۔ عشا کی نماز پڑھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ باہر سیٹیل پانی ڈالی باورچی خانے میں سے کھانا نکال کر زایا، منجھ میں لوالا رکھنا ہی چاہتا تھا کہ پے خانہ کی مہری کی طرف سے تیاروں کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک کالا جگا درمی کتا صحن میں نازل ہوا۔ میں نے ہش ہش کی مارنے کو سکرٹی اٹھائی وہ مہری کی طرف بھاگا۔ لیکن مہری تک نہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا کتا اسی راستے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد تو کتوں کی قطار لگ گئی۔ ایک دو تین چار۔ دس بارہ بیس پچیس۔ خدا جھوٹ نہ بولے تو کم از کم تیس پینتیس کتے اندر گھس آئے۔ تمام صحن بھر گیا۔ ایک کو ماروں، دو کو ماروں، آخر کن کن کو ماروں۔ کتوں نے بھی دیکھا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے اور یہ شخص کچھ سہما ہوا سا ہے اور بھی شیر ہو گئے۔ پہلے مجھ پر غرائے ادھر کھانے کی بوناک میں گئی۔ ایک دم دسترخوان پر ہلہ بول دیا۔ ان کی یورش سے میں پریشان ہو کر بھاگا۔ کتے مجھے گھر میں یہی ایک غیر جنس ہے مجھ پر پل پڑے۔ مجھ کو اس وقت اور کچھ نہ سدھرا۔ سامنے پنکھا لٹکا ہوا تھا، جست کر کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک کتے نے چڑھتے چڑھتے پاؤں پر منجھ بھی مارا مگر میں جوں توں کسی نہ کسی طرح پنکھے پر جا ہی بیٹھا۔ اب کیا تھا حرام زادوں کو خونِ بیخمال گیا۔ نہایت فراغت سے دسترخوان صاف کر دیا اور ہم خون کے گھونٹ پینے پنکھے پر

بیٹھے رہے۔ کھانے اور لڑنے سے فراغت پا کر بد معاشوں نے مکان کے کونے کونے پر قبضہ کر لیا۔ کوئی کہیں جا بیٹھا کوئی کہیں دوز بردست کاے کتے عین میرے پنکھے کے نیچے آرام تمام آ کر قالین پر دراز ہو گئے۔ جب ذرا امن ہوا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس واردات کی بنا پر ان کتوں اور مولوی قسطیر صاحب پر کیا کیا جرائم عام ہو سکتے ہیں۔ تعزیرات نہد پاس نہ تھی۔ لیکن اس کی دفعات دھیان میں تھیں آخر رائے یہ قرار پائی کہ نقب زنی بلوہ اور ڈاکے کے جرائم کی اعانت کا الزام مولوی صاحب پر قائم کیا جاسکتا ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے استغاثہ کا مضمون بھی دل میں سوچ لیا۔ غرض اسی فکر میں رات کے کوئی بارہ بج گئے۔ نیند کا غلبہ ہوا آنکھیں بند ہونے لگیں اور آخر کار آنکھ لگ گئی کیا دیکھتا ہوں کہ بلوے نقب اور ڈاکے کا مقدمہ ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پیش ہوا۔ کتوں کو جس دوام عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور مولوی صاحب پر اعانت کا جرم ثابت قرار پا کر ۶ سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جو جرمانہ وصول ہوا اس میں سے حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ فوج داری نو ہزار روپیہ مستغیث کو دیا جائے۔ یہ سزا دفعہ میں بحال رہی اور مجھ کو جرمانہ وصول شدہ میں سے نو ہزار روپیے نقد حسب ضابطہ وصول ہو گئے۔ اب کیا تھا۔ یار دوستوں نے سارک باد کی بوچھاڑ کر دی اور تقاضا شروع کیا کہ اس خوشی میں جلسہ کیا جائے۔ خاص باغ میں جلسہ مقرر ہوا۔ ارباب نشا ط بڈائے گئے۔ ساون کا مہینہ ہے امراتی میں تھولا پڑا ہے۔ یہ خدا کا ہونے میں بیٹھا ہے۔ ننھی جان اور بی حفیظن کھڑی تھولا تھولا رہی ہیں، ملازگائے جارہے ہیں کہ ایک دفعہ ہی تھوے کی رسی توٹی اور میں دم سے نیچے آ رہا اور گرنے کے ساتھ ہی دو کتوں نے چیخ ماری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا ہوں تو پنکھے کے نیچے پڑا ہوا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ پنکھے سے جو گرا تو سیدھا کتوں کے اوپر ان کو اس بلائے ناگہانی کے نازل ہونے کا کیا خیال تھا۔ بڈیاں پسلیاں چورا ہو گئیں۔ لنگڑاتے اور پیختے ہوئے بھلگے دوسرے کتے بھی گھبرائے ان دونوں زخمیوں نے پہلے دروازے کا رخ کیا۔ اس کو بند پایا تو سیدھے پے خانے کی مہری کے طرف گئے۔ اور زور کر کے پار ہو گئے جانوروں میں بھیرا یا چال تو ہوتی ہی ہے سب کے سب یکے بعد دیگرے مہری سے نکل کر مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہو گئے۔ جب یہ آفت دفع ہوئی تو میں بھی اٹھا کونے میں بہت چوٹ آئی تھی۔ شکل سے کھسکتا کھسکتا دروازے کے پاس آیا کندھی کھولی۔ باہر نکلا اور تمام رات مڑک پر بیٹھ کر گزار دی، صبح بی نہیں سرخو چونڈا آئیں۔ میں نے ان کو بہت برا بھلا کہا اور حساب کر دیا۔ کیوں کہ مثل مشہور ہے دشمن کا دوست اپنا دشمن۔ آج میرے ساتھ یہ سلوک کیا کل خدا جلنے کا گھٹوا دیں۔

نوبت گھر میں آیا۔ پٹرے بدلے۔ بستہ بغل میں مار ٹھٹل گیا وہاں کھانا کھایا۔ پھر تعزیرات کی دفعات کو دیکھا۔ کو توفانی میں رپورٹ کی لیکن انھوں نے مقدمے کا چالان کرنے سے انکار کیا۔ اس لیے خود استغاثہ نکھا اور دس بجے عدالت ضلع میں جا کر داخل کر دیا۔ تیس نفروں اور مولوی قسطنطین صاحب کو ملزمین بنا یا استغاثہ میں نقب زنی بوقت شب حسب دفعہ ۳۵۳ ڈاکہ زبردفعہ ۳۹۵ اور سلاح مسلک کے ساتھ جوہ زبردفعہ ۳۸۸ تعزیرات ہند کے جرائم قائم کیے۔ کچھ دے دلا کر اسی روز سمن جاری کروائے۔ سرشتہ میں یہ اعتراض ہوا کہ کتوں پر سمن کی تعمیل کیوں کر کی جائے۔ ان کو فائر العقل تو کہا نہیں جاسکتا کیوں کہ میونسپل کمیٹی والے مقدمے میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ کتے فائر العقل نہیں ہیں اس لیے بالآخر بہت کچھ حجت کے بعد یہ طے پایا کہ کتوں کو نابالغ اور زیر پرورش مولوی قسطنطین صاحب قرار دے کر مولوی صاحب پر جملہ سمنوں کی تعمیل کرادی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گو اس قانونی مسئلے کے سلجھانے میں میرے کئی روپے صرف ہوئے۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ آخر میں مولوی صاحب کے جریمانے میں سے مجھے نو ہزار روپے ضرور ملیں گے۔

مولوی صاحب کو یقین نہ تھا کہ معاملہ عدالت تک کھینچے گا اس لیے سمن پہنچنے کے بعد بہت گھبرائے اور مجھ سے آکر معذرت کرنے لگے کہ میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ساری کارستانی میرے چھوڑے کی ہے۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے مجھے ایک اور ملزم کا نام معلوم ہو گیا۔ کل اس کو بھی زمرہ ملزمین میں شریک کیے دیتا ہوں۔ اب ہم معاملہ کا تصفیہ تو وہ یوں ہو سکتے ہیں کہ آپ محنت کے تمام کتوں کو مار ڈالیں۔ اور چونکہ عدالت سے آپ کے حق میں چھ سال کی قید اور دس ہزار روپے جرمانہ کی سزا صادر ہونے والی ہے اس لیے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اگر آپ نو ہزار روپے مجھے بطور ہرجانہ ادا کریں تو میں مقدمے سے دست برداری کروں گا۔ اگر آپ اس پر راضی نہیں ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کو جیل خانے جانے سے نہیں روک سکتی۔

میری یہ قانونی بحث سن کر مولوی صاحب حیران ہو گئے۔ بہت جڑ بڑ ہوئے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ میں نے کہا مولوی صاحب سنبھل کے بات کیجیے گا۔ آپ کا یہ بڑبڑانا آپ کو ایک اور جرم کا مرتکب کیے دیتا ہے۔ اگر آئندہ آپ کے ہونٹ بے تو ابھی جا کر استغاثہ میں ازار حیثیت عرفی کی دفعہ ۳۸۸ تعزیرات اور بڑھا آتا ہوں۔ اس تقریر سے مولوی صاحب کے رہے سہے جو اس

گم ہو گئے اور وہ دروازے سے نکل نوک دم بھاگ گئے۔

مجھے توقع تھی کہ شاید مولیٰ صاحب پھر مصالحت کا دروازہ کھٹکھٹائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وکیل کے بھندے میں جا پھنسے اور آپ ان لوگوں کے اصول سے واقف ہیں کہ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔

بہر حال تاریخ پبلسٹی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مار ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی میرے ہی مقدمے کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بند کھڑے ہیں۔ رسی کا سر مولیٰ قسطیر صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولیٰ صاحب مسٹر کوئی بیرسٹریٹ لا سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے کوئی صاحب سے کہا "کیا آپ ان تمام ملزمین کے وکیل ہیں؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ میں نے کہا "کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرے سے خارج کر دیا جائے؟" انھوں نے کہا "نہیں، ملزمین کے مواجہہ میں تحقیقات ہوگی۔" یہ بالکل قانون کے مطابق جواب تھا۔ لیکن چون کہ مجھے یقین تھا کہ ان ملزمین کو عن قرب جس دوام بعجور دریائے شور کی سزا ہونے والی ہے اس لیے دل پر جبر کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دس بجتے ہی ڈپٹی صاحب اجلاس پر آئے۔ کتوں کو جرم دیکھ کر مسکرائے، اور فرمایا: "اچھا ہمارے نواب صاحب کا کوئی سنگین مقدمہ ہے" میں نے نہایت ادب سے سلام کر کے عرض کی: "حضور والا خود ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس غریب پر کیا کیا ظلم توڑے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ عرض کر کے عدالت کی رائے پر اثر ڈالنا خلافتِ قانون و انصاف سمجھتا ہوں۔"

مسٹر کوئی نے کھڑے ہو کر کہا "مائی لارڈ اس مقدمے کا دار و مدار محض قانونی مباحثہ پر ہے کیوں کہ اس مقدمے کے مستغیث اور ہمارے قدیم دوست مولیٰ اسد یار خان صاحب نے نہ تو گواہوں کی کوئی فہرست استغاثہ کے ساتھ منسلک کی ہے اور نہ کوئی شہادت طلب کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی محض اپنے بیان اور قانونی مباحثہ پر اس مقدمے کا تصفیہ کرنا چاہتے ہیں اگر یہ صورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے فاضل دوست کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ پہلے مقدمے کے قانونی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تاکہ اگر یہ ثابت ہو کہ ملزمین کے افعال سے کوئی جرم نہیں بنا تو مقدمہ کو شہادت سانی لیے بغیر ختم کر دیا جائے؟"

ڈپٹی صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کی "مجھے مسٹر کوئی کی رائے سے پورا اتفاق ہے اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ اگر اپنی تمام عمر میں میرے فاضل دوست نے کبھی کوئی سمجھ کی بات کہی ہے تو آج اور اس وقت کہی ہے۔"

مسٹر کوئی: مائی لارڈ میں امید کرتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کو اس طرح میری قانونی واقعیت کی نکتہ چینی کرنے سے روک دیا جائے گا۔

میں: میں دیکھتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کا دماغ اپنی کمزوری کی طرف رفتہ رفتہ رجوع کر رہا ہے اگر وہ اپنے آپ کو میری تعریف کے لائق نہیں سمجھتے تو میں نہایت خوشی سے اپنے وہ الفاظ جو ان کی تعریف میں ہیں نے استعمال کیے تھے واپس لیتا ہوں اور اگر وہ لفظ "فاضل دوست" میں لفظ "فاضل" کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں تو میں آئندہ سے بجائے "فاضل دوست" کے بے وقوف دوست استعمال کرنے کو تیار ہوں۔

ڈپٹی صاحب: مجھے افسوس ہے کہ آپ نے عذر گناہ بدتر از گناہ کی صورت اختیار کی ہے۔ لیکن چون کہ مسٹر کوئی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مستغیث نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی بری نیت سے نہیں کہا۔ اس لیے وہ اس ریک سے درگزر کر کے اصل مقدمے کی طرف رجوع کریں گے۔

مسٹر کوئی: مائی لارڈ میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے موکلین میں سے اکثر کو نابالغ ظاہر کیا گیا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے اکثر جوان ہیں اور اکثر بال بچے والے ہیں۔

میں: جناب والایہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کتنے کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس کو میرے فاضل دوست بھی تسلیم کریں گے کہ بارہ سال والی ہستی قانوناً نابالغ سمجھی گئی ہے ایسی حالت میں میرا کتوں کو نابالغ قرار دینا کسی طرح غلط نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مستغیث دوسرے کے بلوغ یا عدم بلوغ کا پتا نہیں چلا سکتا۔ اگر مسٹر کوئی اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر اپنے بعض موکلین کو بالغ بنا کر لے رہے ہیں تو وہ ابھی ٹوٹل ٹوٹل کر باغوں اور نابالغوں کو علاحدہ علاحدہ کر دیں۔ میں استغاثہ میں صحت کر دوں گا۔ اس سے استغاثہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ وکیل صاحب کی عقل کا ضرور اندازہ ہوتا ہے

ڈپٹی صاحب: مسٹر کوئی آپ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔

مسٹر کوئی : مناسب ہے کہ استغاثہ کو بحالت موجودہ چلنے دیا جائے۔

میں : یہ دوسری سمجھ کی بات ہے جو آج مسٹر کوئی کے منہ سے نکلی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھوں نے کہا اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے اکثر موکلین کی دماغوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے جس کا وہ سابق میں اعتراف بھی کر چکے ہیں۔

مسٹر کوئی : جناب والا میں اس قسم کے ریسارک کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اشتعال طبع کی صورت پیدا ہو جائے اور عدالت کوئی دوسری کارروائی کرنے پر مجبور ہو۔

ڈپٹی صاحب : میں مستغیث کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آئندہ انھوں نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی جو تحقیق عدالت کی حد تک پہنچتی ہو تو میں حسب دفعہ ۸۸ ضابطہ فوجداری کارروائی شروع کروں گا۔

مسٹر کوئی : میرے موکلین پر تعزیرات ہند کا جو پہلا جرم قائم کیا گیا ہے وہ نقب زنی ہے۔ میری ابتدائی حجت یہ ہے کہ کتنے نقب زنی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

میں : یہ حجت بلا دلیل ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ کتنے نقب زنی انسان سے زیادہ سہولت سے کر سکتے ہیں۔

کیوں کہ ان کے سخت پنچے اور ناخن ہیں اور انسان کے نہیں ہیں۔ ابھی ان کتوں اور مسٹر کوئی کو سامنے

کی دیوار کھودنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ دیکھیں پہلے کتنے سوراخ ڈالتے ہیں یا مسٹر کوئی۔ دوسرے

یہ بحث بھی الٹی کی گئی ہے اور کیوں نہ ہو مسٹر کوئی کے دماغ سے ایسی ہی بحث کی توقع کی جا سکتی

ہے۔ استغاثہ میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ کتوں نے دیوار میں سوراخ کیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دیوار

میں مہری پہلے سے موجود تھی اور یہ انسان کی آمدورفت کے لیے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ پے خانے

کے پانی کے اخراج کے لیے تھی۔ دفعہ ۴۴۵، ضمن (۲) کے الفاظ یہ ہیں کہ کسی ایسے راستے سے داخل

ہونا جو آمدورفت کے لیے نہ بنایا گیا ہو۔ اس لیے کتوں کا مہری میں سے آنا حسب دفعہ محوہ یقیناً

نقب زنی میں داخل ہے۔

مسٹر کوئی : اس کا ثبوت ہے

میں : جناب والا اب میں ثبوت میں کچھ عرض کروں گا۔ تو پھر اعتراف کیا جائے گا۔ اگر اجازت ہو تو جواب

دوں۔

ڈپٹی صاحب : اچھا اجازت ہے۔

میں : میں کہتا ہوں کہ یہ مہری آمدورفت کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ مسٹر کوئی اس کا ثبوت طلب کرتے ہیں میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا کبھی اس مہری سے مولوی قطبیر صاحب میرے مکان میں تشریف لائے تھے یا کبھی ان کے بال بچے اس راستے سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آتا تو ماننا پڑے گا کہ یہ مہری انسان کی آمدورفت کے لیے نہیں بنائی گئی اور اگر یہ لوگ اس مہری میں سے آمدورفت رکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ لوگ انسان نہیں جانور ہیں۔

مسٹر کوئی : مائی لارڈ۔ کیا ان الفاظ سے میرے موکل کی توہین نہیں ہوتی ؟

میں : میں نے پہلے ہی حضور والا سے اجازت لے لی ہے اب اگر مسٹر کوئی ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو خود عدالت پر دائر کریں۔ میں ان کی طرف سے شہادت دینے کو تیار ہوں۔

ڈپٹی صاحب : میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مہری کتنی بڑی ہے۔

مسٹر کوئی : اس کے لیے مناسب ہے کہ معائنہ موقع کر لیا جائے۔

میں : میرے خیال میں بھی اس کی ضرورت ہے اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ یہ مہری اتنی بڑی ہے کہ کتا تو کتا، اگر جناب والا معائنہ موقع کے وقت مسٹر کوئی کی گردن پکڑ کر مہری میں ٹھونس دیں تو یہ بھی باوجود اس تن و توش کے پھنس پھنسا کر اس مہری سے پار ہو جائیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ پر مسٹر کوئی کہ بہت تاؤ آگیا۔ انھوں نے نہایت زور سے میز پر پکٹا مارا اور

کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجلاس کا رنگ ہی بدل گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مسٹر کوئی نے مکار تے وقت یہ خیال

نہیں کیا کہ میرا ہاتھ میز پر رکھ ہے۔ بجائے میز پر پٹنے کے مٹکا میرے ہاتھ پر پڑا۔ کھلا میرے

ہاتھ کی تحقیر عدالت ہوتی اور میں خاموش رہتا۔ چون کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اشتعال طبع ہو جانے

کے وجہ پیدا ہو گئے ہیں اور میں دفعہ ۳۰۰ کے مستثنیٰ چہارم میں آ گیا ہوں۔ اس لیے میں نے میز پر کی

دوات اٹھانی (خدا جھوٹ نہ بوائے کوئی تین پاؤ کی تھی) اور اٹھانے ہی مسٹر کوئی کی طرف پوری

طاقت سے پھینکی۔ وہ اس وقت سر تھکائے ہوئے کچھ کہ رہے تھے کہ دوات عین ان کی چندیا پر

پڑی۔ چند یا تھی صاف اور گلنی، وہاں سے چٹنی۔ پھسلنے کی وجہ سے اس کا رخ اجلاس کی طرف

ہو گیا اور سیدھی ڈپٹی صاحب کی کینٹی پر بیٹھی اور چشم زون میں مسٹر کوئی کا سر اور ڈپٹی صاحب کا

منہ ہم رنگ ہو گئے۔ ادھر تو اجلاس کے چہرہ اپنی اپنی کمر سے چلے کھول کر ڈپٹی صاحب کا

منہ پوچھنے کو دوڑے، ادھر مسٹر کولی نے حسرت کی تو میز کے اوپر وہاں سے کود کر مجھ پر گزرا چاٹتا
 تھے۔ مگر میں پہلے ہی سے اس حملے کے لیے تیار تھا۔ پیئز اکاٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بجائے مجھ پر
 گرنے کے کرسی پر گرے۔ اور کرسی سمیت اپنے بعض موکلین پر آپڑے۔ جو کتے دبے انھوں
 نے غل مچایا۔ ان کا ساتھ ان کے یاروں نے دیا۔ غرض ایک قیامت برپا ہو گئی۔ باہر کے لوگ
 دوڑے ہوئے آئے کہ دیکھیں اجلاس پر کیا مصیبت نازل ہوئی۔ ادھر سے یہ کتوں کا غول
 گھبر کر نکلا۔ راستے میں مڈ بھیر ہو گئی۔ دوپٹے، اشانی تو جھپٹ میں آکر چیت ہو گئے۔ بعضوں کی
 ٹانگیں کتوں نے لیں غرض (نوٹ) یہاں سے پھر صفحات غائب ہیں۔

اس کے بعد جو صفحہ شروع ہوا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نواب صاحب پر
 تحقیر عدالت کی کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری شروع کر کے ان کا جواب لیا جا رہا ہے۔ سوال
 کا جواب ابتدائی حصہ ہے وہ گم شدہ صفحہ میں ہوگا۔

لہذا

آپ وجہ ظاہر کیجیے کہ کیوں آپ کے خدشہ حسب دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری، کارروائی کر کے تجویز منسب
 نہ کی جائے۔ ۲۸ مئی ۱۹۷۰ء

شرح دستخط کلب علی خاں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔

یہ کاغذ مجھے دیا گیا۔ میں نے پڑھا۔ ذرا مسکرایا اور ڈپٹی صاحب سے عرض کی کہ کیا میں جواب زبانی دوں۔
 یا تحریری۔

ڈپٹی صاحب: تحریری۔

میں: کیا میں اپنے جواب میں صاف ظاہر کر دوں کہ جو لوگ قانون سے واقف نہیں ان کا کرسی
 عدالت پر بیٹھنا خود تحقیر عدالت ہے اور جن کا وجود خود تحقیر عدالت ہو وہ دوسرے کسی شخص
 پر تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

ڈپٹی صاحب: آپ کو زبانی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کا جو جی چاہے وہ اپنے بیان تحریری
 میں لکھ دیکھیے۔ میں نہایت اطمینان سے وہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بستر کھول کر قانونی کتابیں نکالیں

دفعات متعلقہ کو دیکھا اور حسب ذیل مسودہ تیار کیا۔

باہلاس عالی جناب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہادر

کارروائی زیر دفعہ ۴۸ ضابطہ فوجداری سرکار ذریعہ کنسٹیبل ڈپٹی کلک علی خاں صاحب مستغیث

مستغاث علیہ

نواب اسدیار خاں بہادر

بعض _____ عالی _____ می رساند

گزارش ہے کہ میرا اس کارروائی میں جواب طلب کیا جاتا ہے۔ لیکن جواب دینے سے پہلے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ عدالت نے اختیار کیا ہے وہ سراسر خلاف قانون ہے۔ تحقیق عدالت ضرور ہوتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تحقیق عدالت ہوتی۔ مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کے کمرے میں جو داخل ہوتا ہے وہ خود عدالت کا جزو ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی یا اس کے کسی سے کسی تحقیق کیا جائے تو وہ عدالت کی عین نخیب ہے اس لحاظ سے سب سے پہلے تحقیق عدالت میرے ہاتھ کی مسٹر کوئی نے کی۔ اس کے بعد میں نے نہیں بلکہ دو دنوں کے مسٹر کوئی کے سر کی تحقیق عدالت کی اور اس کے بعد مسٹر کوئی کے سر نے اس کو میں آخر میں ثابت کروں گا) ڈپٹی صاحب کی کنسٹیبل کی تحقیق عدالت کی مسٹر کوئی نے کتوں کی تحقیق عدالت اور کتوں نے تماشائیوں کی تحقیق عدالت کی۔ ایسی صورت میں تمام اجزاء کو ترک کر کے صرف کنسٹیبل کی تحقیق عدالت کے متعلق کارروائی کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ مقدمے میں تجزیہ و نوٹ و اصولاً ناجائز ہے۔

۲۔ میں نے مسٹر کوئی کو دو دن ماری اور اس کا مجھے قانوناً حق تھا۔ ملاحظہ ہو دفعہ ۴۸ مستثنیٰ چہارم جس میں محکوم ہے کہ اشتعال طبع کی صورت میں قتل عمد بھی جرم نہیں ہوتا۔

مجھے حق حاصل تھا کہ اجلاس ہی پر مسٹر کوئی کا گلا گھونٹ دیتا لیکن میں نے صرف دو دن کھینچ مارنے پر اکتفا کیا۔ یہ مسٹر کوئی کا قصور تھا کہ وہ اس وقت گردن بھکائے کھڑے تھے اور دو دن ان کے سر پر لگی آگرمیوں چند باہرتی تو اتنی بھاری دو دن سے صرف اتنا ہوتا کہ کھوپڑی ٹوٹ جاتی اور کارروائی وہیں ختم ہو جاتی۔ یہ کبھی باور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ خاص کرپ کے کارخانے کی بنی ہوئی کھوپڑی ہے یا گھر میں دباعت ہوتے ہوتے اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ اس پر سے ایسی بھاری دو دن بھی چٹخ جائے گی۔ اگر دو دن چٹخی تو وہ مسٹر کوئی کی کھوپڑی کی مضبوطی کا تصور ہے نہ کہ میرا کیوں کہ یہ سوراخ اتفاق کی صورت ہے اور

میں دفعہ ۱۰ تعزیرات کی رو سے برمی الذمہ ہوں۔

۳۔ اب یہاں امر کہ دوات نے بجائے سیدھا جانے کے اجلاس کی طرف رخ کیوں بدلا تو اس کا جواب بہت صاف ہے مسٹر کولی کے سر کی چکنائی اس تبدیلی رخ کا باعث ہوئی ان کی کھوپڑی نہ ایسی ہلکنی ہوتی اور نہ دوات اجلاس کی طرف جاتی نہ ڈپٹی کلرک علی خاں کی کنپٹی پر لگتی اور نہ کنپٹی کی تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم ہوتا۔ ان حالات میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اگر جناب والا کو اپنی کنپٹی کے متعلق تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنا ہے تو مسٹر کولی کی کھوپڑی کی چکنائی پر قائم کیا جائے۔ کیوں کہ یہی چکنائی اس تحقیر کا باعث ہوئی۔ مجھ پر مقدمہ قائم کرنا اور صرف میرا جواب لینا قانوناً صحیح نہیں ہے۔

۴۔ یہاں میں ڈپٹی صاحب کو ایک قانونی صلاح دینا مناسب سمجھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ ان کے دماغ میں ایسے نازک قانونی نکتے کا اثر نا دشوار ہے مگر بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔

اگر ہمیں کہ نابینا و چاہ است

وگر خاموش بنشینم گناہ است

میں ڈپٹی صاحب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قانوناً مسٹر کولی کی کھوپڑی یا اس کی چکنائی پر بھی مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر افعال قدرت کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ مجرم نہیں ہوتا۔ مثلاً ابھی اس مکان کی چھت میٹھ جائے اور ڈپٹی صاحب دب کر جائیں تو نہ کوئی مجرم ہو نہ اس کے متعلق کوئی مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ قدرت کا فعل ہے اور اس پر کسی کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ مجسبہ یہی حالت مسٹر کولی کی کھوپڑی کی ہے ان کی چند یا قدرت نے صاف کر دی ہے (مکن ہے کہ گھر والوں نے بھی اس صفائی میں کچھ حصہ لیا ہو) اس لیے اگر اس کی وجہ سے دوات کا رخ بدلا تو یہ صورت فعال قدرت میں داخل ہے اور مسٹر کولی جواب دہ قرار نہیں دیے جاسکتے۔ البتہ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ آج خاص اسی غرض سے مسٹر کولی سر منڈوا کر اور تیل مل کر آئے تھے تو یقیناً وہ اپنی کھوپڑی کی چکنائی کے ذمے دار ہوں گے۔

لہذا استدعا ہے کہ

کارروائی ختم اور نسل داخل دفتر کی جائے اور چون کہ اپنی درخواست کے فقرہ ۴ میں میں نے مسٹر کولی کی جانب سے وکالت کی ہے اور ان کو ایک سنگین مقدمے سے بچایا ہے اس لیے مجھے ان سے معقول مختار دلا یا جائے۔

نوٹ) مناسب ہو گا کہ عدالت مسٹر کوئی کو ہدایت کر دے کہ وہ آئینہ جب اجلاس پر آئیں تو اپنے سر پر اچھی طرح سنیڈ پیپر (ریگمال) مل کر آیا کریں تاکہ اس قسم کے واقعات کا ہمیشہ کے لیے سدباب ہو جائے۔
واجب تھا عرض کیا گیا۔

دستخط۔ نواب اسدیار خاں

ڈپٹی صاحب جواب پڑھ کر بہت گھبرائے لیکن بے حیائی تیرا ہی آسرا ہے کچھ سمجھے سمجھائے تو نہیں چارہ سطر کی ایک تجویز ٹھونک ماری کہ ملزم کا بیان دیکھا گیا۔ ہماری رائے میں جو جواب ملزم نے دیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ (نوٹ: اس کے آگے صفحات غائب ہیں)

.....

غالب بیسنی روٹی کی تعریف کریں تو کہیں میں تو یہی کہوں گا کہ لعنت ہے بیسن اور بیسنی روٹی پر میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ اس بیسنی روٹی نے مجھے کیا کیا ناک چنے چبوائے ہیں۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ زہر کھاؤں گا مگر بیسنی روٹی کے پاس نہ جاؤں گا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابراہیم ہوانٹھا کچھ پھوپھو ہار بھی پڑ رہی تھی۔ ہماری ماما جی باورچی خانے سے سکرانی ہوئی آئیں اور کہا "میاں کہو تو آج بیسنی روٹی پکالوں" میں نے کہا "اچھا پکالو۔ موسمی چیز ہے مگر خدا کے لیے کچی نہ رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ بد مضمی ہو جائے" بڑی بی بولیں "نوح میاں ایسی خال زبان منہ سے نہ نکالیے۔ دور پار۔ میں کوئی آپ کی دشمن ہوں کہ کچی روٹیاں کھلا کر دشمنوں کو بہار ڈالوں گی" یہ کہہ کر جو وہ باورچی خانے میں گھسیں تو اللہ کی بندی نے ایک بجا دیا میں کھانے والا نوبچے کا۔ انتظار کرتے کرتے بزار ہو گیا۔ لیکن روٹیاں نہ آئی تھیں نہ آئیں۔ آنتوں نے ڈیڑھ لاکھ قفل ہوا اللہ کا ختم پورا کیا۔ جب کہیں خدا خدا کر کے بڑی بی کی شکل نظر آئی۔ مجھے تاؤ تو بہت تھا مگر بیسن۔ روٹیوں کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسی پتلی پتلی اور سرخ سرخ تھیں کہ دل لوٹ گیا۔ کھانے پر جو ڈٹا تو نازمی لی بندوق جبریل! سچ ہے چنا اور غلام منہ لنگ کر نہیں چھوٹتا۔ اتنا کھایا، اتنا کھا یا کہ حلق تک آ گیا۔ جب دسترخوان صاف ہو گیا تو خدا

نوٹ: اسر ڈائری کے صفحات آرکائیو اور صاحب کے ہاتھ لگے ہوں تو براہ کرم رسالہ نمائش کو بھیج کر ہمنون

خدا کر کے اٹھا۔ پانی پیا اور ذرا لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں لگی پیاس۔ اٹھ کر پانی پیا، پھر پیا۔ لیکن پیاس
 تھی کہ کسی طرح نہ بچتی تھی۔ پیٹ پھول کر نقارہ ہو گیا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر نکل کر گیا
 دیکھتا ہوں کہ ڈپٹی سب علی صاحب کھڑے ہیں۔ یہ اکثر میرے غریب خانے پر تشریف لانے لگے تھے۔ جب
 کوئی پے چیدہ قازنی مسدہ پیش آ جاتا تو حل کرنے اکثر میرے پاس آ جاتے تھے۔ خیر ان کو ساتھ لے دیوان خانے
 میں جا بیٹھا۔ سامنے میز پر 'رسالہ نمائش' رکھا تھا وہ انہوں نے اٹھایا اور اس کے دیکھنے میں محو ہو گئے
 میرے پیٹ کی بری حالت تھی، بس پھٹنے کے قریب تھا کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ آرام کرسی پر میں نے
 بہت بہت پہلو بدئے۔ ٹانگیں کرسی کی دستیوں پر پھیلا کر سہولت راہ پیدا کی۔ ٹوند کو کچھ سہلایا۔ کچھ دبایا
 مگر باوجود اس قدر کوششوں کے ایک بھی امر باعث ندامت صادر نہ ہوا۔ اسی جدوجہد میں آنکھ لگ
 گئی کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے غدار شہر میں جا رہا ہوں۔ سڑکیں صاف اور ستھری ہیں مگر پٹی تیلی۔ مکان
 خوشنما اور خوب صورت ہیں۔ مگر نیچے نیچے۔ بازاروں میں خوب چہل پہل ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں
 مصروف ہے۔ بعض بے فکرے کوٹ تیلون پہنے سگریٹ منہ میں دبائے لکڑی بلاتے مہر گشت
 کر رہے ہیں۔ بچوں کی سچ شہر میں ایک عالی شان عمارت ہے۔ طالب علم بستے بغل میں دبائے اس میں
 چلے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی شوق ہوا۔ دل میں کہا چلو چلتے چلتے یہاں کا طریقہ تعلیم بھی دیکھ لیں۔ اندر گیا
 کیا دیکھتا ہوں کہ سیکڑوں طالب علم اکڑوں بیٹھے۔ کتابیں اگلے بچوں پر رکھے پروفیسر صاحب کا لکچر سن
 رہے ہیں۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان سب کی شکلیں انسانوں کی بہ نسبت کتوں سے زیادہ
 ملتی جلتی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی ہینٹ کڈائی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اگر کوئی جاندار ان کے ہم شباہت ہونے
 کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ صرف خارشمی لینڈ می کتاب ہے۔ ان کی مختصر ناک پر بڑے تاؤں اور سیاہ مکانیوں
 کی فینشن ایبل عینک عجب بہار دے رہی تھی۔

سیاہ کوٹ تیلون زیب تن تھا۔ پشت کی طرف تیلون کا ابھار ظاہر کر رہا تھا کہ زبردستی کسی چیز
 کو موڑ کر اندر دبا گیا ہے۔ کوٹ کے اوپر سیاہ گون اور سر پر پھندے دار چوکونی ٹوپی تھی۔ وہ
 اس وقت علم ارتقا پر لکچر دے رہے تھے۔ جس وقت میں داخل ہوا تو وہ فرما رہے تھے جو ہستی فطر
 کے اصولوں کو تبدیل کر کے اسی کو حق حاصل ہے کہ انٹرف المنوعات کا لقب اختیار کرے۔ فطرت

کا تقاضا ہے کہ ہر جاندار مار پڑنے پر چیخے چلائے اور آنسو بہائے۔ سوائے کتوں کے آپ ایک جاندار بھی ایسا نہیں بنا سکتے جو اس اصول مقررہ پر کار بند نہ ہوتا ہو۔ کتے ہی وہ قابل قدر ہستی ہیں جو اس اصول فطرت کے تابع نہیں ہیں۔ وہ مار کھانے پر چیخنے اور رونے کے بجائے واہ واہ واہ کے نعرے لگاتے ہیں اور اس طرح تعریفوں سے اپنے مارنے والے کا دل بڑھاتے ہیں۔ فطرت کا دوسرا مسلہ اصول یہ ہے کہ زمانے کی ٹھوکر یا بڑے بڑے ٹیرھوں کو یہ صا کر دیتی ہیں۔ لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ بارہ برس تک ہماری دم زمین میں دبائی گئی پھر بھی وہ ٹیرھ کی ٹیرھ ہی رہی۔

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ کتے ہی اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرنے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ بعض عاقل اور سمجھ دار انسانوں نے اپنے سے کتوں کو افضل مانا اور تسلیم کیا ہے (میاں سے کچھ حصہ غائب ہے)۔

.....

حلم کتوں کا شیوہ ہے اور منات ان کا شعار۔ کتوں کی اتنی تعریفیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے صبح کر کہا: "ابے کتے کے بچے! اپنے منہ میاں مٹھو! تم کتے تھے کتے ہو اور ہمیشہ کتے ہی رہو گے! پر دنیہ صاحب نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُن کو ایک غیر جنس نظر آیا، اپنی سامی منات بھول گئے۔ کرسی پر سے اُچک قلابچیں مارتے میری طرف لپکے۔ اُن کے اردوں کا اندازہ کر کے میں دروازے کی طرف بھاگا۔ میں آگے اور وہ پیچھے دروازہ قریب تھا میں نکل یہ جاؤ جاؤ کھڑو وہ بھی خالی ہاتھ نہ گئے۔ میرے پانچا مے کے پانچوں کے حد اتصال کا کچھ حصہ اپنے منہ میں لے گئے۔ وہ سمجھے کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ میں سمجھا، چلو جان بچی لاکھوں پائے فی الحال بنائی نشہ، نشہ گھر جا کر دوسری ڈلو الیں گے۔ (اس کے بعد کا کچھ حصہ غائب ہے)

.....

بازار میں ٹہل رہا تھا کہ چند کتے پولیس والوں کا لباس پہنے گلے میں پٹے اور زنجیریں ڈالے میری طرف آئے۔ ایک نے جو ان کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ اپنا پنجہ میری پیٹھ پر رکھا اور کہا: "کہ آپ کو قتل عمد کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے" میں نے کہا کہ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا" اس نے جواب دیا کہ اس وقت جو کچھ آپ بیان کریں گے وہ آپ کے خلاف شہادت میں استعمال کیا جاسکے گا۔" چونکہ

یہ قانونی جملہ تھا اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ایک نے اپنی گردن میں سے پیٹہ اور زنجیر کھولی۔ پیٹہ میری گردن میں ڈال دیا اور زنجیر افسر کے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے چلنے میں ذرا ہچر مچر کی تو اس کے ساتھ والوں نے بھونکنا اور متھ مارنا شروع کیا۔ خلقت کا اذدھام ہو گیا کتوں کا یہ مجمع خلاف قانون دیکھ کر میرے اوسان باختہ ہو گئے۔ بہت نے جواب دے دیا اور میں کان دبائے اُن کتوں کی پولیس کے ساتھ ہو گیا۔ پہلے یہ مجھ کو اسٹیشن ہاؤس پر لے گئے وہاں سے ایک دفتر مثلوں کا نکالا اور چار کانسٹیبلوں کو مدعیوں اور گواہوں کو بلائے بھیجا۔ دس بجتے ہی مجھ کو عدالت میں لے گئے اور ملزمین کے کٹھرے میں کھڑا کر دیا۔ اندر جا کر کیا دیکھا ہوں کہ تمام کمرہ کتوں سے بھرا ہوا ہے۔ تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری گرفتاری کی خبر نے یہ مجمع کثیر جمع کر دیا تھا۔ اجلاس پر ایک بڑا زبردست بل ڈاک بالوں دار ٹوپی (وگ) پہنے ناک کی ٹھننگ پر عینک لکھے سرخ گون زیب تن کیے بیٹھا ہے۔ سامنے ایک لمبی میز پر دونوں جانب دکلا کی قطار ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر میری آنکھوں میں ڈیڑھی کلب علی خاں کے اجلاس کا نقشہ بھر گیا۔ گو اس مجسٹریٹ کی شکل بالکل تو اُن سے ملتی نہ تھی لیکن دونوں میں شبہت ضرور تھی۔ مجسٹریٹ صاحب نے بہت غصا کر کہا..... کیا ملزم حاضر ہے؟

پیر و کار سرکار اٹھے۔ کیا کہوں عین مسٹر کوئی معلوم ہوتے تھے اگر فرق ہو گا تو بس اُنیس بیس کا ہو گا۔ انھوں نے پہلے اپنی طرف دیکھا۔ پھر اجلاس کی طرف دیکھا۔ عینک ٹھیک کی گردن کی ایک پیٹی کو اُننگلی پر پٹیا۔ گردن جھکائی۔ پھر اٹھائی پھر جھکائی اور کہا کہ

پیر و کار سرکار: جناب والا ملزم حاضر ہے اُس پر وارنٹ کی تعمیل باضابطہ طریق پر ہوئی ہے اور اس کے خلاف جس قدر چالان ہیں وہ بالکل تیار ہیں۔ مدعی بھی حاضر ہیں۔ اور گواہ بھی موجود ہیں۔
مجسٹریٹ: مسٹر ٹوٹی اس وقت کتنے مقدمات ایسے ہیں جن کی تکمیل آج کی جا سکتی ہے۔

مسٹر ٹوٹی: مائی لارڈ۔ یوں تو ملزم کے خلاف ہزار ہا مقدمات ہیں لیکن اُس نے اکثر ایسے موقعوں پر اور اس طرح ہمارے عزیز بھائیوں کو ہلاک کیا ہے کہ اُن کے متعلق کوئی گواہ ہم کو ہم دست نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی اس وقت ڈیڑھ سو مقدمات ایسے تیار ہیں جن میں مکمل شہادت پولیس کو فراہم ہو چکی ہے اور انھیں کی تحقیقات میں جناب والا کے اجلاس پر کرنا چاہتا ہوں۔

مجسٹریٹ نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ تم ان مقدمات میں خود پیروی کرو گے یا کوئی وکیل مقرر

کرنا چاہتے ہو۔“

میں : جناب والا میں اپنے مقدمات میں خود پیروی کرتا ہوں لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ میں کس کے قتل کے الزام میں ماخوذ کیا گیا ہوں اور آپ کو ان مقدمات کی سماعت کا اختیار کیسے حاصل ہوا ہے۔ اگر کسی کتے کو کتے نے مارا ہوتا تو البتہ اس مقدمے کی سماعت اس اجلاس پر ہو سکتی تھی مگر جب کسی مقدمے میں کوئی انسان ملزم قرار دیا گیا ہو تو اس کی سماعت انسانوں ہی کی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

مسٹر ٹوٹی : مائی لارڈ۔ ملزم کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ میں ملزم کی اس بحث کے باضابطہ نقول داخل عدالت کرتا ہوں۔ جو اس نے ڈپٹی کلک علی خاں صاحب کے اجلاس پر کی تھی۔ جب انہوں نے یہ حیثیت مستغیث کتوں کو ملزمین قرار دے کر انسان کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا۔ تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مقدمات جن میں کتے مستغیث اور یہ ملزم ہیں کتوں کی عدالت میں کیوں سماعت نہ کیے جائیں۔ میں : اگر اس بحث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو مجھے کو یہ عذر ہے کہ چونکہ ہلاکت انسانوں کی عدالت کے حدود اختیاری میں واقع ہوئی ہے۔ اس لیے ان مقدمات کی سماعت حسب دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری بند موجودہ اجلاس پر نہیں ہو سکتی۔

مسٹر ٹوٹی : شاید ملزم کو دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوج داری ہند کے اس جزد کا خیال ہے جس کی رو سے مقدمات قتل کی تحقیقات صرف اسی عدالت میں ہو سکتی ہے جس کی حدود میں ہلاکت واقع ہوئی ہو۔ لیکن ملزم پر یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں ضابطہ فوجداری ہند نہیں بلکہ ضابطہ فوج داری کلاب نافذ ہے اور اس کی جو دفعہ اس کا روایتی سے متعلق ہے وہ دفعہ (۱۸۱) ضمن (۱) ضابطہ فوج داری ہند کے مماثل ہے اس میں محکوم ہے کہ مقدمات قتل کی تحقیقات نہ صرف اسی عدالت میں ہو سکتی ہے جہاں ہلاکت واقع ہوئی ہو بلکہ اس عدالت میں بھی ہو سکتی ہے جہاں ملزم پایا جائے۔

میں : مگر ضابطہ فوج داری کلاب انسانوں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔

مسٹر ٹوٹی : اس کے دو جواب ہیں ایک عقلی دوسرا نقلی جس عدالت میں مقدمے کی تحقیقات کی جائے اس میں وہی قانون استعمال کیے جائیں گے جو وہاں کی مجلس وضع قوانین نے نافذ کیے ہوں۔ میں اوپر

ثابت کر آیا ہوں کہ ملزم کے خلاف جو مقدمات ہیں اُن کی تحقیقات اسی عدالت میں ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسی ملک کے نافذہ قانون اُن مقدمات کے انفصال میں استعمال ہوں گے۔ دوسری بحث کے متعلق میں ملزم کے اُن استغاثوں کی باضابطہ نقول داخل کرتا ہوں جو اُس نے اپنے ملک کی عدالت میں پیش کیے تھے۔ وہاں اس نے کٹوں پر تعزیرات ہند کے الزامات لگائے ہیں جب انسان کی عدالت میں کٹوں کی تحقیقات تعزیرات ہند کی رو سے ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کٹوں کی عدالت میں انسانوں کی تحقیقات خود کٹوں کے قوانین نافذہ کے تحت کیوں نہ کی جائے۔ مجسٹریٹ: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملزم اپنے دشمنوں کے ملک میں اپنی خوشی سے کس طرح آ گیا۔

مسٹر ٹوٹی: مائی لارڈ یہ ہمارے ملک کی پولیس کا ایک روشن کارنامہ ہے۔ ان مقدمات کے منقش کے لیے سب سے اہم اور مشکل کام ملزم کی گرفتاری تھا۔ لیکن ملزم کی ماما کی اعانت اور ہمارے وارنٹ نے جو بیسی روٹی کی شکل میں نافذ ہوا تھا اُس کو باسانی ہمارے قبضے میں پہنچا دیا۔

پیسن کر مجھے بہت تاؤ آیا اور میں نے عہد کر لیا کہ اگر بخیر و خوبی اس گھنٹے سے نجات پائی تو گھر جا کر بڑھیا کا گلا ہی گھونٹ دوں گا۔ رہی بیسی روٹی تو وہ آئندہ نہ میں خود کھاؤں گا نہ حتی المقدور دوسروں کو کھانے دوں گا۔ بس سمجھ لو کہ اس وقت تک تو صرف گھبوں سے دشمنی تھی آج سے چنے سے بھی بیر ہے۔

مجسٹریٹ: مسٹر ٹوٹی آپ اپنا سب سے مضبوط مقدمہ پیش کیجیے تاکہ ملزم پر اگر جرم ثابت قرار پائے تو اس کی تجویز موت کے ساتھ یقیناً کل مقدمات کا خود بخود خاتمہ ہو جائے۔

مسٹر ٹوٹی: مائی لارڈ۔ میں اُس قسمی مشورے کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور سب سے پہلے مووی قلمبر صاحب کے کتے کے قتل عمد کا مقدمہ شروع کرتا ہوں۔

مسٹر ٹوٹی نے مقدمے کے واقعات تفصیل سے بیان کیے اور جس طرح پتھر کے گرنے سے اس کتے کی موت واقع ہوئی تھی اس کی صراحت کرنے کے بعد کہا کہ..... مائی لارڈ میں اپنی بحث کے آخر میں ثابت کروں گا کہ قتل عمد کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ ملزم خود اپنے ہاتھ سے کسی کی ہلاکت کا باعث ہو۔ بلکہ بعض صورتوں میں ملزم کے ایسے افعال بھی جو بظاہر جرم نہ معلوم ہوتے ہوں اس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آتے ہیں۔ اس قدر بحث کے بعد اب

میں مقدمے میں شہادت پیش کرتا ہوں۔ اس مقدمے کا پہلا گواہ وہی مفتش ہے جس کی کارگزاری بالآخر اس ملزم کی گرفتاری کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ اس نے گواہوں کے کھڑے میں کھڑے ہو کر حلف لیا۔ جس کو میں سمجھ نہ سکا۔ اس لیے میں نے اعتراض کیا کہ ”حلف اس طرح اور اس طریقے سے ہونا چاہیے کہ جس سے ملزم کو اطمینان ہو جائے کہ گواہ سچ بول رہا ہے۔ مجسٹریٹ: حلف کا یہ اصول صحیح نہیں ہے چونکہ عدالت گواہ کے سچے یا جھوٹے ہونے کی تنقید کرتی ہے اس لیے حلف اسی طرح اور اس طریقے سے لیا جاتا ہے جس سے عدالت مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے، وہ قابل اعتبار ہے مفتش نے واقعات مقدمہ بیان کیے اور آخر میں میرے طریقہ گرفتاری پر روشنی ڈالی۔ اس سے معلوم ہوا کہ

میری ما، کتوں کی بڑی شوقین تھی۔ اور ایک کتے سے جو دراصل مفتش مقدمہ تھا اس کو بڑی محبت ہو گئی تھی۔ اس کتے نے رفتہ رفتہ اپنے طرز عمل سے اس بڑھیا پر ثابت کیا کہ اس کو بیسنی روٹی کا بہت شوق ہے۔ چنانچہ چند روز تک وہ بڑھیا چرا چھپا کر اس کتے کو بیسنی روٹی کھلاتی رہی۔ ایک دن اس نے مجھے بھی بیسنی روٹی کھانے پر آمادہ کیا تاکہ بچے ہوئے ٹکڑوں سے اس کتے کا کبھی کھانا نکل آئے۔ یہ وہ حال تھا جس میں مجھے پھنسا یا گیا اور میں عدم واقفیت کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

مفتش کے ابتدائی بیان کے بعد میں نے اس پر جرح کرنی چاہی تو اس پر مسٹر ٹوڈ نے کہا کہ اس عدالت میں کسی گواہ پر جرح کی اجازت نہیں دی جاتی اور نہ ہمارے قانون شہادت میں جرح کی کوئی دفعہ قائم کی گئی ہے۔

میں: لیکن قانون شہادت ہند کی رو سے کوئی بیان قابل ادخال شہادت نہیں ہو سکتا جب تک فریق ثانی کو اس پر جرح کا موقع نہ دیا گیا ہو۔

مجسٹریٹ: جرح اس لیے کی جاتی ہے کہ گواہ کی سچائی کا امتحان ہو سکے۔ جب ایک گواہ حلف لے کر کچھ ظاہر کرے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیان کو سچ کیوں نہ سمجھا جائے۔

مسٹر ٹوڈی: مائی لارڈ۔ ملزم ان لوگوں کے قانون کا حوالہ دے رہا ہے جو حلف لے کر کبھی جھوٹ بولنے میں تامل نہیں کرتے اور جو حلف کی وقعت کو نہیں سمجھتے۔ جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔

یا تو گواہ کو حلف نہ دیا جائے اور اس کی صداقت کا امتحان بذریعہ جرح کیا جائے یا اس کو حلف دیا جائے تو اس کے بیان پر بلا جرح اعتبار کرنا چاہیے۔

مجسٹریٹ: دوسرے گواہ کو بلا یا جائے۔

آواز دی گئی اور ایک سفید چادر میں لپیٹی ہوئی عورت کٹہرے میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ میری چاہتی تلی ہے۔ غضب ہے جس کو میں جان کے برابر رکھتا تھا وہی آج میرے خلاف شہادت دینے آکھڑی ہوئی۔ سچ ہے جلی کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔

گواہ نے مسٹر ٹوٹی کے سوالات کے جواب میں یہ حلف بیان کیا کہ میں ملزم کے پاس ایک عرصے سے رہتی ہوں ان کے مکان سے ملا ہوا مولوی قطمیر کا مکان ہے۔ ملزم کے مکان کے پینچانے کی مہری۔ مولوی صاحب کے مکان میں نکلتی ہے۔ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو گا کہ (آگے کے صفحات غائب ہیں جس میں گواہوں کے بیانات بحث اور فیصلے کا بڑا حصہ ہو گا کیوں کہ جو صفحہ اس کے بعد کا ہے وہ فیصلے کے جزو و آخر سے شروع ہوتا ہے) بہر حال شہادت پیش شدہ سے مہری کے عین اوپر کی منڈیر پر پتھر کا رکھنا۔ پتھر سے رستی باندھ کر اس کا دوسرا سر مہری کے سامنے کیل سے لپیٹ دینا۔ مولوی قطمیر صاحب کے کتے کا مہری میں سے نکلنے کی کوشش کرنا اس کوشش کرنے میں رستی کا اس سے ٹکرانہ۔ پتھر کا اوپر سے گر کر اس کو ہلاک کرنا پوری طرح ثابت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملزم کے ایسے افعال کا مجموعہ جو فرداً فرداً مجرم نہ ہوں اس کو قتل عمد کا مجرم قرار دے سکتا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں مسٹر ٹوٹی نے نہایت لیاقت سے بحث کی ہے اور عدالت کو ان کی حجت سے پورا اتفاق ہے اگر ملزم جاننے یا باور کرنے کی وجہ رکھتا ہو کہ اس کے افعال سے ہلاکت واقع ہونے کا احتمال ہے یا غالباً اس کا نتیجہ ہلاکت ہے یا وہ افعال حسب طبیعت معبودہ جانداران ہلاکت کے لیے کافی ہیں تو ملزم کے ایسے افعال اس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آئیں گے۔ اور جیسا کہ ہم شہادت سے بحث کرتے ہوئے ثابت قرار دے چکے ہیں کہ ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مولوی قطمیر صاحب کا کتا اس مہری سے آمدورفت رکھتا ہے تو اس کا ایسا بڑا پتھر اس طرح منڈیر پر رکھنا اور اس کا سلسلہ رستی سے اس طرح قائم کرنا کہ مہری سے آنے جانے والوں کی ذرا سی ٹھیس سے وہ گر سکے اور بلجاٹا اپنی جسامت کے ایک بڑے سے بڑے کتے کے ہلاک کرنے کو کافی ہو تو اس کے افعال اس کی بد نیتی پر دلالت کریں گے۔

اور اس کا قانونی نتیجہ یہی نکلیے گا کہ ملزم نے وہ افعال اس نیت سے کیے تھے کہ مولوی قطیر صاحب کے کتے کی ہلاکت واقع ہو۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں ملزم پر جرم ثابت قرار دیتا ہوں اور چوں کہ وراثتے مقتول خواہانِ قصاص ہیں۔

لہذا حکم ہوا کہ

ملزم کتے مار خاں کو بپاداش جرم قتل عمد ہلاک کیا جائے اور ایک درجن کتے اس کے پیچھے اس غرض سے چھوڑے جائیں کہ وہ ملزم کو اس وقت تک کاٹیں اور بھنبوڑیں کہ اس کی جان جسم سے نکل جائے۔ ملزم کی تمام جائداد ضبط کی جائے اور حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ قونچ داری وراثتے مقتول میں تقسیم کر دی جائے۔۔۔
نوٹ: فیصلے کی فوراً تعمیل کی جائے۔

دستخط مسٹر بل ڈاک ششٹی بج کٹانگر۔

میں: مگر جناب والا مجھے مرنے کا حق حاصل ہے اور ابھی اس فیصلے کا نفاذ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کا محتاج ہے۔
محسٹریٹ: یہاں مرنے کا نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کی ضرورت۔ یہ ان ممالک کا دستور ہے جہاں گواہوں کے بیانات پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ ہوتی ہے چوں کہ ہماری عدالتوں میں کوئی گواہ حلف لے کر چھوڑ نہیں بولتا اس لیے شہادت سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے اور اسی لیے یہاں کوئی عدالت مرنے قائم ہی نہیں کی گئی۔ اور نہ لوکل گورنمنٹ کو عدالتی کارروائیوں میں کوئی دخل ہے۔
رپولیس والوں کی طرف دیکھ کر) مجرم کو متقل میں لے جاؤ۔

محسٹریٹ کا حکم سنتے ہی پولیس والے کشاں کشاں مجھے ایک بڑے میدان میں لے گئے اس میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے کٹھرے تھے تمام شہر اس قتل کا نشانہ دیکھنے امنڈ پڑا تھا۔ کٹھرے کے گرد کتوں کے تھٹ کے گھٹ تھے جہاں تک نظر جاتی تھی کتے ہی کتے نظر آتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ میرے جلا دوں میں خود محسٹریٹ صاحب بھی شریک ہیں میری غیرت کو حرکت ہوئی اور میں نے ٹھان لی کہ مرنا بہ حق ہے مگر مرتے مرتے دو چار کتوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ مجھے میدان میں ان جلا دوں سے کوئی دس قدم آگے کھڑا کیا گیا۔ ایک کتا میدان میں جھنڈی لے کر آیا جب اس نے دیکھا کہ سب مستعد ہو گئے

تو ایک دفعہ ہی اُس نے جھنڈی گرائی اور میری موت اور زیست کی دوڑ شروع ہوئی۔ میں نے بھی وہ وہ چکر دیے اور وہ وہ پلیٹیاں لیں کہ بہت سے کتوں کی مکر میں توڑ دیں۔ جو کوئی قریب آیا اُس کو دو چار لاتیں رسید کیں کسی کو اٹھا کر دے پٹکا۔ کسی کو گردن دبا کر چھوڑ دیا۔ غرض یہ کہ جتنے کتے تھے وہ تھک کر بیٹھ رہے اور میدان میں صرف مجسٹریٹ صاحب اور میں رہ گئے۔ اب میری بھی بہت بڑھی اور میں نے نلکار کر کہا کہ ”حرام زادے مجسٹریٹ اب دیکھ تجھے مجسٹریٹ کا مزہ چکھانا ہوں۔ بڑا کلب علی خاں کا باوا بن کر اجلاس پر بیٹھا تھا۔ آج تھپی کا دودھ یاد نہ دلا یا ہو تو میرا نام کتے مار خاں نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے میں مجسٹریٹ کی طرف جھپٹا۔ ادھر سے وہ بڑھا۔ ادھر سے میں بڑھا۔ دونوں دست و گریباں ہو گئے۔ میں نے اس کی تھوکتھی پکڑی اُس نے میرے منہ پر پنجہ مارا میں نے اس کو نوچا اُس نے مجھ کو کاٹا میں نے اُس کو گرایا۔ اس نے مجھے دے مارا میرے کپڑوں اور اس کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دونوں لہو میں تریز تھے لیکن نہ میں اُس کی گرفت چھوڑا تھا اور نہ وہ پیچھے ہٹا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جتنا وقت گزرتا جتنا ہے میرے قوی مضمحل اور میرے ہاتھ پاؤں جواب دیتے جاتے تھے۔ اس خوں خوار کتے نے بھی میری کمزوری کو محسوس کر لیا۔ اور آخری حملے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کر کے اپنے پنجے میری گرفت سے چھڑا لیے۔ چھڑانے کے ساتھ ہی اُس نے میری گردن دبا لی۔ میرا سانس رکنے لگا میں نے بڑی شکل سے ایک چیخ ماری اور چیخ کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کیا ہوں کہ میں نیچے ہوا ہوں اور ڈپٹی کلب علی خاں صاحب میرے سینے پر سوار میرا ٹیٹا دبا رہے ہیں۔ ان کی داڑھی اور میری مونچھوں کے کچھ اجزا میں تبادلہ ملکیت ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ عالم خواب میں مجسٹریٹ کے متعلق جو الفاظ میں نے کہے تھے ان کا مخاطب ڈپٹی صاحب نے اپنے آپ کو سمجھا۔ اس کے بعد جب میں اٹھ کر جھپٹا تو وہ بھی غصہ میں آپے سے باہر ہو کر مجھ سے لپٹ گئے۔ پھر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہم دونوں کی حالت اس کا آئینہ بنتی۔ میری چیخ سے ڈپٹی صاحب کے چہرے پر اسی بھی والاں میں آگئے اور یہ تماشا دیکھ کر انگشت بندناں رہ گئے۔ ایک نے بڑھی شکل سے ڈپٹی صاحب کو مجھ سے علاحدہ کیا۔ اور وہ یہ بڑ بڑاتے ہوئے اٹھے کہ ”بازمی بازمی بارشیش بابا ہر بازمی“ میں نے کہا کہ ”ڈپٹی صاحب آپ کو یہ کیا وحشت ہو گئی بھتی کہ (یہاں سے پھر صفحے غائب ہیں)۔“

برانی اور نئی تہذیب کی ٹکڑ

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ ”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے“ جس طرح یہ صحیح ہے اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیے کہ ”ماضی ماضی ہے اور حال حال۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے۔“ لیکن خدا نخواستہ اگر ان کی ٹکڑ ہو گئی تو سمجھ لیجیے کہ بس وہی مصیبتیں پیش آئیں گی جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا مصیبتیں تھیں ان کو بھی سن لیجیے۔ واقعات از سر تا پا غلط بھی مگر پڑھنے کی حد تک ان کو سچ جانئے اور یقین کیجیے ورنہ پڑھنے میں خاک مزانہ آئے گا۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں تو بسم اللہ آگے چلیے۔

آؤ حضرت تمہیں بھی دکھلا دیں

سیر ماضی کی اس زمانے میں

سنہ انیس سو کچھ میں ہم نے تعلیم سے فراغت پائی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک ریاست میں زمام کی جگہ صفر ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ اس لیے کالج سے نکل کر سیدھا ادھر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچے تو کسی نے کہا کہ نوکری کر لو۔ کسی نے کہا ابھی تعلیم جاری رکھو۔ چونکہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہوا تھا اور وہاں کی صحبتیں پیش نظر تھیں۔ اس لیے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت

نوٹ :- یہ مضمون بالکل فرضی ہے۔ کوئی صاحب اس کو اپنے سے متعلق نہ فرمائیں۔ (منتف)

دیکھو کہ صورت بھی خود بخود پیدا ہو گئی۔

اس ریاست میں میرے ایک عزیز ایک بہت ہی بڑے عہدے پر تھے انھوں نے مجھ سے کہا "ارے میاں۔ میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ میرا ان کے ہاں بہت اثر ہے اگر کہو تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لیے کہہ دوں۔ تمھاری تعلیم مفت میں ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسوخ کے آدمی ہیں۔ واپسی کے بعد تمھیں کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے۔" دوسرے تیسرے ہی روز انھوں نے مجھے بلا کر کہا "لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے نواب صاحب سے تمھارے متعلق سب تصفیہ کر لیا ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ چند روز تم کو اپنے پاس رکھ کر تمھاری طبیعت کا اندازہ کر لیں۔ تم کو کبھی پرانی وضع کے نوابوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تم بھی اس عرصے میں ان کی نشست و برخاست کے طریقے اور ادب آداب کے سلیقے سیکھ جاؤ گے۔ چھوٹے صاحبزادے صاحب کی طبیعت کا رنگ بھی معلوم ہو جائے گا اور انشاء اللہ اس طرح تم کچھ فائدے میں ہی رہو گے۔" میں راضی ہو گیا۔ راز پایا کہ سپر کو ان کے مددگار صاحب لے جا کر مجھے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا دیں اور انارٹ بھی کرادیں۔

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجیے۔ اور مددگار صاحب کے اسم شریف پر نیکر کھینچ دیجیے۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سچی بات بڑی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ :

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگر اں!

بہر حال ڈوبے ہی سے ہم نہا دھو کپڑے بدل۔ سیاہ ٹرکس کوٹ ڈانٹ۔ دستار پہن اور جگلوں باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی۔ دستار سر پر بار ہو گئی۔ اگرچہ شملہ بمقدار علم کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو الگ ہی رہنے دو۔ اتار کر رکھ دو اور ننگے سر ہی چلے چلو۔ مگر کیا کیا جاتا۔ وہ نواب صاحب پرانی وضع کے ایسے دلدادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے

”قبر درویش بر جان درویش“ سمجھ کر اس بار کو اٹھانا ہی پڑا۔ ابھی دستار کا تصفیہ پوری طرح نہ ہوا تھا کہ بگلو س نے ستانا شروع کیا۔ پیٹی باندھنے عمر گزری تھی۔ مگر کوٹ کے نیچے پیٹی باندھتے تھے نہ کہ کوٹ کے اوپر۔ کوٹ کے اوپر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ہاتھ ہلا اور ادھر کوٹ بگلو س کے اوپر گولا بن گیا۔ دامن پکڑ کر نیچے گھسیٹا۔ برابر کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی مشکل پیش آئی اور اسی ترکیب سے پھر فح کی۔ ہم اس کش مکش میں تھے کہ مددگار صاحب اپنی دکٹوریہ میں آہی گئے۔ اور ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچے اور دستار کو درست کرتے گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھ آگئی۔ آخر خدا خدا کر کے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اتر آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم نواب صاحب کی عافی شان اور پڑکھٹ کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ تین بج چکے تھے مگر معلوم ہوا ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں۔ اس لیے دونوں کے دونوں بلیر ڈروم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد رپورٹ راجنسی کی طرح اطلاعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھورہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ منہ دھو رہے ہیں۔ چوہدار پر چوہدار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ پورہا ہے۔ اب یہ پورہا ہے۔ بیہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ خبر آنا تھی کہ مکرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ یا تو ہم ٹرڈوں ٹوں دوہی آدمی بیٹھے تھے یا سارا کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی ادھر سے آیا کوئی ادھر سے۔ کوئی اس کمرے سے نکلا۔ کوئی اس کمرے سے۔ غرض اتنے بڑے کمرے میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہی۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب ان کو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبین کا کیا حوصلہ تھا جو ان سے جھجک کر نہ ملتے البتہ مجھ کو دیکھ کر ذرا کھینچے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا ذرا اوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔ بعضوں کی پیشانی پر بل بھی آیا۔ مگر جب مددگار صاحب نے میرا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ میں کس خاندان سے ہوں تو ذرا ٹھنڈک پڑی۔ ایک صاحب کہنے لگے: ”سبحان اللہ! اس خاندان کا کیا کہنا ہے۔ آفتاب ہے آفتاب۔ ارے بھئی میر صاحب تم نہیں جانتے ان کے دادا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی مکھنوں میں کیا قدر تھی۔ واللہ عجیب آدمی تھے۔ اور بھئی زیادہ دیکھنا ان کی شکل مرزا صاحب مرحوم سے کتنی ملتی ہے۔ میں نے تو ان کو بڑھا پے میں

دیکھا ہے۔ واللہ جوانی میں میں ایسے ہی ہوں گے۔" مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ تقریباً سب کے سب مصاحبین کھنڈ کے رہنے والے تھے۔ اور سب دادا مرحوم کو جانتے اور اچھی طرح جانتے تھے۔ بہر حال یہ باتیں پورے ہی کھنڈ کے ایک چوہدری نے آکر اطلاع دی کہ سرکار برآمد ہونے والے ہیں یہ سنا تھا کہ سب کے سب اپنی دستار میں سنبھالتے۔ کپڑوں کو ٹھیک کرتے اور بگلوں باندھتے باہر نکل آئے۔ اب تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سن لیجیے۔ کوٹھی کیا ہے۔ کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکر کھاتی ہوئی سیرھیوں تک آتی ہے۔ سیرھیوں کے بعد صحن چبوترہ اور صحن چبوترے کے بعد پھر سیرھیوں ہیں۔ اور یہیں سے کئی منزلہ مردانہ مکان شروع ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں پرانا دقیقانوسی سامان بھرا ہوا ہے۔ ان کمروں کے سامنے جو برآمدہ ہے اس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لاوارث حالت مندوں کے لیے پڑی رہتی ہیں۔ ان کرسیوں سے مجھ کو بھی واسطہ پڑا ہے۔ اس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ جو بڑی سڑک چکر کھاکر محل سرا کے دروازے کو گئی ہے۔ وہ بلیر ڈروم کے سامنے سے گزرتی ہے اور یہاں اتنی چوڑی ہو گئی ہے کہ اچھا خاصا صحن نکل آیا ہے۔ بلیر ڈروم کے سامنے دوسری منزل سے نیچے آنے کا زینہ۔ اور اس کے بائیں طرف ادپر کے بڑے کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھتہ ہے۔ چھتے کے اوپر نہایت خوب صورت نیچی سی منڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے لیے مکان کا اسی قدر نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر۔ تو ہم سب یہ سن کر کہ نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں۔ کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور اس طرح لائن باندھ کر کھڑے ہوئے کہ یہ چھتہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیر ڈروم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب۔ ہر شخص کی نظر اس چھتے پر لگی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ہی چوہدری نے آواز دی "آداب بجالاؤ۔" اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے مگر میں نے جھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھتے پر کھڑے ہیں مگر بالکل اس طرح کہ گویا فوٹو اتروا رہے ہیں۔ میں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھ کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکر کر کھڑے ہوئے دکھایا ہے اُس کے نیچے لکھا ہے

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا۔

» جدھر دیکھتا ہوں ادھر میں ہی میں ہوں «

یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو ٹھکا۔ ہماری اصطلاح میں »سلام کرنا« محض ہاتھ کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ ذرا جھک کر اس فرض کو ادا کر دوں۔ ٹھکا۔ سلام کیا۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن ادھر ادھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زنازن ہاتھ چلا رہے ہیں۔ »نفل را چہ عقل« میں نے بھی غیب رکوع میں جا پٹا کے ہاتھ چلانا شروع کر دیے۔ مگر کن آنکھوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سب سیدھے ہو گئے تو میں نے سیدھے کھڑے ہو نیت کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔

مگر حضرات آپ سنتے کیوں ہیں کیا عید۔ بقر عید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہوں گے۔ مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل سے ادھر ادھر دیکھنا ہی پڑتا ہو گا کہ دوسروں کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے۔ دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں۔ یا ابھی اور کوئی تکبیر باقی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی غرض کر دیا تھا کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکڑے ہمیشہ ایسی ہی الجھنیں پیدا کرتی ہیں۔ پھر آپ کا میرے حال پر سکرانا یقیناً بے جا ہے۔

جب اس تسلیات کے ٹھکڑوں سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مسکر رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہونہ ہو یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لا حول ولا قوۃ تو کس مصیبت میں پڑا۔ چل کھل چل۔ پھر سوچا ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لطف کا بھی مزہ اٹھا لو۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا »اوہو۔ یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں؟« چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود بخود تعارف کر دیا۔ مددگار صاحب نے کہا »جی ہاں؟ نواب صاحب مسکراتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ میری تعلیم کا حال پوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے۔ غرض ان ہی باتوں میں شام ہو گئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا »ماسٹر صاحب آپ دونوں وقت آیا کیجیے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں۔ اگر یہاں نہ بھی ہوا تو جہاں ہوں گا چوبدار آپ کو پہنچا دیں گے۔« دربار ہر خاست ہوا اور سب لوگ بگلو سس

کھولتے ہوئے بلیر ڈروم میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "ماسٹر صاحب آپ نواب صاحب کو مخاطب کرنے میں ہمیشہ "آپ۔ آپ" کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا "آپ نہ کہوں تو کیا" تم کہو، اردو میں تو "آپ" ہی تعظیم کا لفظ ہے۔" کہنے لگے "ہنیں 'سرکار' کہیے۔ خداوند نعمت 'کہیے'۔" میں نے کہا "میر صاحب یہ مولیٰ موٹے لفظ تو مجھ سے ادا ہونے مشکل ہیں۔ ہاں کل سے "سرکار" کہنے کی کوشش کروں گا۔" مگر خدا معلوم زبان کو لفظ "سرکار" سے کیا چرٹھ گھٹی کہ کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ اور ہمیشہ "جناب عالی" اور "جناب والا" ہی سے کام چلا کیا۔

ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے "ماسٹر صاحب آپ کا دولت خانہ بہت دور ہے۔ صبح آجایا کیجیے۔ دوپہر کا خاصہ یہیں تناول فرمائیے۔ شام کو تشریف لے جایا کیجیے۔ ایک کمرہ میں آپ کے اٹھنے بیٹھنے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔" میں نے کہا "حضرت یہ دوسروں کے مکان میں آپ انتظام کرنے والے کون؟ اگر نواب صاحب کو میرے ٹھہرانے کا خیال ہوتا تو وہ خود ہی فرما دیتے۔ خدا میری بامیسکل کو سلامت رکھے۔ میرے لیے دور اور نزدیک سب برابر ہیں۔" وہ بے چارے شرمناک خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم نے دربار کے اوقات بھی پوچھ لیے معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے سے گیارہ بارہ بجے تک اور شام کے تین ساڑھے تین بجے سے سات آٹھ بجے تک نواب صاحب برآمد رہتے ہیں۔

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوہدار سے پوچھا کہ "نواب صاحب کس طرف برآمد ہوں گے؟" اُس نے کہا "میرے ساتھ آئیے۔" ہم ساتھ ہو گئے۔ اُس نے لے جا برآمدے کی اُن ہی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا جس کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُٹنا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوہدار ادھر سے نکلتا اُس سے پوچھنا کہ "بھئی نواب صاحب آج برآمد ہوں گے بھی یا نہیں؟" وہ یہی کہہ کر چلا جاتا کہ "آپ تشریف رکھیے ابھی یاد ہوتی ہے۔" جب ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے ٹھک جاتا تو اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھتا۔ ایک تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں۔ دوسرے اس طرح جم کر بیٹھنے کی عادت نہیں۔ تیسرے تنہائی کی کوفت بغرض کیا کہوں کر کیا حال ہوا۔ جیب سے گھڑی نکالتا۔ دیکھ لیتا۔ ادھر پاؤں بیٹھے بیٹھے سن ہو گئے۔ ادھر دستار کے بوجھ اور بگلوں کے دباؤ نے پریشان کر دیا اور ایک ایک منٹ کا ٹنا شکل ہو گیا۔ آخر

خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اس وقت ایک چوہدار نے آکر کہا "اب آپ جاییے سرکار محل میں تشریف لے گئے۔ شام کو آئیے گا تو ملاقات ہوگی۔" کیا بتاؤں کس قدر غصہ آیا لیکن جبر بڑھ کر رہ گیا۔ آخر اپنی جگہ سے اٹھا اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔ شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا مگر لوگوں کے کہنے سننے سے پھر پہنچا۔ ایک چوہدار نے لے جا پھر انھی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہوگی۔ مگر وہاں کون کس کو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بج گئے۔ اس وقت میں نے دل میں کہا۔ "حضرت اگر بوں ہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہوگی۔ چلو بغیر اطلاع ہی پہنچ جاؤ۔ راستہ تو معلوم ہے۔ ہو۔ ہو۔ نواب صاحب اسی طرف ہوں گے جدھر کل تھے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہو جائیں گے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ تم روٹھے۔ ہم چھوٹے۔" یہ سوچ کر سی سے اٹھا۔ کمرے میں سے ہو بیروں میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آرہی تھی۔ اسی آواز کی سیدھ میں چلا۔ دیکھا تو کمرے کے باہر ہی نواب صاحب اور ان کے سب مصائب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا۔ تسلیات بجالایا۔ اس مرتبہ اس پڑھے ہوئے سبق کو ذرا اچھی طرح دہرایا۔ پرانے مشاقوں کی طرح ہاتھ میں لوچ تو نہ تھا۔ بلا سے نہ ہو مگر ہاتھ کے جھٹکے ساٹ کے بجائے ان گنت دے ڈالے۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہوا تو نواب صاحب مسکرا کر کہنے لگے "اجی ماسٹر صاحب! آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھ کو تو آپ کا بڑا انتظار رہا۔" میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں تو صبح کو بھی آیا تھا۔ مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں دی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی۔ اگر میں خود بغیر اطلاع نہ چلا آتا،" یہ سن کر نواب صاحب کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگے "آپ آئے تھے، اور مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے کیا معنی۔ میں نے تو کل ہی کہہ دیا تھا کہ میں جہاں بھی ہوں آپ کی اطلاع کر دی جائے" میں نے کہا "دیکھیے وہ چوہدار صاحب جو پیچھے کھڑے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر لے جا کر بٹھایا تھا اور کہا تھا کہ "ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے" کسی دفعہ یہ بعد میں اُدھر سے گزرے کبھی مگر ہمیشہ بسر۔ پوچھنے پر یہی جواب دیا کہ "ابھی عرض کر دیتا ہوں۔" اور وہ جو ان کے برابر کھڑے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بوائے تو آٹھ دس مرتبہ ان۔ نہ ہاں مگر انہوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا،" عرض میں نے ایک ایک کو لے ڈالا۔ جتنے چوہدار تھے۔ سب نیلی پلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی چپکانہ ہوا۔ ایک چوہدار نواب صاحب کے بہت منہ چڑھے

ہوئے تھے وہ کچھ ہمت کر کے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر کہا "سرکار" مگر میں نے اُن کو آگے چلنے نہ دیا اور کہا "کیا سرکار۔ سرکار لگائی ہے۔ کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ صحت فرما رہے ہیں بس خاموش رہو۔ اس طرح باتوں میں دخل دینا تمہارا کام نہیں ہے۔" وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے "خاموش" اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ بے چارے سمجھے ہوں گے کہ کہیں یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اتر آئیں، پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر مٹنے لگے۔ سمجھے ہوں گے کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکڑ ہے۔ مگر اس روز سے چوہداروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری شکل سے گھبراتے تھے۔ میں گیا۔ اور وہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "آئیے آئیے" نواب صاحب کہیں ہوں۔ مجھے فوراً وہاں پہنچا دیتے۔ نواب صاحب کے چاہتے چوہدار صاحب تو ایسے پریشان ہو گئے تھے کہ اگر میں جاتا، اور نواب صاحب واقعی محل میں ہوتے تو مجھ سے کہتے کہ "ماسٹر صاحب! سرکار محل سے ابھی برآمد نہیں ہوئے آپ جا کر خود دیکھ لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ سمجھیں میں غلط عرض کر رہا ہوں۔"

علم مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا۔ نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اور نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے، ریشمی باگ ڈوریں ہاتھوں میں، ایک خوب صورت گھوڑے کو ملاحظہ کے لیے لائے۔ یہ گھوڑا اسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپے کو خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی۔ کچھ پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کیا اور کہا "بھئی عجیب چیز ملی ہے۔" بس اتنا سنا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ گھوڑے کا مقابلہ براق اور رت رنگ سے کر ڈالا۔ غرض دو گھنٹے تک یہی بے سرو پا گفتگو ہوتی رہی۔ شامتِ اعمال دیکھو کہ نواب صاحب کا ایک اور گھوڑا تھا اس کو یہ بہت ہی چاہتے تھے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی اور نواب صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں میرا پیارا گھوڑا اس نئے گھوڑے سے نہ دب جائے۔ تو انہوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر ہمارے گھوڑے کا نام بتانا گویا سارے راز کا افشا کرنا ہے) سے اچھا گھوڑی ہو سکتا ہے؟" یہاں تو سب سرکار کے نوکر تھے۔ بگین کے نوکر تو تھے ہی نہیں۔ فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے "خداوند نعمت! سبلا گھوڑوں کے تذکرے میں اس کو کیسے لایا جا سکتا ہے۔ وہ گھوڑا گھوڑی ہے۔ وہ تو انسان ہے انسان!"

ان کا اتنا کہنا تھا کہ یار لوگوں کو گفتگو کا سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا۔ اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ جب کہیں جا کر نواب صاحب کو تسکین ہوئی۔ اس طرف سے ذرا فراغت پائی تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ ”مرزا صاحب! آپ نے اس گھوڑے کے متعلق کچھ نہیں کہا۔“ میں نے عرض کی ”جناب عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنے کے لیے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا ایک ایک پیرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشار اللہ جب اتنے واقف کار لوگ تعریف کر رہے ہیں تو گھوڑا اچھا ہی ہوگا۔ اگر سچ پوچھیے تو میں اس تمام گفتگو میں یہ بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے۔“ نواب صاحب یہ سن کر مسکرانے لگے۔ خیر ان ہی باتوں میں کوئی آٹھ بیج گئے اور دربار برخاست ہوا۔ اب دوسرے دن شام کا ذکر سنئے کہ نواب صاحب نے حکم دیا ہمارا نیا گھوڑا لاؤ۔ سائیس اسی طرح بنا سنوار کر گھوڑے کو لائے مگر بجائے چلنے کے وہ بھدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ اور اس سرے سے اس سرے تک سارے سائیسوں اور کوچوانوں کو لے ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا۔ دوسرے نے سائیس کی لاپرواہی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر آخر کار بغلیہ آرا یہ تصفیہ ہوا کہ دوسرے گھوڑوں کے سائیسوں نے حل کر اس کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یک قلم موقوف۔ میں نے جوان غریبوں پر بلاوجہ آنت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ آگے بڑھ کر کہا ”جناب والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا گیا کہ یہ گھوڑا سنگڑا ہے۔ اگر ذرا غور سے گھوڑے کو مدح فرمایا گیا تو بالکل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا۔“ میرا یہ کہنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے سب نے بڑے بڑے دیدوں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کاٹا ہو کر کہیں پٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا برا معلوم ہوا کہنے لگے ”ماسٹر صاحب! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا۔ میں نے کہا ”جناب عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو ان سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کے بجائے میری مذمت پر اتر

آتے تو میں کہاں ان سے بچھا چھڑاتا پھرتا۔ میں سمجھا کہ گھوڑے کا لنگڑا اپن بھی کوئی تعریف ہے جو اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، نواب صاحب نے فرمایا "ان سے نہیں تو چپکے سے مجھ ہی سے کہہ دیا جوتا۔" میں نے کہا "عالی جناب کو تعریفیں سننے ہی سے کب فرصت تھی جو مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ملتا، قصہ مختصر سارا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ بے چارے سائیسوں پر آئی ہوئی بد ٹل گئی۔ جب مصاحبوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ماسٹر صاحب کے پاؤں یہاں جم گئے تو انھوں نے بھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ بلاتے پاس بٹھاتے پان کھلاتے ادھر ادھر کی غیبیں اڑتے۔ شعر و سخن کے چرچے رہتے۔ غرض کچھ دنوں اچھی گزری۔ میں اُس زمانے میں تخت اللفظ خوب پڑھتا تھا۔ سب نے صلاح دی کہ نواب صاحب کی مجلسوں میں تم بھی دو ایک مرتبہ پڑھو۔ نواب صاحب سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں رضی ہو گیا۔ چند ہی روز بعد محترم آ گیا۔ نواب صاحب کو بھی شاید کسی نے اطلاع کر دی تھی۔ انھوں نے فرمایا "ماسٹر صاحب! آپ بھی مجلسوں میں شریک ہوا کیجیے" میں نے کہا "بہت خوب" دوسرے روز شام کے چھ بجے مجلس میں شریک ہوا۔ مجلس زمانہ مکان میں ہوئی۔ اندر پردہ ہو گیا۔ محل سرائے کے دروازے میں جو عمارت ہے اس کے دالانوں میں پردے ڈال کر دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ میں مردانہ۔ دوسرے میں زنانہ۔ اندر کا حال تو معلوم نہیں۔ مگر مردانہ حصے کا کل فرش سیاہ تھا۔ چاندنیاں سیاہ۔ بگاؤ تکیے سیاہ۔ قالین سیاہ۔ ممبر سیاہ۔ یہاں تک کہ تمام گھروالوں کا سارے کا سارا لباس دستار سے لگا کر جڑے ابوں تک سیاہ۔ نواب صاحب ممبر کے سامنے قالین پر بگاؤ تکیہ لگا کر اور تمام صاحب زادے اُن کے کچھ ادھر کچھ ادھر بیٹھ گئے۔ چھوٹی صاحبزادی صاحبہ تھیں وہ نواب صاحب کے پہلو میں آ بیٹھیں اور اشارہ کے ساتھ ہی مجلس شروع ہوئی۔ پہلے سوز خوانی ہوئی۔ یہ نہ پوچھو کہ کس طرح ہوئی۔ کئی سوز خوان تھے۔ شاید ہی کسی کو چند منٹ پڑھنے کو دیے گئے ہوں ورنہ جس کو اور جہاں کہیں نواب صاحب نے چار روک دیا۔ روکنے کے لیے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا جاتا تھا کہ "بس"۔ ایک صاحب چار مصرعے پڑھنے کے بعد ٹیپ اٹھانا چاہتے تھے کہ "بس" کا اشارہ ہوا اور ان کی آواز کو پنجم سے مدھم پر آنا نصیب ہوا۔ جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تخت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لیے تو کمال کر دیا۔ ورنہ دو ہی بندوں پر بند کر دیے گئے۔ اس سلسلے کے ختم ہونے کے بعد حلقے کا ماتم شروع ہوا۔ ماتم کے بعد ہی مجلس ختم ہوئی۔ باسٹرنگل کر سب نے اصرار کیا کہ "کل آپ بھی پڑھیے" میں نے کہا "حضرت میں مجلس کا رنگ دیکھ چکا ہوں بعد ایسے

پڑھتے میں کیا لطف۔ اور سننے میں کیا مزا۔ مجھے تو معاف ہی فرمائیے۔ ”مصاحبین میں ایک میر صاحب تھے۔ بڑے بامزہ آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ ”مرزا صاحب! آج جن لوگوں نے پڑھا وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ کل میں دکھاؤں گا کہ کیوں کہ پڑھتے ہیں۔ دیکھوں تو نواب صاحب بیچ میں کیسے روک دیتے ہیں۔“ دوسرے دن جب میر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے مرثیے کو بجائے ابتدا سے پڑھنے کے وسط سے شروع کیا اور پہلی ہی بند پر میدان میں اتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت غور سے سن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں کہ ”بس“ کا اشارہ ہوا اور میر صاحب تلوار علم کیے ہوئے ممبر سے نیچے تشریف لے آئے اس کے بعد سب نے مجھ پر زور دیا کہ پڑھو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے بھی ایک آدھ دفنہ اشارہ فرمایا۔ مگر میں ٹال گیا۔ اور اس طرح سنتے سنتے ہی یہ مجلس ختم ہو گئیں۔

محرم کی تہریں یا چودھویں تاریخ تھی۔ صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ دربار جما ہوا تھا معلوم نہیں۔ کیوں ایک دفعہ ہی نواب صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ حکم دیا کہ ہمارے جواہر خانے سے چھوٹا صندوقچہ لاؤ، چوہدری صندوقچہ لے آیا۔ اوپر کار چوٹی کام سے لپا ہوا سبز نخل کا غلات۔ اندر ہاتھی دانت کا صندوقچہ۔ صندوقچہ پر گنتا گنتی جمنی جانی کا کام۔ ایسی خوب صورت چیز تھی کہ کیا کہوں، نواب صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ پہلے ایک انگوٹھی نکلا۔ اس کو دیکھا بھلا اور رکھ دیا۔ اس کے بعد سونے کی ایک جڑ اوگھڑی نکالی اس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ دیا۔ پھر ایک بچھڑے چھوٹے سبز دانوں کی تسبیح نکالی۔ اچھی طرح دیکھی بھالی۔ اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں سمجھا کہ مجھے دکھانے کو دیتے ہو۔ میں نے تسبیح لے کر خوب غور سے دیکھا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ شیشہ ہے یا زرد۔ دیکھنے کے بعد جس طرح فی تھی اسی طرح واپس کر دی اور کہا، ”جناب والا! مجھے جواہر کی پڑھ نہیں۔ مگر بے زرد ہو۔ کسی جوہری کو دکھائیے۔ وہ مجھ سے بہتر بتا سکے گا۔“ نواب صاحب نے مسکرا کر تسبیح صندوقچہ میں بند کی اور صندوقچہ واپس بھیج دیا۔ جب دربار برخاست ہوا تو لوگوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کیا کہ ”واہ! ماسٹر صاحب! خوب سمجھے۔ اتنی حضرت! تسبیح آپ کو فرما رہی تھی۔ آپ نے غضب کیا کہ واپس کر دی۔ سلام کر کے لیتے زرد گزرتے۔ بعد ایسے موقعے کہیں روز روز ملتے ہیں، ہم کو دیکھنے کے لیے بھی کوئی چیز دی جاتی ہے تو ہم سلام کر کے اپنی کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا ”حضرت! یہ لوٹ مار آپ ہی کو مبارک ہو۔ اگر نواب صاحب کا ارادہ تسبیح دینے ہی کا تھا تو زبان کس نے بند کی تھی؟“ کھد میری عمر دیکھو اور تسبیح کی سرفرازی دیکھو۔ اس بے جڑ عطا کا مطلب بغیر سمجھائے سمجھنا میرے لیے دشوار

ہی نہیں ناممکن تھا۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علی گڑھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں گھر میں کیا کیا انتظامات ہوئے اس کا علم تو اللہ کو ہے۔ ہاں باہر جو کچھ لاؤشکر جمع کیا گیا اس کا حال سن لیجیے۔ ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحبزادے محل سرائے سے باہر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا ”بادشاہ۔ نواب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو وہ چھانٹ لو۔ ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد دیں گے۔“ سب سے پہلے گاڑی گھوڑوں کا انتخاب شروع ہوا۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کیے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمت گار۔ دو پاؤں دبانے والے۔ ایک کہانی کہنے والا۔ دو باورچی۔ آٹھ سائیس۔ اس طرح خدا بھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے۔ جب نوٹ یہاں تک پہنچی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا ”جناب والا! یہ صاحبزادے صاحب پڑھنے جا رہے ہیں یا کہانیاں سنتے اور پاؤں دبانے؟ یہ گاڑیاں گھوڑے استعمال کے لیے جا رہے ہیں یا پروسیشن نکالنے؟ بھلا اس لاؤشکر کے ساتھ تعلیم کیا خاک ہوگی؟“ جن صاحب کا انتخاب اس بہیر و بنگاہ کی نگرانی کے لیے ہوا تھا وہ بگڑ کر بولے۔ ”ماسٹر صاحب۔ نواب صاحب کے صاحبزادے تعلیم کے لیے جا رہے ہیں۔ میرے یا آپ کے بچے نہیں جا رہے ہیں کہ ایک صندوق اٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے۔“ میں نے کہا ”اور ہاں جناب عالی! یہ بھی بتا دیا جائے کہ خیر میں تو صاحبزادے صاحب کا اتالیق بن کر جا رہا ہوں کیا یہ حضرت میرے اتالیق ہو کر تشریف لے جا رہے ہیں؟“ ان کے لیے تو میرا ایک ہی نغزہ کافی تھا۔ بے چارے خاموش ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ طوطی کی آواز نثار خانے میں کوئی نہیں سنتا تو میں بھی لا حول پڑھ کر خاموش ہو گیا۔

اس واقعے کو دو تین روز گزر گئے۔ ایک دن رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخواست ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لیے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی دو بجے اسٹیشن پر آجائیے۔“ میں نے عرض کی ”عالی جناب! میں نے ابھی تک چلنے کی کوئی تیاری کی ہے اور نہ میں ایسے فوری حکم کے لیے خود تیار تھا۔ آپ تشریف لے جائیے۔ میں انشاء اللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤں گا۔“ انغرض یہ تصفیہ

ہوا کہ تیسرے روز میں یہاں سے روانہ ہوں۔ اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما ہیں۔ دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ شام کو مددگار صاحب سے ملنے گیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب دو تین ہی اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے مگر صاحب زادے صاحب اور ان کا لشکر آگے چلا گیا۔ مددگار صاحب سے مل کر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔ ایک آدھ چھنیک آگئی تھی۔ ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ اس لیے واپس تشریف لے آئے۔ دوسرے دن پھر گیا تو نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحب زادے صاحب کا ہاتھ لکھا تھا کہ "کالج والوں نے تمام ملازمین اور کارٹھی گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہتا ہے تو صرف ایک انا لیتق اور ایک نوکر کے ساتھ آکر رہو ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو۔" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا "خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں بھلا یہ کیا جانیں کہ نوابوں کے رٹے کے کس طرح رہتے ہیں؟ اور کس طرح تعظیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے، گھوڑے دونوں کو ایک لاکھٹی سے ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحب زادے صاحب کو بوائے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کے دشمن بیمار پڑ جائیں؟" میں نے کہا۔ "میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ ہے نواب بن کر نہیں پڑھا جاتا۔ طالب علم بن کر پڑھا جاتا ہے۔ صاحب زادے صاحب کو اگر نواب صاحب بالکل میرے سپرد کر دیں تو میں دو ہی برس میں دکھا دوں گا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔" یہ باتیں بوری تھیں کہ دوسرا تار آیا۔ لکھا تھا "میں اکیلا نہیں رہ سکتا واپسی کی اجازت دی جائے۔" میں نے بہتہیرا سرا مارا مگر میری ایک نہ چلی اور تار دے دیا گیا کہ "فورا چلے آؤ۔" جب طالب علم ہی نہ رہا تو انا لیتق کیسا؟ میں نواب صاحب کو اس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی نہیں گیا۔ تدیس گزر گئیں۔ بھول گئے ہوں گے مگر مجھے پرانی اور نئی تہذیب کی پیکر ہمیشہ یاد رہے گا۔

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب
ہم تمہیں یاد کیا کرتے ہیں

کل کا گھوڑا

جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ نمائش

اسلام علیکم۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی نئی پودنے ملک کی سبب دی کے بے ڈکے کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ بنگلہ کی حالت اس کی کھنی ہوئی مثال ہے۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو میں بھی پنج کہیں بی تو بی ہی سہی کے مقولے پر عمل کر کے اردو کی خاطر انگریزی زب پر ڈاکر ڈاکر ہوں۔ مین ماں کی ہنیت تبدیل کرنے کے لیے بہت کچھ کتر جو نت کر دیتا ہوں تاکہ شناخت کا وجود نہ ہو۔ اگے کا نرم عائد نہ ہو سکے۔ اگر چوری کا مال خریدنے اور نکاسی کرنے کی بہت ہے تو بس اسے نامیس میں کسی جگہ دیکھے ورنہ واپس فرمائیے۔ خدا کے فضل سے دنیا میں مال مسروقہ خریدنے والوں کا توڑا نہیں۔ مال کھرا ہے میں کہیں اور دام کھرے کروں گا۔ دیکھیے ایک رزق کی بات بھی کہے دیتا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں اس مضمون کا کچھ خاکہ جون ۱۹۰۹ء کے پیرسنز میگزین سے اڑایا گیا ہے۔ لیکن اضافہ واقعات اور طرز ادا نے دونوں مضمونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہ کہے گا کہ یہ مال فناں، ل کو کلا کر بنایا گیا ہے۔ پیرسنز میگزین بھی اس کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ آپ مقابلہ کر کے اپنی عقل کا اندازہ لگا لیجیے۔ والسلام

کمترین مرزا دلشیر

موجد دنیا میں سیکڑوں ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مٹھوڑ جیسا موجد نہ کرے۔ بندہ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا جب دیکھو اپنے دارالتجربہ میں بیٹھے ہیں جب جاؤ

اس کو توڑا اُس کو جوڑ رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے آندھ آجاتی تھی۔ مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میان خیریت سے تو تو۔ ہزاروں ایجادوں سے دنیا کو مالالال کر دیا۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھے کہ دنیا ہے کیا بلا اور دنیا میں تو کیا رہا ہے۔ جنگ عظیم میں اُن کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں لیکن اُن کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جنگ کب چھڑی ہوگی جتنا کون ہارا۔ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی بساط سے بہت زیادہ ہمت دکھائی۔ پوچھنے لگے کہ یہ مسٹر بلجیم کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ بھلا بیسیوں کی صحبت سے کسی کا کیا دل بہل سکتا ہے۔

میں تو تھہرا ہوا پارٹی کی بیسیوں کے لیے مردہ کا کفن بھی اُترالوں۔ اور مسٹر مور کھڑے ایسے بے پروا کہ اپنی کسی ایجاد کی جسٹری تک نہ کروائی۔ میں نے سنی دفعہ کہا بھی تو یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامہ خلائق کے فائدے کے لیے ہے۔ کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے اور نہ ملے پیدا کرنے کے لیے ہے۔ ایک دور میں ایجاد کی تھی۔ گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھاتی تھی۔ لیکن میرے بارے میں اس کی بھی جسٹری نہ کرائی۔ نتیجہ یہ ہوا ایک کارخانے نے اپنے نام سے اس کی جسٹری کر کے لاکھوں روپیے کھرے کر لیے۔ جب میں نے مور سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانے پر ہرجہ کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ بہر حال مور کی ایجادات دریا کی لہریں کھینچنے کے بعد دیکرے پیدا ہوتی تھیں اور بغیر اُن کو فائدہ پہنچانے ان کی حد تک فنا ہو جاتی تھیں۔ گو دوسرے اُن سے پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔ اگر باپ دادا نے جامدادہ چھوڑی ہوتی تو میرے بار کھجی کے محتاج خانے پہنچا رہے گئے ہوتے۔ ان کی ذات سے سب ہی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ نہ پہنچتا تھا تو مجھ کو۔ کیوں کہ مجھے خبر تک نہ ہوتی تھی کہ اُن کو کوئی تازہ ایجاد کب مکمل ہوئی اور کب نصیب دشمنان ہو گئی۔ خود مور سے تو اس کی توقع رکھنی ہی فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے۔ اگر حال کھلتا تھا تو اخباروں سے، ور "اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گیس کھیت" کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی۔ گری میری مافی حاست اچھی ہوتی تو میں پروا بھی نہ کرتا۔ لیکن کاروبار کے مندے اور اکثر ہویا پارول کا نام دہندی نے مجھ کو گھک کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں آپ ہی انصاف کیجیے کہ اپنے سچے مگر حاجت مند دوست کے ساتھ مور کی یہ بے التفاتی قابل شکایت ہے یا نہیں۔ ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے ہاں پہنچا معلوم ہوا کہ وہ اپنے دارالتجربہ میں کچھ کام کر رہے ہیں۔ وہیں چلا گیا اُس روز اُن کی صحبت کچھ پشاش معلوم ہوتی تھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھنے لگے۔ "یہ کیا کتاب ہے" میں

نے کہا دہلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اُس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ پوچھا کہ مضمون کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یوں ہی وہی تباہی بکا ہے۔ ایک کل کا گھوڑا بنا یا ہے۔ اس پر سوار ہو کر شاہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا غرض اسی طرح کی بے تکی باتیں ہیں مجھ سے اتنا سنتے ہی مور کے چہرہ پر سرخی دور گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے: ذرا مجھ کو کل کے گھوڑے والا حصہ تو سناؤ، میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔ لیکن پڑھنے میں خلافت فطرت باتوں کے متعلق شاعر کا مذاق بھی اڑاتا گیا۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا: ”اوپے ادب خاموش! تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پر زوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا۔ تم جیسوں کے لیے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں لیکن سمجھنے والے کے لیے اس کا ہر نکتہ چراغِ ہدایت ہے۔“ یہ سن کر میں دم بخود ہو گیا۔ کیوں کہ ڈرنا تھا کہ یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکے میں میرے جسم کے ذرات بنا کر تو میں نہ اڑا دیں۔ اس لیے ماننے کے لیے مسکرا کر کہا کہ اگر تم کو یہ کتاب پسند ہے تو میں چھوڑے جاتا ہوں میرے تو کسی کام کی نہیں۔ اس سے کیا بہتر ہے کہ میرے کسی دوست کے کام آجائے۔ مور نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میرا بہت بہت شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ ”یار عزیز اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے۔ اس کو میں عملی صورت دینا چاہتا ہوں۔ بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں تو بہتر ہے۔ اچھا خدا حافظ“ اُس کی یہ اکھڑی اکھڑی باتیں سن کر بڑی کوفت ہوئی اور میں دل میں اس کو صلواتیں سناتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔ چند روز تک میرا سوچ کے پاس جانا نہ ہو سکا۔ ایک دن جو ادھر گیا تو کیا دیکھا ہوں کہ مور کے دارِ تجربہ میں ایک نہایت خوب صورت مشکی گھوڑا اکھڑا ہنہارا ہے۔ مجھے مور کے پاس گھوڑا دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کیوں کہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ۔ میں خود گھوڑوں کا بہت شوقین ہوں۔ کوئی گھوڑا دور نہیں ہوتی جس میں اپنا کام ہر جگہ کر کے نہ جاؤں۔ اس گھوڑے کو جو دیکھا تو بظاہر جاندار پایا۔ پاس جا کر تھپکا۔ سم دیکھے بھونریاں دیکھیں جوڑ دیکھے۔ غرض ہر طرح بے عیب پایا۔ اتنے میں مور بھی اپنے کسی تجربے سے فارغ ہو کر میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا ”یار من یہ گھوڑا کہاں سے مار لائے اور لا کر کہاں رکھا ہے کہ دارِ تجربہ میں کیا خون کا امتحان کر رہے ہو یا بجلی سے علاج“ مور نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور کہا ”یار جانی۔ یہ وہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ صرف دوڑتا ہے۔“

اڑ نہیں سکتا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شاعر غضب کا داغ کے آبا تھا۔ پُرزے تو میں نے بھی نکال لیے مگر ان کو بچھا نہیں سکتا۔ خیر اُتدہ دیکھا جائے گا۔" مجھے مور کی یہ گفتگو بہت بری معلوم ہوئی۔ گو یا تم کو اندھا بنا رہا ہے۔ میں اس کو برا بھلا کہتا رہا۔ مگر وہ بڑ بر ہنسا رہا۔ آخر کہنے لگا کہ کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو؟ میں نے کہہ اور نہیں تو کیا یہ مٹی کا ہے۔

مور : مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے۔

میں : تو کیا میں اندھا ہوں۔

مور : تو اس کا اندازہ تم خود کرو۔

یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دیکھا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار ادھر سے ادھر دوڑے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں پُرزے اس سر سے سے اُس سر تک بیٹھے ہوئے ہیں اور بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش مگ ہو گئے۔ جب ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ مور کیا واقعی یہ گھوڑا دوڑ سکتا ہے؟

مور : تو کیا میں نے یہ بچوں کا کھلنا بنا دیا ہے۔ میاں دوڑے گا اور خوب دوڑے گا۔

میں : اور اس کی انتہائی رفتار۔

مور : اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم (۳۰۰) میل فی گھنٹہ ہوگی۔

میں : (۳۰۰) میل!

مور : ہاں (۳۰۰) تین سو میل بلکہ کچھ زیادہ۔

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنے کا خیال آگیا اور سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا تو بس میرے دلدار پار ہو گئے۔

میں : کیوں پار اسے ڈربنی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑانے؟

مور : ڈربنی کیا بلا ہے۔

میں نے اس کو سمجھانا چاہا مگر گھوڑ دوڑ کا مطلب نہ اُس کی سمجھ میں آتا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر میں نے اس سے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ اس کی رفتار کم زیادہ ہو سکتی ہے۔"

مور : یہ بھی ایک ہی کہی۔ اگر رفتار کم زیادہ نہ ہو سکے تو پھر ایجاد ہی کیا خاک ہوئی۔
 میں : خیر یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کرو گے کیا کیا اچار ڈالو گے۔
 مور : کچھ نہیں کوئی صاحب آکر اٹھالے جائیں گے۔ پھر نہ گھوڑے کو مجھ سے کچھ کام اور نہ مجھ کو گھوڑے سے
 کچھ غرض۔

میں : تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو۔

مور : تم ہی لے جاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمہارا ہی ہے۔ تمہاری ہی کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے۔ اور
 تم ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے مور سے اس کے
 چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی۔ گھوڑے کو کمرے سے نکالا۔ سوار ہو کر گھرا آیا۔ اور تھان پر باندھ دیا۔ اس
 کے ایک دو روز بعد میں موز کے پاس گیا۔ اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھپیرا۔ لیکن میرے بار کو یہ بھی یاد نہ رہا
 کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا یا نہیں۔ چلو گئی گزری بات ہوئی۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈر بنی سے پہلے اس گھوڑے کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگکالوں تاکہ وہ
 اس کی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور ایک دفعہ ہی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونے کے متعلق کوئی ضابطہ
 کا اعتراض نہ ہو سکے۔ رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرنے کے لیے گھوڑ دوڑ کے دفتر نے اس کا نام دریا
 کیا۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی اور میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن میری تیزی طمع نے اس مشکل کو بہ آسانی رفع کر دیا۔
 پہلے میں نے اس کا نام ”آدم“ بتایا۔ ہتھم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کے لیے
 ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جب انھوں نے ضابطے کی دفعہ بتائی تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا۔ آخر
 سوچتے سوچتے ”ایجاد“ نام سمجھ میں آیا ”ضرورت“ کو ایجاد کی ماں بتایا اور ”تبرہ“ کو اس کا باپ۔ دادا پر
 دادا کا نام دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامے پر عمل کر کے شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کے بجائے ترقی ابن
 ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ترتیب تک گنوا دیا۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا اور ”ایجاد“ کے نام سے میرے گھوڑے
 کی رجسٹری ہو گئی۔

اب دوسری مشکل چابک سوار کی تھی۔ سوار ایسا ہونا چاہیے تھا جس کا نام فہرست چابک سواران
 میں بھی درج ہو۔ اور جو لفظ ضمیر اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہو۔ اور ساتھ ہی ابن اعتبار بھی
 بظاہر ہے کہ ان صفات کا انسان ملنا آسان نہیں ہے مگر مثل مشہور ہے جو نیدہ پانندہ۔ ایک اللہ کے

بندے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال ہی لیا۔ اس کا نام فہرست میں تو ضرور تھا لیکن مرد میدان نہ تھے۔ دو چار مرتبہ گھوڑ دوڑ میں شریک بھی ہوئے مگر اپنی نا اہلی سے جیتے ہوئے گھوڑوں کو ہرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کے کھانے کو رزق اور مرتے کو موت نہ ہو۔ وہ بے چارہ خمیر اور اس کے پے چیدہ مسائل کی بحث میں کیوں جانے لگا۔ قصہ مختصر اگھوں نے بلا پس و پیش نہایت خوشی سے میری ملازمت قبول کر لی۔ مجھے اُن کی تمام صفتوں میں اُن کی خاموشی سب سے زیادہ پسند آئی۔ اُن کی خاموشی کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصاویر اُن کی خاموشی پر رشک کرتی تھیں اور بت اس دیو جاس کلبی کے سامنے افلاطون اور سسرو معلوم ہوتے تھے۔

ان کا نام تو کلیمنٹس جوئیس۔ آگسٹس جو فری ڈی گبریلو تھا۔ لیکن اپنی خاموشی کو نبھانے کے لیے یہ صرف اپنا نام ”کل“ بتایا کرتے تھے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گھوڑا بھی کل کا اور چلانے والا بھی مجسم ”کل“۔ یہاں بات یہ ہے کہ یہ سب بن پڑے کا سودا ہے۔ جب تقدیر سیدھی ہو جاتی ہے تو سب مشکلیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں۔ چند ہی روز میں گھوڑا بھی مل گیا اور کوڑا بھی مل گیا۔ بارہ گئی دوڑ۔ وہ تو پہلے سے جہنمی خنائی رکھی تھی۔

غرض اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے اور آخر کار گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا لیکن اس گھوڑے نے ایسی گم نامی میں پرورش پائی تھی کہ کسی کو کانوں کان یہ بھی خبر نہ تھی کہ ”ایجاد“ کیا بلا ہے۔ کس دم کس کا ہے اور اس کے جیتنے کی توقع بھی ہے یا نہیں۔ عین گھوڑ دوڑ کے دن صبح کو موٹر کی پہلی بے وقوفی کا اظہار ہوا۔ شاید اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زمین گھوڑے کی مگر پر کسا جاتا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو رفتار بدلنے کے بن پیٹھ پر قائم نہ کرتا۔ پہلی رفتار کا تعلق لگام سے رکھا تھا لیکن بقیہ جس قدر تیز رفتار یاں تھیں اُن کے بن آگے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا دیے تھے۔ آخر سٹرکل نے اس معے کو حل کیا اور زمین بجائے پیٹھ کے ”ایجاد“ کے پٹھوں پر کس دیا گیا۔ چون کہ رکابوں کے لیے جگہ نہ تھی اس لیے ان کو سر سے اڑا ہی دیا۔ اور سٹرکل زمین پر کڑوں مبیٹھ کر مقابلے کے لیے میدان میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی سوکھی سوکھی ٹانگوں کے گھٹنے اُن کے کانوں سے اوپر نکل گئے تھے۔ مگر ڈسری ہو کر کمان بن گئی تھی۔ اور وہ گھوڑے کے ہر جھٹکے پر زمین سے مچھکے اور پھر وہیں اُبیٹھتے تھے۔ رغبت اور نفرت دیوانگی کی ابتدائی حالتوں کا نام ہے۔ طبیعت ایک

چیز کو بلاوجہ پسند کرتی ہے اور دوسری کو بلا سبب ناپسند۔ یہی حالت گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی ہے۔ بعض گھوڑوں کو محض اس وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ ان کے باپ داداؤں نے یہ کارکن اریاں دکھائی تھیں اور بعض کو اس لیے نظر سے گرا دیا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت آدم کے گھوڑے تک نہیں پہنچتا۔ میرے بے چارے گھوڑے کو اس طوفان بے تمیزی میں کون پوچھتا۔ اس کی حالت بس اس نواب بوچھاڑیارا جہ پٹاری کی تھی جو پشتمینی نوابوں اور راجاؤں کے کسی جلسے میں آگیا ہو۔ کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ گھوڑا بے یا گھوڑی۔ گدھا ہے یا خچر۔ جب یہ صورت ہو تو بھلا اس چیز کا کون اندازہ کرتے رکھا کہ واقعی یہ گھوڑا ہے بھی یا نہیں۔ البتہ مسٹر گل کے طریقہ نشست کا بڑا خاکہ اڑایا گیا مگر اس اللہ کے بندے نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ فقرے اس پر کسے جارہے ہیں یا کسی اور پر۔ شرطوں کی یہ حالت تھی کہ بعض گھوڑوں پر ایک کے دو بھی مشکل سے ملتے تھے مگر "ایجاد" پر ایک ایک کے متواتر دینے پر لوگ تیار تھے۔ میں نے بھی اپنی جمع پونجی سب اس شرط پر لگا دی۔ اور نہایت اطمینان کے ساتھ کسی پر بیٹھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔ جتنی بھی جھنڈی گری اور گھوڑے تیر کی طرح نکلے۔ مسٹر گل نے یہ بوشیاری کی کہ ایجاد کو شہرے میں نہیں کیا بلکہ اس کو نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا لایا۔ اور صرف ناک کی ٹھنک سے یہ دوڑ جیتی۔ ہزاروں کے دیوانے نکل گئے اور میں نے صرف ایک دوڑ میں دس لاکھ روپے سمیٹ لیے۔ اس میں سے ایک لاکھ روپے تو مسٹر گل کے حصے میں آئے اور بقیہ نے میری حالت قابل رشک بنا دی۔ تمام دنیا میں اس دوڑ کا چرچا ہو گیا۔ تین اخباروں کے مضامین کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں۔ اس سے لوگوں کے خیالات کا اندازہ لگ سکے گا۔

”اخبار گھوڑ دوڑ“

لکھتا ہے: ”ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو گھوڑا گذشتہ دوڑ میں جیتا ہے وہ سلطان روم کی خاص سواری کا تھا اور محض اس کی قوت اور کس کا اندازہ کرنے کے لیے تبدیل نام کے ساتھ اس کو اس دوڑ میں شریک کیا گیا تھا۔ ہم نے اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر کے یہ بھی دریا کر لیا ہے کہ اس گھوڑے کی نسل کو پوشیدہ رکھنے میں انتہائی کوشش کی جاتی ہے اور بچہ پیدا ہونے کی بعد ہی ماں اور باپ دونوں کو مار دیا جاتا ہے تاکہ نسل زیادہ نہ بڑھے۔ یہ اب تک پتہ چلا کہ ان گھوڑوں کا جنگل صحرائے عرب

کے کس حصے میں واقع ہے۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو چکا ہے کہ جتنے سائینس اور سوار اس جنگل میں ہیں ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں اور زبانیں کاٹ لی گئی ہیں تاکہ کسی کو اس جنگل کی جائے وقوع معلوم نہ ہو سکے۔ آئندہ جو مزید نا ظاہر ہوں گے وہ ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پیش کیے جائیں گے۔

اقتباس از اخبار سنج

محققین زبان کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو گئی کہ دو دم پرندہ باندھنے اور دم دبا کر بھاگنے کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک نئے گھوڑے "ایجاد" نامی نے ظاہر کر دیا۔ ان دونوں محاوروں کا مفہوم ہمیشہ "بے تحاشا بھاگنا" یا جانا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دو دم پرندہ باندھنے یا دم دبانے سے رفتار میں تیزی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اس گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" کے زین کا مندرہ یعنی عرق گیر بجائے کر پر رکھنے کے اس کے پھٹوں پر رکھا گیا اور واقعی اس طرح اس کی دو دم پرندہ بھی گیا۔ اور دم دب بھی گئی۔ اس گھوڑے کا ایسی بڑی دوڑ جیتا اس کی تیز رفتاری کو ہمیں ثبوت ہے ہم اس گھوڑے کے ماتک کو ان کی کامیابی پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور نغاثات کے اہل فن کی جانب سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ ان کے گھوڑے کی بدولت یہ آسانی دو پے جدید محاوروں کی تشریح ہو گئی۔

مقالہ افتتاحی "اخبار سائینس"

روح اور قدامت پسندی ہمیشہ سے مانع ترقی رہے ہیں لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گذرا جو گھوڑوں پر زین کسے کے پرانے طریقے کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے اور پرانے کتبوں، تصویروں اور مجسموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی پتا چلتا ہے کہ زین یا پاچامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائینس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا جائے تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہو گا۔ گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے پچھلے پٹھے بوجھ سہارنے کے لیے بنائے گئے ہیں نہ کہ اگلے مانگیں۔ اگر فطرت کا یہ تقاضا ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قائم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی ہے تاکہ بوجھ ان چاروں حصوں پر برابر تقسیم ہو جائے۔ لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو

اور اگلے پاؤں رفتار کے لیے چھوڑ دو۔

خود چو پاؤں کے بھاگنے کے طریقے پر اگر سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ جانور کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکیں گی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ برعکس اس کے اگر دو آگے کی طرف اور دو پیچھے کی جانب مائل ہوں گی تو اس کو تیز چلنے میں دشواری ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجیے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں دھڑوڑ آگے کو جھک آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے لنگے پر بجائے آگے جھکنے کے پیچھے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصے سے ہمارے زیر غور تھا لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے اگر گزشتہ گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا۔ کیوں کہ ایسے قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عمل تجربہ دیکھنے کے بعد کھلیں گی اور آئندہ گھوڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلے میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھیں گے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پٹھوں پر زمین کسے ہوں گے۔"

غرض خدا خدا کر کے ایک ہی گھوڑ دوڑ میں میری ماںی حالت درست ہو گئی لیکن اب مصیبت یہ آپڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گم نامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا کہ کھانا اپنی اگلتا ہوتا ہوا گھوڑا ہے۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا مگر میری جدت طبع نے اس کو بھی آسان کر دیا۔ ایک اسی کے قدر و قامت رنگ و رنگ و شمع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا۔ اصلی گھوڑے کو نشان پر باندھ دیا۔ اور نقلی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ بڑے بڑے ماہرانِ فن آئے اور گھوڑے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ اس میں تو کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھوڑ دوڑ اس کو جیتوا سکے۔ نہ تو جوڑی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سبک ہے پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہو گئی تو کہاں سے پیدا ہو گئی۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ ہر شخص اپنی اپنی بانگتا تھا مگر اس عقدے کو کوئی نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میں اور سٹرکل گھوڑے کو نئے کمرے میں وقت پر میدان میں پہنچے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب داں تقسیم وزن کا لحاظ کر کے ناپ ناپ کر ان کے پٹھوں پر زمین بندھوڑے ہیں۔ غرض یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ اور گھنٹہ بجتے ہی سب گھوڑے دوڑ کے لیے ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ ادھر جھنڈی گری اور ادھر سواروں

نے گھوڑوں کے چابک رسید کیے۔ چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہو گئی۔ مارے دو لائقوں اور پشتکوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ملا دیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض مہت والے تھے وہ جھٹکے جھیلنے رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں تماشا یوں کے سروں اور کندھوں پر گھٹڑیوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک "ایجاد" تھا کہ وہ اول آخر سب ہی کچھ رہا۔ چونکہ اس دور میں لوگوں نے ذرا سمجھ بوجھ کر روپیہ لگایا تھا۔ اس لیے مہری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ ہوئی۔ پھر بھی ستر اسی ہزار روپے میں نے بنا ہی لیے۔

اس واقعے کے متعلق اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا اقتباس ناظرین کی ضیافت طمع کے لیے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

”اخبار گھوڑ دور“

ہم کو سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ علاقہ نجد کے کسی نامعلوم مقام پر دو ہوائی جہازوں پر گولیاں برسائی گئیں جس کی وجہ سے وہ نیچے اترنے پر مجبور ہوئے۔ دونوں جہازوں پر جتنے لوگ سوار تھے ان سب کو نہایت بیدردی سے ذبح کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسی مقام کے آس پاس کہیں سلطان روم کے خلعے کے گھوڑوں کا جنگل ہے۔ ورنہ بلا وجہ جہازوں پر گولیاں چلانے اور ان کی سواروں کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی! امید ہے کہ گورنمنٹ اس اہم معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے کر صدیوں کے راز کا انکشاف کرے گی۔“

تاریخ میں ایک نہایت مختصر مضمون تھا۔ لکھا تھا کہ ”اس مرتبہ گھوڑوں کی دُموں پر نمدہ باندھا گیا تھا مگر بد قسمتی سے دور کے وقت بہت سے سواروں کے چوڑوں پر نمدہ باندھا گیا اور اکثر سواروں میں تیزی آگئی کہ وہ اپنے زور میں اچھل اچھل کر گھوڑوں کی گردنوں سے آگے نکل گئے۔“

اخبار سائنس کا مضمون بہت علما نہ تھا۔ اس نے روح پر بحث کر کے لکھا تھا کہ ”ماہران فن علم حیوانات اس وقت قائل نہ تھے کہ انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی قسم کی روح ہوتی ہے اور اسی لیے حیوانوں میں بھی رواج اور قدمت پسندی اسی طرح جاری اور ساری ہے جس طرح انسانوں میں ہے۔ اس مسئلے کا تصفیہ گذشتہ گھوڑ دور نے نہایت اطمینان بخش طریقے پر کر دیا اور اب کسی کو اس کے خلاف زبان لانے کی گنجائش نہیں رہی۔ رواج قدیم کے خلاف مگر اصول سائنس کے موافق اس گھوڑ دور میں زمین بجائے پیچھے پر رکھنے کے گھوڑوں کے سچوں پر کسا گیا تھا۔ گو اس طریق عمل سے ان جانوروں کو زیادہ آسائش و

سہولت تھی لیکن روح قدیم کے خلاف ہرنے کی وجہ سے انھوں نے بطور احتجاج دو لتیاں جھاڑنا اور پشتکین مارنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان گھوڑوں کی بے وقوفی کے باعث پھر "ایجاد" نامی گھوڑا جو اصول سائنس کو سمجھتا اور اپنی آسائش کا احساس رکھتا تھا، بازی لے گیا۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب یہ جانور بھی اپنی ضد سے باز آئیں گے اور اپنی قدرت پسندی کو اسی طرح ترک کر دیں گے جس طرح گزشتہ گھوڑ دوڑ کے بعد سے انسانوں نے ترک کر دیا ہے۔

اب ڈربی کا نازک زمانہ قریب آ گیا اور "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت چڑھنا شروع ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ روپیے پر ایک آنہ بھی کوئی دینے پر تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک دوسرے خلیجان میں پڑ گیا جو لوگ گھوڑ دوڑ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک گھوڑے کے نکل جانے سے شرطوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بعض بے ایمان لوگ ایسے نکل آتے ہیں جو گھوڑوں کو زبردستی دینے یا اصطبل کو بم سے اڑا دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ باوجود میری حفاظتی تدابیر کے ایک روز رات کے بارہ بجے میرا اصطبل مع اصلی گھوڑے کے بم سے اڑا دیا گیا۔ اور بچارے نا کردہ گناہ کے پتھر سے اور کھال کے ٹکڑے کسی کسی میل کے فاصلے پر پائے گئے۔ لیکن شکر ہے کہ میرا "ایجاد" اس حملے سے محفوظ رہا۔ دوسرے دن ہی صبح کو اس واقعے کا حال اخباروں میں بڑے بڑے موٹے موٹے حرفوں میں چھپ گیا اور چھپنے کے ساتھ ہی "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت گر گئی۔ میرے لیے یہ خدا شرفے برانگیز وہ خیرے مادر آن باشد" کا مصداق ہو گیا۔ اور میں نے دل کھول کر ٹکٹ خریدنا شروع کیے۔ ہزاروں مار تعزیت کے آئے۔ مگر میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ میں مرے ہوئے گھوڑے کے ٹکٹ کیوں خرید رہا ہوں۔ لوگوں میں بہت کچھ چرمی گوٹیاں ہوئیں اور آخر انھوں نے پتا چلا لیا کہ "ایجاد" میرے سونے کے کمرے میں صحیح سلامت موجود ہے۔

ڈربی سے ایک دن پہلے میں اور مسٹر کل اپنے کمرے میں کھڑے گھوڑے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ سامنے کی کھڑکی میں سے پستول چلا اور گولی "ایجاد" کے پہلو میں لگ کر آ رہے پار ہو گئی۔ میں کھڑکی سے کود کر اس شخص کے پیچھے گیا لیکن وہ باتھ نہ آیا۔ پولیس میں اطلاع دینا گویا اپنا راز کھول کر خود کو تباہ کر لینا تھا۔ اس لیے خاموشی اختیار کی۔ واپس آ کر میں نے اور مسٹر کل نے "ایجاد" کے پرزوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ لیکن کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اور ہم نے "رہبرہ بود بلائے" کے بخیر گذشتہ "کا ورد کر کے ساری رات

آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں "ایجاد" کے مالک کی حیثیت سے تو تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ "ایجاد" پر سوار ہو کر اور خود ڈربا جیت کر اپنی شہرت کو چار چاند لگاؤں۔ اس لیے میدان نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرتبہ تو میں ہی اس پر سوار ہوں گا۔ مگر کل نے منع بھی کیا لیکن میں نے ایک نہانی اور صبح ہی سے تیاری شروع کر دی۔

ڈربا کے میدان میں پہنچا تو دل ہیبت سے کانپ گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے خود بادشاہ سدمت بھی مع خاندان شاہی کے رونق افروز تھے۔ تمام گھوڑے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گزرے گئے۔ جب "ایجاد" میدان میں آیا تو تالیوں کی آواز سے آسمان گونج گیا۔ میں نے بھی خراباں خراباں گھوڑے کو میدان کا چکر دیا اور سب گھوڑوں میں ملا کر کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بجا۔ جھنڈی گرمی اور سب گھوڑے آدھی کی طرح رواں ہوئے مگر "ایجاد" نے بے تحاشا بدکنا شروع کیا۔ ایک تو غصہ دوسرے شرمندگی۔ میں نے آؤ دیکھا تاؤ پورے زور سے تیز رفتاری کا ہن دبا دیا۔ جس وقت ہن دبا تو اس کے منہ کی بجائے اس کی پیٹھ میدان کی طرف نکلی۔ میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ "ایجاد" نے پوری رفتار کے ساتھ اٹھے پاؤں بھاگنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کی گولی نے لگام والی رفتار کے پڑھ کو تو کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا مگر تیز رفتاری کے پڑھوں کے عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو روکنا چاہا تو پسینے چھوٹ گئے۔ کیوں کہ میرے زور سے ہن دبانے کی وجہ سے ہن دب کر ٹوٹ گیا تھا۔ اب کیا تھا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے گھوڑوں کو جانیا اور ان واحد میں ان سے آگے نکل گیا۔ گو یہ گھوڑے آگے بڑھ رہے تھے مگر میرے آگے رفتار کے باعث پیچھے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور گو میں پیچھے ہٹ رہا تھا لیکن دراصل ان سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ لوگوں کے قبضوں اور تالیوں نے صور اسرافیل کی صورت پیدا کر لی۔ اور بعض سواروں کو منہسی کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو زکنا پڑا۔ واقعے کے بیان کرنے میں عرصہ لگا ہے لیکن خود یہ واقعہ شروع ہوا اور آٹا فانا میں ختم ہو گیا اور ڈربا کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ جیتنے میں کسی گھوڑے کا حساب سر کی نبان سے لگانے کی بجائے دم کی نبان سے لگانا پڑا ہو۔

اب شکل یہ آپری تھی کہ گھوڑا نہ اب رکتا ہے نہ جب میدان کو عبور کر کے باڑھ کو توڑتا ہوا تماشا بنو۔ یہ گھمسن گیا۔ جدھر نکل گیا کائی سی بھٹ گئی۔ بھیر بھٹ گئی اور میدان صاف ہو گیا۔ اب میں کیوں تو کیا کروں، رفتار ایسی تیز تھی کہ کودنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ در ایک خالی موٹر کھڑی ہے۔

جب گھوڑا اُس کے پاس سے نکلا۔ میں اللہ کا نام لے دھم سے موڑ میں کود پڑا۔ اب رہے میاں ایجاو تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ البتہ دوسرے روز کے اخبار میں ہوائی خبر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا اٹا تیرتا ہوا افریقہ کے جنوبی کنارے پر دیکھا گیا۔ اخبار گھوڑ دوڑ کا خیال ہے کہ فطرت اس کو اپنے مسکن کی طرف لے جا رہی ہے لیکن پنج کی رائے ہے کہ جب تک اس کی دم پر نمدہ بندھا رہے گا اُس کی رفتار کم نہ ہوگی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں میں کون سچا ہے۔ میرے چوٹ تو آئی مگر سمجھا چلو جان بچی نولا کموں پائے، شکر ہے ہو گیا تو کیا ہرج بے دربی تو جیت لی۔ بدھیامری تو مری اگر ڈو دیکو بیما۔

اڈیٹر صاحب کا کمرہ

(۱)

اڈیٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے میز لگی ہے۔ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی بیڑی ہے دوسرے میں دیاسلانی کی ڈبیہ۔ میز کے دوسری طرف مددگار صاحب سر جھکانے کچھ لکھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ڈاک آئی ہے۔ اڈیٹر صاحب ایک خط اٹھاتے ہیں۔ پڑھتے ہیں اور رکھ دیتے ہیں۔ دوسرا اٹھاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور پھینک دیتے ہیں۔ بڑے زوردار آدمی ہیں۔ گورنمنٹ ان کی بڑی قدر کرتی ہے۔ لاٹ صاحب کرسی دیتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہاتھ ملاتے ہیں۔ یہ بھی کسی بھلے مانس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کسی سے یہ سب منہ بات نہیں کرتے۔ ان سے نامہ نگار اور یہ نامہ نگاروں سے سخت بیزار ہیں۔ سرکار کی امداد ہے جو ان کا اخبار چل رہا ہے۔ ورنہ کبھی کا بند ہو گیا ہوتا۔ سچ ہے گورنمنٹ کی کمائی عہدے داروں اور اخباروں نے کھائی۔

(۲)

اڈیٹر صاحب: مددگار صاحب۔ آپ نے آج کی ڈاک دیکھی۔

مددگار صاحب: جی نہیں۔ آپ ہی تو کھول رہے ہیں۔

اڈیٹر: میں تو اخبار اور رسالہ نکال کر جنجال میں پڑ گیا۔ ان نامہ نگاروں نے ناک میں دم

سے اس مضمون کا اگر لطف اٹھانا ہے تو اس کے پہلے اور تیسرے حصے کو اسی لہجے میں پڑھیے جس لہجے میں پہلی جماعت کا طالب علم اردو کی پہلی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ ہر لفظ کو کھینچتے ہیں اور ہر فقرے پر تان توڑتے ہیں۔ (مصنف)

کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہی بل پر اخبار چلتا ہے۔ قسم خدا کی۔ اگر ان کے مضمون بغیر ترمیم کیے جیسے کے ویسے چھاپ دوں۔ تو آج ان سب کی تلعی کھل جاتی ہے۔ جو صاحب ہیں یہی لکھتے ہیں کہ مضمون لکھنے کی فرصت نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مضمون لکھنے میں ایسی کون سی دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ کوئی سمجھ کی بات لکھنی ہو تو واقعی دماغ پر زور ڈالنا پڑے۔ یہاں تو میاں کام کو نہیں پوچھتے نام کو پوچھتے ہیں۔ یہ تھوڑی دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ کس نے لکھا ہے۔ اب یہ دیکھیے شوکت تھانوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ ”حامن“۔ خدا معلوم یہ جان من لکھا ہے یا جناب من۔ ہاں تو لکھتے ہیں ”تسلیم۔ مجھ پر“ سر پینچ ”کا بار اتنا پڑ گیا ہے کہ دوسرے کسی رسالے یا اخبار میں مضمون لکھنا میرے لیے دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ اگر آپ ہی میری مدد فرمائیں تو باعث ممنونیت ہوگا۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔“ دیکھی آپ نے ان کی چال۔ دو پیسے کا کارڈ لکھا۔ اور دو کام نکال لیے۔ ایک تو مضمون لکھنے سے انکار کر گئے۔ دوسرے خود مجھ سے مضمون لکھنے کا تقاضا کر بیٹھے۔ خیر کسی مضمون بھیج چکے ہیں۔ ان کی خواہش بھی پوری کر دو۔ احسان الرحمن مرحوم کا جو مضمون پچھلے مہینے آیا تھا۔ دوسرے نام سے بھیج دو۔ مددگار: ممکن ہے کہ احسان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار بھانڈا پھوڑ دے۔

اڈیٹر: مہربانی کر کے آپ مجھے مشورہ دینے کی تکلیف نہ اٹھایا کیجیے۔ میں نے آپ کو اپنا مددگار مقرر کیا ہے نہ کہ انا مینق۔ افسوس ہے کہ آپ اتنے دن سے یہاں کام کر رہے ہیں اور ابھی تک اسی طرح کورے کے کورے ہیں۔ احسان کے بھائی بندرو نے پتھن میں گئے ہیں یا اخبار پڑھنے میں۔ تھوڑے دنوں میں پرچہ پرانا ہو جائے گا۔ پھر خدا نخواستہ اس کو پڑھنا ہی کون ہے۔ لانا یہ سامنے والا خط دینا۔ اوہ آپ ہیں۔ خدا کسی کو ایسا بھیک منگنا نہ کرے۔ مضمون لکھتے ہیں تو ہم پر ایسا کون سا احسان کرتے ہیں۔ اجی احسان ہمارا ہے کہ ان کا مضمون چھاپ بھی دیتے ہیں۔ ورنہ کسی اور کو ایسا مضمون بھیجیں تو اٹا منہ پر مارے ازران حضرت کی یہ حالت ہے کہ مضمون بھیجا اور ساتھ ہی ہاتھ پھیلا دیا کہ لاؤ کچھ دلاؤ۔ اجی مددگار صاحب آج کوئی منی آرڈر آیا ہے۔

مددگار: جی ہاں سواچھ روپیے کا ایک سنی آرڈر آیا ہے۔

اڈیٹر: اچھا تو، سوادو روپیے ان کو بھیج دو اور باقی چار روپیے کاغذ لانے کے حساب میں دے دو۔ دہن سنگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔

مددگار: پطرس صاحب کا خط آیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میری کتاب کا اشتہار اخبار میں چھاپ دیجیے۔ روپیہ نہیں بھیجا۔ شاید مفت چھپوانا چاہتے ہیں۔

اڈیٹر: اخبار سب بھر گیا یا کچھ حصہ باقی ہے۔

مددگار: ابھی تو چار صفحے خالی ہیں۔

اڈیٹر: تو ان کی کتاب کا اشتہار جلی قلم سے پورے ایک صفحے میں چھاپ دو اور لکھ دو کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل کر دی گئی۔ مگر آپ نے بہت تنگ وقت میں اشتہار چھاپنے بھیجا ہے۔ پورا ایک مضمون حذف کر کے اس اشتہار کے لیے جگہ نکالی ہے۔ آپ نے عرصے سے ہم کو کوئی مضمون سرفراز نہیں فرمایا۔ لوگ بے حد مشتاق ہیں۔ امید ہے کہ اس پرچے کو بھی کچھ عنایت کر کے مضمون فرمائیے گا۔ اور ہاں تکمیل کاظمی صاحب کو ابھی لکھ دو کہ بعض اصحاب نے ”نیاز مندان لاہور“ بن کر آپ کی ذات پر جو حملہ کیا ہے اس کا جواب ابھی تک آپ نے نہیں دیا۔ براہ کرم اس بارے میں خاموشی اختیار نہ کیجیے۔ آپ اردو ادب کی روح رواں ہیں۔ آپ کا اس طرح چپ ہو جانا اچھا نہیں، آج یہ لکھا گیا ہے کل اس سے زیادہ لکھا جائے گا۔ آپ بھی لکھیے، اور ضرور لکھیے۔

مددگار: مگر یہ تو لڑائی ہو جانے کی بات ہے۔

اڈیٹر: اور میرا مقصد مددگار سوائے اس کے کیا ہے۔ یہی لڑائیاں تو اخبار اور رسالوں کی جان ہوتی ہیں۔ مجرم علی ہشتی کیوں بڑھے۔ مولوی نذیر احمد سے لڑ کر۔ مرزا حیرت نے کیوں نام پایا۔ مولانا حالی سے ٹکرا کر۔ میاں تم ان باتوں کو کیا جانو۔ جب تک دو ایک بڑے آدمیوں میں جوتی پینزارد نہ ہو جائے۔ اخبار چلتا تھوڑی ہے۔ ہمت کیے کسی بڑے آدمی کا خاکہ اڑانا شروع کرو۔ پھر دیکھو تمہارا اخبار کیا نازن بکتا ہے۔

اور کس شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اور جو کہیں تم گالیوں پر اتر آئے تو مزاحی مزاح ہے۔ اگر ہزاروں کی اشاعت نہ ہو جائے تو میرا ذمہ۔ اور ہاں یہ تو بتانا وہ جو دھ پور والے چغتائی صاحب کا بھی کوئی خط آیا نہیں۔

مددگار: جی نہیں۔

ادیٹر: واللہ۔ یہ بھی عجیب آدمی ہے۔ ابھی آپ کو پیدا ہو کر ہی کتنے دن ہوئے ہیں جو اتنی

میشخت آگئی ہے۔ سمجھتے ہوں گے کہ میں بھی کچھ لکھنے لگا ہوں۔ خیر۔ بنے دو۔ ان کی

کتاب روحِ ظرافت پر وہ ریویو لکھوں گا کہ میاں یاد ہی کریں گے۔ ہر نے بھلے آدمی

کے مضمون چھاپ چھاپ کر اور تعریفیں کر کے یہاں تک پہنچایا۔ اور ہماری بیٹی اور میں

سے میاؤں کرنے لگی۔ خدا کی قدرت ہے جو دھ پور کو دیکھو اور اردو زبان کر دیکھو۔

ایک حرف تو صحیح لکھتے نہیں اور اس پر زبان دانی کا یہ دعوا ہے کہ معاذ اللہ۔ دیکھنا

کل ان کی کتاب اور اردو کی دو تین لغات صبح ہی صبح مجھ کو دے دینا۔ ایک مضمون لکھ کر ان

کو ٹھنڈا کیے دیتا ہوں۔ سمجھتے ہوں گے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے دیباچے میں جو تشریح

کی ہے تو گویا لفٹنٹ گورنر کا سارٹیفکٹ مل گیا۔ اور ہاں بھئی مرزا صاحب نے بھی

خطوں کا کوئی جواب دیا یا نہیں۔ قسم خدا کی کیا ناروق آدمی ہے۔ اکتھے چار پوسٹ کارڈ

روانہ کر چکا ہوں اور میرے یار نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ سب سے زیادہ

اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ واللہ اگر سارے ادیٹر اس کے پیچھے پڑ جائیں

تو تھوڑے ہی دنوں میں دماغ درست ہو جاتا ہے۔ پرچے بھجوا تو چپکے سے رکھ لیتے

ہیں۔ مضمون مانگو تو جواب تک نہیں دیتے۔ لیجیے یہ ہمارے مضمون نگاروں کی تہذیب

ہے۔ ارے بھئی مددگار صاحب دیکھنا۔ ان کے مضامین کے دونوں حصے چھپ کر

ریویو کے لیے آئی ہیں ذرا سوچ سمجھ کر ریویو کرنا۔ اس شخص سے ابھی بگاڑنا اچھا نہیں

ہاں جب تنگ آمد جنگ آمد کی نوبت آئے گی اس وقت دیکھا جائے گا۔ آج ایک

خط اور لکھ دو۔ اور تھوڑی بہت خوشامد بھی کر دو۔ شاید کوئی مضمون بھیج دیں

جواب کے لیے ٹکٹ خط میں نہ رکھنا۔ وہ بندہ خدا ٹکٹ تک ہضم کر جائے گا۔ مگر

ہاں ان کے مضمونوں کی غلطیاں جمع کرتے رہو۔ کبھی نہ کبھی کام آئیں گی۔

مددگار: راشد صاحب تقاضا کر رہے ہیں کہ میری غزلیں بروقت آپ کے رسالے میں طبع نہیں ہوتیں۔ اس کا کیا جواب دوں۔

اڈیٹر: لکھ دو کہ آئندہ انشاء اللہ شکایت کا موقع نہ آئے گا۔ یارمن۔ ان شاعروں سے بگاڑنا ٹھیک نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا کلام کوڑھی کام کا نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی اس کو پڑھتا ہے لیکن رسالے کے کسی صفحہ تو بھر جاتے ہیں۔

مددگار: انھوں نے اپنی نظم میں پھر گاندھی جی کی تعریف لکھی ہے۔

اڈیٹر: کبھی یہ بری بات ہے۔ ایک ہی مضمون پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جاتی ہے تم یہ کرو کہ ان کی نظم میں جہاں جہاں لفظ "گاندھی" آیا ہے وہاں "مالوی" کرو۔

مددگار: اور "مالوی" سحر میں کیوں کر آئے گا۔

اڈیٹر: ارے میاں تم بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ مجھے یہ تو بتاؤ قادر مین کرام میں اللہ کے فضل سے نظم کو صحیح پڑھنے والے کتنے ہوتے ہیں اور خدا نخواستہ ان بحروں کو سمجھتا کون ہے۔ اخبار یا رسالے پڑھنے سے یہ مطلب تھوڑی ہوتا ہے کہ زبان درست ہو یا کوئی نصیحت حاصل کی جائے۔ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح بے کار وقت کٹ جائے۔ اور ہاں تعیبات کے دائرہ کٹر صاحب کو نہایت ادب سے لکھ دینا کہ گو آپ کے تعیسی مباحث ہمارے رسالے اور اخبار کے مقاصد میں نہیں آتے بلکہ صرف آپ کی خاطر ہم اس قسم کے مضمون چھاپ رہے ہیں۔ اس کے بعد اپنے اخبار کے وسیع اثرات کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتا دینا کہ اسکولوں کے لیے اخبار کے پرچے خریدنے کی جو درخواست دی گئی تھی اس کا اگر جلد تصفیہ فرما دیا جائے تو مناسب ہے۔ اچھا۔ اب جائیے۔ مجھے ایک مضمون لکھنا ہے۔ خدا حافظ۔

(۳)

اڈیٹر صاحب آرام کرسی پر لیٹے ہیں۔ گود میں کانغدون کا ایک دستہ ہے۔ ہاتھ میں قلم ہے آنکھیں بند ہیں۔ خزانے کے بے ہیں ان کی ظاہری حالت پر نہ جانا۔ یہ بڑے آدمی ہیں سوتے ہیں کبھی مضمون لکھا کرتے ہیں کیوں نہ ہو بڑی تقدیر والے آدمی ہیں چار دنو جان بوجھ کہ جیل خانے جا چکے اور سرکاری روٹیاں کھا چکے ہیں سچ ہے جس کو خدا رکھے اس کو کون

دیارِ عشق

سب ہی جانتے ہیں کہ شہید میرا دوست اور بڑا پکا دوست تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ امیر تھا اور میں غریب۔ مگر دوستی میں نہ اس نے اس بات کا کبھی خیال کیا اور نہ میں نے کبھی خدا نخواستہ اس کے روپیے سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا اس کی دوستی سے میں ہی کچھ نقصان میں رہتا تھا۔ بورڈنگ سے شام کو ہم دونوں ٹہلنے نکلے ہیں۔ شہید کو پیاس لگی کہنے لگا: "چلو کھئی کچھ پیئیں، کسی دکان پر کھیرے۔ دو بوتلیں لیمنیٹڈ کی کھلو امیں۔ ایک اس نے پی، ایک میں نے پی۔ پینے کے بعد میں نے پیسے نکال، دکان والے کو دیے۔ شہید "منہیں منہیں" کرتا رہا۔ مگر میں نے ایک نہ سنی۔ آپ یقین مانیے کہ اگر کوئی میرے برابر والا ہوتا تو آدھے دام ضرور دھروالینا۔ مگر محض اس کی امارت کی وجہ سے میں خود دام دیتا کہہیں کسی کو یہ کہنے کی جگہ نہ ہو کہ "امیر کا بیٹا سمجھ کر میں نے شہید سے دوستی کی ہے۔"

بہر حال طالب علمی کے زمانے میں میرا اور اس کا خوب ساتھ رہا۔ میں نے بی۔ اے کیا۔ اس نے بھی بی۔ اے کیا۔ میں امتحان وکالت کی تیاری کرنے لگا اور وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ اپنے گھر چلا گیا۔ وکالت کا امتحان دینے کے بعد میں ٹھوڑے دن کے لیے اس کے ہاں گیا۔ ماشاء اللہ بڑا زبردست کارخانہ تھا۔ نوکر چاکر، گاڑی، گھوڑا، مکان، باغ، غرض خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ مجھ سے بڑی محبت سے ملا۔ اپنے والد سے مجھ کو طویا یا خط نہ لکھنے کی شکایت کرتا رہا۔ ہر پھر کر ہی کہتا تھا کہ "بھائی، میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ بگاؤں کا کام مجھ سے نہیں چل سکتا اور والد صاحب قبلہ زبردستی مجھے اس میں ٹھونسے دیتے ہیں۔" شام کو گاڑی میں بیٹھا مجھے سیر کرانے لے گیا۔ یہ قصبہ بہت آباد ہے۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ ندی کے بیچوں بیچ جزیرے کی شکل میں بسا ہوا ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس ندی کی طغیانی اکثر قصبے کو نقصان

پہنچا چکی ہے۔ مگر لوگوں کو یہ جگہ کچھ ایسی پسند آتی ہے کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ غرض اسی طرح چند روز گزار کر میں اپنے گھر چلا آیا۔ دکالت شروع کی۔ اور خدا کے فضل سے اچھی چلی۔ کوئی دو برس گزرے ہوں گے کہ شہید کا نام آیا، لکھا تھا کہ 'آج شام کی گاڑی سے پہنچوں گا۔ اسٹیشن پر سواری بیچ دینا'۔ شام کو میں خود اپنی موٹر لے کر اسٹیشن پہنچا۔ شہید ہنسنا ہوا ریل سے اترا۔ اور کہنے لگا 'ارے کھنی مرزا۔ میں تو زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ بے یہ کہ گاؤں کے حساب کتاب نے مجھے تو مار ڈالا ہو گا کہ چوہہ تھوڑے دنوں پار کے ہاں رہ آؤ، شاید کچھ طبیعت بہل جائے۔ خیال آتا تھا کہ چل کھڑا ہوا۔ والد صاحب تندرکتے بھی رہے مگر جب انھوں نے تمہارا نام سنا تو خاموش ہو گئے۔ دوسرے اٹھنا کا زمانہ نہیں تھا۔ اس لیے بھی انھوں نے مجھے روکنا بے ضرورت سمجھا۔'

شہید کی وجہ سے میں نے بھی اپنا پلنگ مردانہ میں منگوا لیا۔ رات کو اس ظالم نے وہ لٹے رہے قصبے چھوڑے کہ نیند حرام کر دی۔ معلوم نہیں کہ کیوں اس زمانے میں میرے افسانے بہت پسند کیے جاتے تھے۔ شہید رہ رہ کر یہی سوال کرتا تھا کہ 'یار یہ بتاؤ کہ ایسے مضمون تم لکھنے کیسے ہو۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب خود مجھے اپنا مضمون پسند نہیں آتا تو بھلا دوسرے اس کو کیوں پسند کرنے لگے۔ بھئی ہم تم کو ایسا نہیں سمجھے تھے۔ تم تو چھپرے ستم بکلیے قسم خدا کی۔ میں اگر ایسے مضمون لکھنے لگوں تو بیڑا پار ہے۔ ایک صفحہ لکھ کر سارے دن کی کلفت دور ہو جائے'۔ میں نے کہا 'میاں شہید۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہ مضمون کیوں کر لکھ لیتا ہوں۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کسے کیوں پسند کرتے ہیں۔ اگر ہماری بات مانو تو ایک صلاح دیں۔ تم شادی کر ڈالو۔ پھر ہمدردی کے جھگڑوں میں پڑ کر یہ ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور مضمون لکھنے کو مواد بھی بہت کچھ مل جائے گا'۔ شہید نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہنے لگا 'میاں مرزا، خدا کے لیے ایسی مثال زبان تو منہ سے مت نکالو۔ میں اور شادی کروں۔ یوں ہی کیا کم جھگڑے میرے چھپرے لگے ہیں۔ جو بومی کا دم چھلا بھی اپنے ساتھ لگا لوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آزاد بھی رہوں اور دل بھی بہل جائے'۔ میں نے کہا 'حضرت یہ ذرا مشکل کام ہے۔ یہ بات تو صرف دو ہی طرح کے آدمیوں کو حاصل ہے۔ یاد دہانوں کو یا عاشقوں کو۔ خیر دیوانہ بننا تو تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ ہاں عاشق ہو سکتے ہو۔ پھر کیا ہے کہ میرے دونوں میٹھے ہیں۔ آزادی الگ ملے گی اور مضمون نگار الگ ہو جاؤ گے۔ اور

مضمون نگار بھی کیسے کہ رہے نام سائیں کا۔ اگر سارا ہندوستان نہ چیخ اٹھے تو میرا ذمہ! میں نے تو یہ بات سنسی سنسی میں کہی تھی مگر خدا معلوم۔ شہید کیوں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے بات بدلنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن اس کو جو چپ لگی تو پھر میری کسی بات کا اس نے جواب نہ دیا۔ آخر باتیں کرتے کرتے مجھے بھی نیند آگئی۔ صبح جو سو کر اٹھا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ شہید کا پلنگ خالی پڑا ہے۔ آدمی کو بلا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرت چار بجے کی گاڑی سے چل دیے۔ میں نے سب نوکروں کو ڈانٹا کہ مجھے کیوں نہ جگا لیا۔ مگر وہ بچارے کیا کرتے۔ میاں شہید نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں بھائی سے اجازت لے کر جا رہا ہوں۔ کیوں خواہ مخواہ جگا کر انھیں حیران کرتے ہو۔

میں صبح کو ہاتھ منہ دھونا مشقت کر دفتر میں آیا۔ کچھ موکل آگئے تھے۔ ان سے مقدمات سمجھتا رہا۔ نو بجے کے قریب ڈاک آئی۔ خطوں کو دیکھا۔ اخبار اٹھا کر ادھر ادھر اٹاپٹا۔ ایک جگہ موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا، ایک قصبہ کن تباہی، معلوم نہیں کہ کیوں اس خبر کے پڑھنے کو جی چاہا۔ دو چار سطریں پڑھی ہوں گی کہ جی گھبرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے سے حرمت بھاگنے لگے۔ ہائے شہید کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ سارے کا سارا قصبہ بہ گیا۔ بھلا وہ بھی کوئی ندی میں ندی تھی جس نے یہ آفت پا کر دی۔ اور یہ طغیانی ہی کا کون سا موسم تھا۔ بس یہ کہو کہ ان سب بچاروں کی موت ہی آگنی تھی یا خدا بے چارے شہید پر رحم کر۔ کہیں غریب اس صدمے سے دیوانہ نہ ہو جائے۔ میں نے اسی وقت شہید کے نام نار دیا۔ لیکن دو ہی گھنٹے کے بعد جواب آیا کہ 'قصبہ بالکل تباہ ہو گیا۔ وہاں کوئی نہیں ہے جس کو تانا دیا جائے۔' انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر چپ ہو گیا۔ لیکن دل پر ایسا دھچکا لگا کہ کئی روز تک کھانا پینا حرام ہو گیا۔ رات ہے۔ تو یہی فکر ہے۔ دن ہے تو یہی فکر ہے کہ اس قصبہ واہوں پر کیا گزری ہوگی۔ اور بچارے شہید پر کیا گزرے گی۔

اس واقعہ کو کچھ اوپر ایک سال ہو گیا ہے۔ آج کوئی دو بجے۔ ایک خط ملا خط ضرور شہید کا ہے۔ طرزِ تحریر بھی اس کی ہے۔ طریقہ مخاطبت بھی اسی کا ہے۔ اگلا بھی اسی کی ہے۔ انشاء بھی اسی کی ہے لیکن مضمون اس کا نہیں معلوم ہوتا۔ اب خدا کو خبر ہے کہ شہید دیوانہ ہو گیا ہے یا کوئی اور راز ہے۔ میری کچھ کچھ میں نہیں آتا۔ خط نقل کیے دیتا ہوں۔ کوئی بھلے آدمی مجھے بتائیں کہ آخر یہ ہے کیا معاملہ یکم اپریل سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میرے بارے مذاق کیا ہے۔ کسین واقعات کا تسلسل اور عبارت

کی نشست کہتی ہے کہ نہیں۔ اس میں اصلیت ہے اور ضرور اصلیت ہے۔ خواہ ہم اس کو سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔ بہر حال ملاحظہ ہو۔

از مسجور

یکم اپریل سنہ رواں

یار عزیز۔ خداتم سے سمجھے۔ تم نے بیٹھے بٹھائے مجھے عشق کی مصیبت میں پھنسا دیا۔ نہ اس روز تمھارے پاس آنا اور نہ ان مشکلات میں گرفتار ہونا۔ گھر والے بہتے تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی بہہ جاتا۔ نہ جیتا رہتا اور نہ اس عشق کے جنجال میں پڑتا۔ تاخیر سنو۔ تم تو اس روز باتیں کرتے کرتے غمیں ہو گئے اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ مرزا کی ترکیب بہت چوکھی ہے۔ چلو کہیں چل کر عاشق ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ اگر سچا عاشق ہوا تو پھر کہنا ہی کیا ہے۔ اگر یوں ہی کچھ لگاؤ ہوا تو مضمون لگا۔ ہو جاؤ گے۔ یہ بھی قسمت آزمائی ہے۔ اس کو بھی کر دیکھو۔ غرض یہی سوچتے سوچتے تین بج گئے۔ چار بجے ریل جاتی تھی۔ میں نے اٹھ کر چپکے چپکے بستر باندھنا شروع کیا۔ خبر نہیں تمھارا نوکر برہان کیوں کر جاگ اٹھا۔ اس نے پہلے تو مجھے چور سمجھا اور کیا عجب کہ وہ مجھ پر آکر لکڑی کا دار کرتا۔ کیوں کہ اس کا دبے پاؤں آنا خالی از علت نہ تھا۔ مگر جب اس نے مجھے پہچانا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں تمھاری اجازت سے جا رہا ہوں۔ صرف ایک مقدمے میں مشورہ لینے آیا تھا۔ کل پیشی ہے۔ اگر چار بجے کی گاڑی سے نہ گیا تو نقصان ہو جائے گا۔ یہ سن کر وہ بھی اسباب سمیٹنے میں میرا شریک ہو گیا۔ اس کے سر پر سامان رکھوا کر اسٹیشن پہنچا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آگئی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور سوار ہو گیا۔ خدا کے لیے برہان کو کچھ نہ کہنا۔ اس میں اس بچارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جنکشن پر اخبار خریدا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ تم نے بھی پڑھا ہو گا۔ اب تم ہی بناؤ کہ جب گھر بار رہا نہ ماں باپ۔ بھائی بہن رہے نہ مکان اندوختہ رہا نہ زمین تو پھر میں گھر جا کر کیا کرتا۔ میں اسی خیال میں حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ مرغوب آباد سے ایک بڑے میاں سوار ہوئے۔ ایسے باتوں تھے کہ خدا کی پناہ۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی انھوں نے ریٹریٹ کے بکس پر قبضہ کیا اور ٹرین پر اس طرح سگریٹ پینے شروع کیے کہ تھوڑی ہی دیر میں نو سگریٹوں کا خون کر دیا۔ ان کی باتیں کچھ ایسے نرے کی تھیں کہ میں نے بھی ان کے سامنے سے بکس اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے کہ ”ہمارے مرغوب آباد سے تھوڑے فاصلے پر پہاڑوں

کے یچ میں ایک لبتی ہے۔ وہاں کی آب و ہوا میں کچھ اس بلا کا اثر ہے کہ جہاں کسی نے وہاں قدم رکھا اور عاشق
 ہوا۔ اور مزایہ ہے کہ جو وہاں جاتا ہے آنے کا نام نہیں لیتا۔ پہلے تو جانے والوں کا بڑا زور تھا۔ آج یہ گیا
 کل وہ گیا مگر تھوڑے دنوں سے سرکار نے وہاں جانے کی ممانعت کر دی ہے اور لوگ خود بھی وہاں
 جانے سے گھبراتے ہیں۔ اس لیے عاشقوں کے قافلے اب ذرا ادھر کم جاتے ہیں۔ کبھی ہمارے خیال
 میں تو وہاں پر یاں آباد ہیں۔ وہ انسانوں پر کچھ جادو کر کے اس طرح پھانس لیتی ہیں کہ کوئی اللہ کا
 بندہ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ اسی وجہ سے سب لڑک اس کو مسخرا کہتے ہیں۔ یہ مضمون کچھ ایسا
 دل چسپ تھا کہ میں سارا غم بھول گیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ بڑھایوں ہی غمیں مار رہا ہے لیکن جب
 اس بھلے مانس نے قسمیں کھائیں اور اتنے پتے کی باتیں بیان کیں اس وقت مجھے بھی کچھ یقین سا آ گیا
 سوچا کہ ”میاں شہید جب زندگی گزارنے کا بس یہی ایک رستہ رہ گیا ہے۔ اگر بڑھے کی بات صحیح نکلی
 تو اچھی گزر جائے گی۔“ غرض یہ سوچ کر میں دوسرے اسٹیشن پر اتر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاؤن ٹرین
 بھی مل گئی۔ اس میں سوار ہو کر خوب آباد پہنچا۔ ریل سے اترا۔ سامان اسٹیشن مارٹر کی تحویل میں دیا۔ صبح
 بوچھلی تھی۔ اسٹیشن پر تانگے والے کھڑے تھے۔ میں نے ایک سے کہا ”میاں تانگے والے مجھے مسخرا لے چلو
 گے۔ یہ سن کر وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ”کیوں آخر مسخرا جانا کوئی جہر ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”اچے جائیے۔ پرے ہیٹے۔ آپ ہمیں پولیس میں گرفتار کرانا چاہتے ہیں۔ اب کہا تو کہا۔“ آئندہ یہ لفظ منہ
 سے نہ نکالنا اور نہ پکڑے جاؤ گے۔“ خیر ان باتوں سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بڑھے کی باتوں میں کچھ اصلیت ضرور
 تھی۔ سارا دن میں نے ادھر ادھر گھوم کر کاٹا۔ اور چپکے چپکے کیے والوں، تانگہ والوں، گاڑی بانوں اور
 چھپڑے والوں سے مسخرا چلنے کو کہتا رہا۔ مگر کسی نے بھی چلنے کی حامی نہ بھری۔ آخر شام کو ایک بڑھے
 گاڑی بان نے کہا ”میاں میں لے تو چلوں گا مگر ایک شرط ہے کہ مسخرا سے پانچ میل ادھر چھوڑ دوں گا۔ آگے
 آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔ رات اندھیری ہے۔ آپ تو مجھے مجھ سے گاؤں کے باہر ہیٹے۔ میں گاڑی
 چھڑاؤں میں چھپا دوں گا۔ جب گاؤں کے سب لوگ سو جائیں گے۔ اس وقت ہم دونوں پیٹروں کی طرف
 نکل کھڑے ہوں گے۔ مگر میاں میں سچا س روپے ہوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی کو ذرا بھی خبر ہو گئی کہ میں
 کسی مسافر کو مسخرا سے کی طرف لے گیا ہوں تو پھر میری خبر نہیں۔“

بہر حال، بڑے میاں سے سب کچھ کھٹیرا، میں اسٹیشن گیا۔ تھوڑا سا سامان لے مختصر سے

بچھونے میں لپیٹا۔ ٹرنک اور باقی سامان کرایہ دے اسٹیشن ماسٹر کے سپرد کر دیا۔ ہوٹل میں کچھ کھانا کھایا کچھ ساتھ رکھا اور نو بجے گاؤں کے باہر پہنچ گیا۔ یہاں گاڑی بان صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔

انھوں نے پہلے تو پورے پچاس روپے مجھ سے گنوائیے۔ اس کے بعد میرا سامان اپنی مگر پر لگا کر ایک طرف کوچھے۔ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیاں شروع ہوئیں۔ انھی جھاڑیوں میں ایک طرف اُن کے بل بندھے تھے اور بہلی کھڑی تھی۔ کوئی دس ساڑھے دس بجے تک میں بہلی میں ستر بچھا بیٹا رہا۔ اور گاڑی بان صاحب کہل اوڑھے دم سا دھے ایک طرف پڑے۔

گیارہ کا عمل ہو گا کہ انھوں نے آکر مجھ سے کہا 'میاں چلیے وقت ہو گیا ہے' میں نے کہا 'چلو میں تو پہلے سے تیار ہوں'۔ انھوں نے بہلی میں بل لگائے۔ چارہ و عزیز و سمیٹ کر سانگی میں بھرا۔ بہلی کو پگ ڈنڈی پر ڈالا۔ اور سنان رات میں یہ دو آدمیوں کا قافلہ خدا معلوم کس طرف روانہ ہوا۔

رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہری ہری گھانس کی خوشبو اور بہلی کے نرم نرم ہچکچولوں سے میری آنکھ لگ گئی۔ میں مزے کی نیند سو رہا تھا کہ گاڑی بان نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا اور کہا 'بیجیے میاں۔ اترے۔ اب اس سے آگے ہم نہیں جاتے۔ دیکھیے اب بھی موقع ہے۔ واپس چلے چلیے۔ پھر یہ نہ

کتیے گا کہ اس بڑھے نے میری مٹی خراب کی' میں نے بہت کہا کہ 'بڑے میاں ذرا اور آگے چلو مجھے راستہ معلوم نہیں۔ اندھیری رات ہے۔ خدا معلوم کدھر کدھر نکل جاؤں۔ کچھ اور سے نینا۔ مگر وہ بڑھا کب مانے والا تھا۔ کہنے لگا 'اجی اب اترتے ہو یا نہیں۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے گھر

پہنچنا ہے۔ کیا اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر نہیں اترتے تو میں گاڑی پھیرتا ہوں' قبر درویش برجان درویش۔ بہلی سے اترنا سامان کی پوٹلی کندھے پر رکھی۔ بڑے میاں سے راستہ پوچھا اور عاشق ہونے کے لیے اس شان سے روانہ ہو گیا۔ گاڑی بان گاڑی پھیرا اس

زمانے سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا کہ کھوڑی ہی دیر میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر تک تو گاڑی کی کھڑکھڑ سنائی بھی دی۔ اس کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔

جہاں گاڑی بان نے مجھے چھوڑا تھا، وہاں سے پہاڑ کی چڑھا کی ختم ہو کر اتار شروع ہوتا تھا۔ چاروں طرف ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ لمبی لمبی گھانس اونچے اونچے درخت اور کالی کالی چٹانوں نے ایک عجیب وحشت ناک منظر پیدا کر دیا تھا۔ میں

ڈرپوک نہیں ہوں، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ کئی دفعہ خیال آیا کہ میاں شہید واپس چلو بھئی۔ تم خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ پھر سوچا کہ یار یہاں تو نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، کی صورت ہے واپس جلتے ہو تو مر غوب آبادی کا راستہ تمہیں کون سا معلوم ہے۔ اب پڑی ہے تو اٹھاؤ۔ یہ ساری مصیبت تم نے اپنے ہی ہاتھوں مول لی ہے۔ غرض سوچتا تھا اور قدم اٹھائے چلا جاتا تھا، خدا معلوم اس کش مکش خیال میں کتنی دور نکل گیا، کوئی دو ڈھائی گھنٹے بعد صبح ہونی شروع ہوئی۔ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی، آہستہ آہستہ درختوں نے جھومنا اور بیٹھے بیٹھے سروں میں پرندوں نے گانا شروع کیا۔ دور کی چیزوں نے رفتہ رفتہ صورت اختیار کی، مشرق کی طرف کالے بادلوں کے کنارے گلابی بوئے، کہرنے اپنا سفید بادہ سمیٹا، شبنم نے رخصت ہونے کی تیاری کی، سورج کا سنہرا اتھال اچک کر افق پر آیا۔ لیجیے صبح ہو گئی۔

سامنے ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، مگر کسی نیش سلیقہ شخص نے کچھ اس طرح بسایا تھا کہ دیکھنے سے دل میں کھپا جاتا تھا۔ صبح کے سہانے وقت میں اس کے سفید سفید مکانات، ہر مکان کے سامنے چھوٹے چھوٹے نیچے، صاف صاف ستھرے، ہتھری پگ ڈنڈیاں، ہرے بھرے کھیت، کھیتوں کے کنارے پر پانی سے لبریز پتلی پتلی نالیوں، دور فاصلے پر اچلی رہتی اور اس میں ندی کا نیل گوں پانی کچھ ایسی بہا دے رہا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا، اور بڑی دیر تک اس دل چسپ اور دل کش منظر کو دیکھتا رہا، آخر بسم اللہ کہہ کر قدم اٹھایا اور تھوڑی دیر میں گاؤں میں پہنچ گیا، ابھی دوسرے ہی مکان تک پہنچا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک ایسی آفت جان بستی اس میں سے نکلی کہ جس غرض سے میں چلا تھا وہ حاصل ہو گئی، اس کے بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا اور کیوں کر ہوا، بہر حال خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی، خدا! اس کھوسٹ مسافر اور بڑھے گاڑی بان کا بھلا کرے کہ ان دونوں نے مجھے جنبہ میں پہنچا دیا، اب نہ یہاں سے کوئی مجھے جانے دیتا ہے اور نہ خود جانے کو میرا جی چاہتا ہے، نہ مجھے بہار کا حال بیان کرنے کا یارا ہے اور نہ تمہیں اس کے سنتے اور سمجھنے کی قدرت، بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ

اگر فردوس بروئے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

جاؤ یا تم ہی گھاٹے میں رہے۔ سارے دن سرغزنی کرتے ہو اور راتوں کو بھی آرام سے نیند نہیں آتی۔

والسلام
تمہارا پرانا دوست

شہید!

مگر وہ سال بھر کی کوشش کے بعد اس خط کو ڈاک میں ڈالنے کی صورت نکلی ہے۔ خدا کرے ڈاک میں پڑ جائے اور تم تک پہنچ جائے۔

شہید۔

لیجئے۔ یہ ہے میان شہید کا خط۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ ہے یہ کیا معاملہ۔ میں نے تمام ریلوے گاؤں دیکھ ڈالے۔ مجھے تو کسی مرغوب آباد اسٹیشن کا پتہ نہ چلا۔ ڈاک خانوں میں دریافت کیا۔ تار گھر والوں سے پوچھا۔ خط کی بگڑی ہوئی مہر کو پڑھوانے کی کوشش کی۔ مگر میری ساری محنت اکارت گئی۔ آخر تھک تھکا کر بیٹھ رہا۔ پھر خیال آیا۔ چلو کسی رسالے میں سارا واقعہ چھپوا دو۔ شاید کوئی اللہ کا بندہ اس معجزے کو حل کر سکے۔ اب دیکھیے آپ لوگ بھی اس کو حل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس سے یہ غرض نہیں ہے کہ میں خود مسخورا جانا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ آخر یہ عقل مند کیا کہاں ہے اور ہے کس حال میں۔ آپ بھی غور کیجیے میں بھی غور کرتا ہوں۔ شاید کسی کی عقل لڑ جائے اور شہید کا پتہ مل جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہید کا کوئی اور خط آئے اور مسخورا کا کچھ اور اتا پتا معلوم ہو۔ بہر حال اگر اس کا خط آیا تو وہ کبھی چھپوا دوں گا تاکہ میں اور آپ دونوں اس خلیجان سے نجات پائیں۔

کہانی

زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں۔ زندہ دلی اور مردہ دلی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو مرنہا۔ زندگی کے انھی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکنتوں کی صورت۔ غرض دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک روتی صورت دوسرے ہنستی صورت کوئی انشا، بنا اور کوئی تیسر۔

پہلے زمانے کے لوگوں کا کیا کہنا۔ وہ تو بچوں کو شروع ہی سے سکھانے تھے کہ سب کھیلنے عمر گزار دو۔ کہانیاں کہتے تھے تو ایسی کہ بچوں کو زندہ دلی سے محبت اور مردہ دلی سے نفرت ہو پرانے قصے کہانیاں اب خود قصے کہانیاں ہو گئیں۔ ان کو اس لیے چھوڑ بیٹھے کہ پرانی ہر بات فضول ہے۔ خیر کوئی سنے یا نہ سنے ہیں تو ایک پرانی وضع کی کہانی کہے دیتا ہوں۔ ذرا دیکھنا کس خوبی سے زندگی کے دونوں پہلو دکھا کر زندہ دلی کی ترغیب دی ہے۔

گرمی کا موسم ہے چاندنی رات ہے۔ صحن میں پلنگ بچھے ہیں۔ کھانا ادا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں۔ ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ لیٹی کھسک رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر ان کے دو چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کشم کشم ہورہی ہے۔ ان کی والدہ تختوں پر جا نماز بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ان کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پان دان کھولا ہے۔ پان دان کی آواز سنتے ہی احمد اور محمود لڑائی و ڈرائی چھوڑ پلنگ سے اٹھے اور نانی سے آکر لپٹ گئے۔ احمد نے کہا ”نانی اماں کہانی“ محمود نے کہا ”ہاں نانی اماں کہانی“ یہ سنا تھا کہ سعیدہ اور حمیدہ بھی اٹھ بیٹھیں اور انھوں نے بھی نانی

سے کہانی کا تقاضا کیا۔ بڑی بی بہت کچھ کہتی رہیں۔ ”ارے بھئی میرے سر میں درد ہے۔ کل کہوں گی۔ دیکھو نعل نہ مچاؤ۔ تمھاری اماں کی نماز میں ہرج ہرج ہوتا ہے۔“ مگر کون سنتا تھا۔ آخر گھسیٹ گھساٹ بڑی بی کو پلنگ پر لا ہی بٹھایا۔ دو ایک پہلو میں لیٹ گئے۔ دو دوسرے پہلو میں۔ اور اب سجت شروع ہوئی کہ کون سی کہانی کہی جائے۔ میاں محمود سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ تو تا مینا کی کہانی کہو۔

لڑکیاں مصرتھیں کہ رانی کتیلی کا قصہ سناؤ۔ بڑی بی پریشان تھیں کہ کون سی کہوں۔ کون سی نہ کہوں۔ آخر کہنے لگیں۔ ”تم سوچنے تو دیتے ہی نہیں۔ کہوں تو کیا خاک کہوں۔ ذرا دم لو۔ میں سوچ تو لوں۔“ یہ سن کر بچے چپ ہو گئے۔ بڑی بی نے دماغ پر ذرا زور ڈالا۔ اور اس طرح کہنا شروع کیا۔

”تو ہاں بھئی خدا تمھارا بھلا کرے ایک تھئی بڑھیا۔ بے چاری کے ایک ہی بچہ تھا۔ مصیبت کی ماری سارے دن سوت کانتی شام کو جا کر گڈڑی میں بیچ آتی۔ دنیا بیئے کے ہاں۔“

سعیدہ: ”نانی اماں! وہی دینا نا جس کے ہاں سے ہمارا اناج آتا ہے۔“

احمد: ”نانی اماں! دینا پودینہ، باجرہ کی روٹی۔“ نکا مہینہ۔“

بڑی بی نے بچوں کو ڈانٹا کہ ”تم سنتے ہو۔ نہ کہنے دیتے ہو، چلو جاؤ۔ اپنی اماں سے جا کر کہانی سنو۔ وہ نماز پڑھ چکی ہیں۔ مجھ سے سننا ہے تو چیکے لیٹے رہو۔“ خیر پھر افراد مدار ہوئے اور بڑی بی نے کہا ”ہاں میں نے کہا تم کہا تھا۔“

حمیدہ: ”دینا بیئے کے ہاں سے۔“

بڑی بی: ”ہاں۔ دینا بیئے کے ہاں سے تھوڑی سی وال۔ تھوڑا سا آٹا۔ تھوڑا سا نمک مرچ لاتی پکاتی خود کھاتی۔ بچے کو کھلاتی۔ اسی طرح کسی برس گزر گئے۔ بچے خاصا سانا ہو گیا۔“

احمد: ”نانی اماں! سانا کیا ہے؟“

نانی: ”سانا یعنی بڑا۔ ہوشیار۔“

میاں محمود جوش میں آکر اٹھ بیٹھے اور کہا ”نانی اماں جیسے میں۔“ مہنوں نے میاں محمود کو پکڑ دھکڑ زبردستی لٹا دیا۔ اور پھر کہانی شروع ہوئی۔

نانی: جب ذرا سانا ہوا۔ تو میاں جی کے پاس پڑھنے بٹھایا۔

احمد: نانی اماں! سختی پہ سختی۔ میاں جی کی آئی کم سختی۔“

نانی : نا بیٹا۔ ایسی بری باتیں نہیں کیا کرتے۔ مولوی صاحب باپ کے برابر پوتے ہیں۔“

ان کو بھی بھائی بہنوں نے زبردستی خاموش کیا۔ اور پھر کہانی کا سلسلہ چھڑا۔

نانی : بھئی وہ لڑکا تو ایسا نکلا۔ ایسا نکلا کہ سبحان اللہ۔ تھوڑے ہی دنوں میں پڑ پڑھا خاصا مولوی

ہو گیا۔ عرضی پڑے کر کچھری میں دس پندرہ روپے کا نوکر بھی ہو گیا۔ اب بڑی بی کے دن بھرے۔ اچھے

اچھے کھانے پکائیں۔ اچھے اچھے کپڑے بنائیں۔ مزے سے دونوں ماں بیٹے رہنے۔ جب ہوتے ہوتے تھوڑا

بہت روپیہ بھی جمع ہو گیا تو بڑی بی کو بچے کی شادی کی سوچھی۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک لڑکی چندے آفتاب

چندے مہتاب بیاہ لائیں۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اتارا۔ اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتی

اچھے سے اچھا کپڑا پہناتی۔ مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اس کے بھاریں ہی نہ آتی تھی۔ جب تک گھونگھٹ رہا۔

اس وقت تک تو کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ گھونگھٹ اٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی۔ زبان سے

ہوتے ہوتے ہاتھ پر اتر آئی۔ خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی لسوے بہانے بیٹھ جاتی۔ خاوند سے

وہ وہ لگائی بھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی ماں کو خوب مارا۔“

حمیدہ اچھل پڑی اور کہا ”اے ہے ماں کو مارا۔ موے کو بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے شرم بھی نہ آئی۔“

نانی : ”ہاں بیٹا۔ اچھی بیٹیاں ساس کو ماں کے برابر سمجھتی ہیں۔ نوج دور پارا اگر شریفوں کی بہو

بیٹیاں ایسی باتیں کرنے لگیں تو پھر شریفوں اور چوہڑے چماروں میں بیا فرق رہ جائے۔ ہاں تو

بیٹے نے مار پیٹ بڑھیا کو گھر سے نکال دیا۔“

محمود : ”اور ہلدی چونا نہیں لگایا؟“

نانی : ”ہلدی چونا لگانا ہوتا تو مارتے ہی کیوں۔ تو خیر بے چاری بڑھیا روتی رلاتی جنگل بیابان

میں جہاں آدم نہ آدم زاد۔ ایک بڑکے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ اور لگی منہ ڈھانک کر روتے

خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اٹھی دنوں میں جاڑا گرمی۔ برسات میں جھگرہا ہوا۔

جاڑا کہتا میں اچھا۔ گرمی کہتی میں اچھی۔ برسات کہتی میں اچھی۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ چلو چلو

کر کسی آدم زاد سے پوچھیں۔ ان کا جو ادھر گزرا ہوا تو تینوں نے کہا، لو بھئی وہ سامنے ایک بڑھیا

بیٹھی رو رہی ہے چلو اس سے پوچھیں۔“

سب سے پہلے میاں جاڑے آئے۔ گوری گوری رنگت۔ کلمے ایسے جیسے انار کا دانہ۔

سفید داڑھی۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔

حمیدہ: "نانی اماں! وہ کہاوت کیا ہے۔ دگلہ سب سے اگلا۔"

نانی: "دگلہ سب سے اگلا۔ پہننا تو گرم۔ بچھاؤ تو نرم۔ باندھو تو بغھی کا بھرم۔"

تو ہاں۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔ خوب اوڑھے لپیٹے آئے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھر تھری چھوٹ

گئی۔ میاں جاڑے نے آکر کہا "بڑی بی سلام" بڑی بی نے کہا "بیٹیا۔ جیتے رہو۔ بال بچے خوش رہیں مگر بیٹا ذرا

دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو تمہارے آنے سے کپکپی سی لگ گئی ہے۔" خیر میاں جاڑے ذرا ہٹ کر

کھڑے ہوئے اور کہا "بڑی بی ایک بات پوچھوں؟" بڑی بی نے کہا۔ "ہاں بیٹا ضرور پوچھو، میاں جاڑے

نے کہا "بڑی بی جاڑا کیسا ہے؟" بڑی بی نے کہا "بیٹا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ مہا

برس رہے ہیں۔ والوں کے پردے پڑے ہیں۔ انگلیٹھیاں سلگ رہی ہیں۔ لحافوں میں ڈبکے بیٹھے

ہیں۔ چائیس بن رہی ہیں۔ خود پی رہتے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح بوئی اور چنے والا آیا۔ گرم

گرم چنے لیے۔ پپلے پھولے پھولے چنے کھائے۔ پھر کٹر کٹر ٹھنڈیاں چپا رہے ہیں۔ حلوا پوریاں اڑ رہی ہیں

بچے ہیں کہ جیبوں میں چینی ڈالے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کابل سے طرح بہ طرح کے میوے آرہے ہیں۔

سب مزے لے لے کر کھا رہتے ہیں۔

سعیدہ: "نانی اماں! حلوا سو من بن رہا ہے۔"

نانی: "ہاں۔ حلوا سو من بن رہا ہے۔ کاجر کی تری تیار ہو رہی ہے۔ باجرہ کا لمبیدہ بن رہا ہے۔ ری

کی کھیر پک رہی ہے۔ ادھر کھایا۔ ادھر بنشم۔ خون ہے کہ چلووں بڑھ رہا ہے۔ چہرے سرخ سرخ ہوئے

ہیں۔ بیٹا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔"

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تحریریں سن سن کر ہنپولے نہ سماتے تھے۔ جب بڑی بی چپکی ہوئیں، تو

میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی۔ خدا تم کو زندہ رکھے۔ تم نے مراد دل خوش کر دیا۔ یہ لو ایک ہزار اشرفی

کی قبلی۔ خرچ ہو جائے۔ تو اگلے جاڑے میں مجھ سے اور آکر لے جانا۔"

میاں جاڑے بیٹے اور بی گرمی۔ مشکلی بوئی سامنے آئیں۔ کوئی ۱۵۔۱۶ برس کا سن۔ سرخ سرخ

کال ان پر ہکا بلبکا پسینہ۔ روشن آنکھیں۔ لمبی کالی چوٹی۔ سکلے میں موتیا کا کنتھا۔ ہاتھوں میں مولسی

کی لڑیاں۔ سر پر کرن ٹکی بوئی باریک ہوا ڈوریہ کی پیازی اور معنی۔ غرض بڑی شان سے آئیں۔

اور آتے ہی کہا "نانی جان، سلام، بڑی بی نے کہا، بیٹا، جیتی رہو۔ یوڑھ سہاگن ہو۔ کہو تم بھی کچھ پوچھنے آئی ہو۔ ابھی تمہارے آبا تو آکر پوچھ گئے ہیں، بی گرمی نے کہا، نانی جان وہ میرے آبا نہیں۔ بڑے بھائی ہیں۔ ہاں تو میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ نانی جان گرمی کیسی۔" بڑی بی نے کہا، "بیٹا، گرمی، گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ دن کا وقت ہے۔ خس خانوں میں پڑے ہیں، پنکھے تھلے جا رہے ہیں، کٹورے پر کٹورا شربت کا اڑ رہا ہے۔ بچوں کے ہاتھوں میں ہزارے ہیں۔ ایک دوسرے پر جلا رہے ہیں برف کی قلفیاں (رقفیاں) کھائی جا رہی ہیں فصل کے میوے آ رہے ہیں۔ تیلی پتل ککڑیاں ہیں لوکاٹ ہیں۔ آ رہی ہیں۔"

حمیدہ: نانی اماں! انگور میں سیب ہیں۔

نانی: "واہ بھئی واہ۔ انگور اور سیب جاڑے میں ہوتے ہیں یا گرمی میں تم جب بولتی ہو بے تکی بولتی ہو۔ ہاں تو شام کو اٹھے، نہائے، دھوئے، سفید سفید کپڑے پہنے، خس کا عصر ملائے، میں نوتیا کے کٹھے ہیں، ہاتھوں میں مولسری کی زبیاں ہیں صحن میں تھپڑ کا ڈبو گیا ہے، گھڑ و پنجیوں پر کورے کورے تیلے رکھے ہیں۔ قلعی دار بھجیروں پر سوندھی سوندھی صراحیاں جی ہیں، گھڑوں اور صراحیوں کے تیلے پڑاں لال صافیاں لپٹی ہیں، ارد گرد کا غذی آب فورے لگے ہوئے ہیں، فادرے اور برف کا زور ہے رات ہوئی، کونٹوں پر پلنگ بچھ گئے، سفید سفید چادر میں بچھی ہیں، اوپر پھول پڑے ہوئے ہیں۔ خس کی پنکھیاں ہاتھوں میں ہیں، کوئی بھیگے ہوئے بان کے پلنگ پر پڑا لوٹ مار رہا ہے۔"

احمد: "نانی اماں! کہانیاں پور ہی ہیں۔"

نانی: "ہاں کہانیاں پور ہی ہیں، لوگ ہیں کہ رات کو قالین پر جا رہے ہیں، خور بوزے، تر بوز کھا رہے ہیں۔"

حمود: "کیڈی پور ہی ہے۔"

نانی: "ہاں، کیڈی پور ہی ہے، بریتی میں لوٹ رہے ہیں، صبح نہائے، دھوئے، مزے مزے کھرا گئے، بیٹا گرمی، گرمی کا کیا کہنا، سبحان اللہ۔"

بی گرمی کا یہ حال تھا کہ تعریفیں سنتی جاتی تھیں اور نہال ہوئی جاتی تھیں، جب بڑی بی تعریفیں کرتے کرتے تھک کر چپ ہو گئیں تو بی گرمی نے چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی

ان کے ہاتھ میں دی اور کہا ”نانی جان۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ آج تم نے میری لاج رکھ لی۔ درنہ بڑے بھائی صاحب تو مارے طعنوں کے مجھے جینے بھی نہ دیتے۔ میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں بے کھٹکے جو لینا ہو مجھ سے لے لیا کیجیے۔ بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے کہاں ملتے ہیں۔“

بی گرمی ذرا سٹی تھیں کہ برسات خانم۔ چھم چھم کرتی آ پہنچیں۔ سانولا نکلین چہرہ، چمک دار روشن آنکھیں۔ بھورے بال۔ ان میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ جسم پر بادلوں کا ہوا۔ آبی رنگ کا باریک دوپٹہ۔ غرض ان کے آتے ہی برکھا رت چھا گئی۔ انھوں نے بڑھ کر کہا، ”اماں جان سلام۔“ بڑی بی نے کہا، ”بیٹا، جیتی رہو۔ پیٹ ٹھنڈا رہے۔ ہونہ ہو۔ تم بی گرمی کی بہن، برسات خانم ہو۔“ بی برسات نے کہا، ”جی ہاں۔ میں پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں۔“ بڑی بی نے کہا، ”بی برسات۔ تمہارا کیا کہنا ہے۔ تم نہ ہو تو لوگ جلس کیسے مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں کھم گڑھے ہیں۔ جھولے پڑے ہیں۔ عورتوں کے ہاتھوں میں مندی رچی ہے۔ سُرُخ سُرُخ جوڑے دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ کچھ جھول رہی ہیں۔ کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملا لگائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کڑھائی چڑھی ہے۔ دوسرے طرف بری پراٹھے پک رہے ہیں۔ مرد ہیں کہ تیرا کی کا میلہ دیکھنے گئے ہیں۔ لوگوں کے منگھٹ ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی طرح تیر رہا ہے۔ کوئی کسی طرح اودی اودی گھٹائیں آئی ہوئی ہیں۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ نوروز ہو رہے ہیں۔ حوضوں میں آم پڑے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں گھٹیاں چل رہی ہیں۔ برسات بھٹی۔ برسات کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔“

بی برسات نے بھی ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بڑی بی کے نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہوتی چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سمیٹ خوشی خوشی گھر آئیں۔ ان کی بہن نے دیکھا کہ بڑھیا بستر اجل میں دا بے چلی آرہی ہے۔ آگ بگولا ہو گئی۔ کہنے لگی، ”بڑھیا تو میرے گھر میں کیوں گھسی۔ کیا اپنا کفن لے کر آئی ہے۔ اب نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں۔“ بڑھیا نے کہا، ”بیٹا۔ خفا کیوں ہوتی ہے۔ میں خانی ہاتھ تھوڑی آئی ہوں۔ تین ہزار اشرفی لائی ہوں۔ نکالتی ہے نکال دے۔ میں اپنا الگ گھر لے کر رہ جاؤں گی۔ بہن نے جو پٹلی دکھی اور تین ہزار اشرفی کا نام سنا۔ تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگی، ”اماں جان کیا سچ مچ تین ہزار اشرفیاں لائی ہو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ تم صبح سے کہاں چلی گئی تھیں۔ آپ کا انتظار کرتے کرتے

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین بجے کھانا کھایا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کو دھونڈنے گئے ہوئے ہیں؛ اتنے میں بیٹے صاحب بھی آگئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اب کیا تھا۔ تھیلیاں کھولی گئیں۔ کئی کئی دفعہ اشرفیاں گئی گئیں۔ دو سو نکال لیں۔ باقی گڑھا کھو دکر دبا دیں۔ اوپر بیٹے بہونے اپنا بستر کر دیا۔ رات ہی کونا بنائی کے ہاں سے اچھے سے اچھا کھانا۔ حلوائی کے ہاں سے اچھی سے اچھی مٹھائی آئی۔ سب نے مزے مزے سے کھائی۔ صبح ہوئی تو بیٹے صاحب جا اپنے اور بیوی کے لیے اچھے سے اچھے تھان لائے۔ کپڑے بننے شروع ہوئے۔ بڑی بی کے پاجاموں کے لیے آٹھ آٹھ گز والی چھینٹ انگیا کرتی کے لیے چار آنے گز والی ململ۔ لال زری کی گول پنچے کی جوتی۔ سر میں ڈالنے کو دھوئی تلی کاتبیل۔ کانوں کے لیے طمع کی چار چار بالیاں۔ ہاتھوں کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ ماٹھے کے دو چھلے۔ غرض بہت کچھ آیا۔ بہو اور بیٹا خوش تھے کہ بڑھیا فارون کا خزانہ لے آئی۔ بڑھیا خوش تھی کہ بہو اور بیٹے نے ماں تو سمجھا۔ چلو سب ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ بی ہمسائی نے جو یہ چیل پہل دکھی تو ان سے نہ رہا گیا ایک دن پوچھا "بہن میں ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہ مانو گی" بڑھیا کی بہونے کہا۔ "بہن شوق سے پوچھو۔ برا ماننے کی کون سی بات ہے۔" بی ہمسائی نے کہا "بہن۔ آخر ہم سے بھی تو کہو کہ یہ تمہاری سا کہاں سے روپیہ لے آئیں۔ کہیں ایسا ویسا تو نہیں ہے۔ بہن زمانہ بہت برا ہے۔ اگر چوری کا نکلا تو بڑھیا کے ساتھ کہیں تم بھی پیٹ میں نہ آجاؤ۔ حق ہمسایہ۔ ماں کا جایا ہم کہے دیتے ہیں آگے تم جانو۔ تمہارا کام جانے" بڑھیا کی بہونے کہا "نا۔ بہن یہ بڑھیا چوری کے قابل رہی ہے؟ اس کو تو یہ روپیہ جاڑے گرمی" برسات نے دیا ہے؟" بی ہمسائی نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا "اونی" بوا۔ اپنے ہوش کی دوا کرو۔ بھلا جاڑا گرمی۔ برسات کہیں روپیہ بانٹتے پھرتے ہیں تم نے مجھے کوئی دیوانہ سمجھا ہے جو ایسی اڑان گھاسیاں بتاتی ہو۔ بتاتی ہو بتاؤ۔ نہیں بتاتی نہ بتاؤ۔ ہمارا سمجھانے کا کام تھا۔ سمجھا دیا۔" بڑھیا کی بہو ڈری کہ بی ہمسائی ادھر ادھر کچھ کی کچھ نہ لگاتی پھر یں۔ یاس پر جو گزری تھی پوری کہانی سنا دی۔ بی ہمسائی سنتی رہیں۔ ہنستی رہیں۔ سب کچھ سنا۔ کھڑکی بند کر اپنے میاں کے پاس پہنچیں اور ان کو سارا قصہ سنا دیا۔

بیٹے صاحب نے جو سنا تو کہا لاؤ ہم بھی لگے ہاتھوں اپنی بڑھیا کے ذریعہ سے روپیہ سمیٹ لیں۔ ان کی بھی ماں تھیں۔ وہ بڑھیا کیا تھی آنت کی پڑیا تھی۔ گھر بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ذرا بگڑی

اور بڑے کے سات پشت کو قوم ڈالا۔ بہو نے کچھ کہا اور قیامت آگئی۔ بہو کو آج موقع ملا۔ میاں کو سمجھا نہیں کر بڑھیا کی خوب کنڈی کرانی۔ اور ڈنڈا ڈولی کر جنگل میں اسی بڑے کے نیچے ڈال آئے۔ بڑھیا نے جمع بیج گرسرا جنگل سے پراٹھا لیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ جاڑا گرمی۔ برسات تینوں اس دن پھر سے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: ”کہو بھئی بڑھیا نے کیا تصفیہ کیا۔“

جاڑے نے کہا: ”اس نے مجھے اچھا بتایا۔“ گرمی نے کہا: ”مجھے اچھا بتایا۔“ برسات نے کہا: ”مجھے اچھا بتایا۔“ جاڑے نے کہا: ”بھئی وہ بڑھیا آنت کی پرکالا تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھا ہے۔ سب ہی کی تعریفیں کر مہنت میں تین بزار اثرفیاں مار لیں۔ عرض تینوں جلے بھنے اسی بڑکی طرف آئے۔ دیکھ کر ایک بڑھیا تھپی۔ رو رہی ہے۔ پہلے میاں جاڑے پہنچے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑھیا سردی سے تر متراکھنے گی۔ جاڑے نے کہا: ”بڑی بی سلام مزاج تو اچھا ہے۔“ بڑھیا بولی: ”چل پڑھے پرے بہت۔ بڑی بی بون تیری میاں۔ اب جاتا ہے یا نہیں۔ خود تو روزی کا بولہ بن کر آیا ہے۔ اور اس جائے تین غریبوں کا مزاج پوچھنا ہے۔ چل سامنے سے بہت۔ دھوپ چھوڑا۔“ میاں جاڑے نے کہا: ”بڑی بی میں جاڑوں۔ کچھ بتا رہی کیا ہوں۔“ بڑی بی نے کہا: ”آپ اس بڑھیا سے میں بھی اپنی تعریف چاہتی ہوں۔ وہ اپنی تعریف سنا۔ آپ آئے۔ اس کو نالج ہوا۔ اس کو لقوقہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھٹے جا رہے ہیں۔ کتے بھڑک رہے ہیں۔ دانت ہیں کڑکڑکتے رہے ہیں۔ کپڑے ادھر پہنے، ادھر میسے ہوئے۔ رضائی بن کر لٹکی ہوئی ہے۔ لحات ذر مند اور نہ سے بونگھسی۔ بچھونے میں کہ بون بون رہے ہیں۔ کھانا ادھر اترا۔ ادھر چھا۔ اور جو خدا خواستہ ہیں ہاڑوں میں اولے پڑ گئے تو غضب ہی ہو گیا۔ سی سی کر رہے ہیں۔ تیسری بج رہی ہے۔ ناک معلوم ہوتا ہے کہ منہ پر ہے ہی نہیں۔ انگلیاں ہیں کہ ٹپڑھی ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی بہا جا رہا ہے۔ نہ کام ہو سکتا ہے نہ کالج۔ آخر کہاں تک کوئی آگ تاپے اور دھوپ سینے۔ تو بہ تو بہ آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے۔ لیجیے اپنی تعریف سنی یا اور سناؤں۔ جاڑا جلا ہوا تو پہنے کا تھا ہی۔ اب جو بڑھیا کی یہ عملی باتیں سنیں تو اور جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اپنی ٹھوڑی پکر ڈاڑھی کی جو بوا دی تو بڑھیا کو لقوقہ ہو گیا۔ چلتے چلتے دو تین ٹھوکر میں بھی رسید کر دیں۔ ذرا فاصلے پہ نہ گرمی اور نہ برسات کھڑی تھیں۔ ان سے کہا: ”لو جاؤ۔ بڑھیا سے اپنا تصفیہ کرالو۔ ہم تو بارگئے۔“

بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں اور کہا "نانی اماں سلام" بڑھیا نے کہا "چل دور ہو
 نگوڑی میں تیری نانی کیوں ہرنے لگی۔ آج مجھے نانی بنایا ہے کل کسی کو ختم بنا لے گی۔ اے ہے۔ تو ایسی جوان جان
 ادویوں جنگل جنگل بھر رہی ہے۔ آوارہ ہو گئی ہوگی جو ماں باپ نے گھر سے نکال دیا۔ اور نکالا بھی ایک کپڑے
 سے۔ اچھا ہوا۔ تم جیسے دلداروں کے ساتھ ایسی ہی کرنی چاہیے۔" بی گرمی نے کہا "نانی اماں۔ میں ہوں
 گرمی۔ تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ گرمی کیسی ہے؟" یہ سنا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ لگ گئی۔ کہنے لگی "اوہو
 چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب اپنی تعریفیں سن گئے ہیں۔ دو تم بھی سن
 جاؤ۔ گرمی؟ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ واہ۔ واہ۔ پسینہ بہ رہا ہے۔ کپڑوں میں سے بو آرہی ہے۔
 صبح کپڑے بدے شام تک چکٹ ہو گئے۔ کھانا کھایا ہے کسی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سینے پر رکھا ہے۔
 صبح ہوئی اور لڑ چلنی شروع ہوئی۔ اسکو لگی اس کو ہضہ ہوا۔ منہ جھلسا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر سپری جی
 ہوئی ہے۔ پانی پیتے پیتے جی بیزار ہوا جاتا ہے۔ پانی کیا ہے تنہرے کا پانی ہے۔ سینے پر اونٹ رہا ہے
 زمین آسمان تپ رہے ہیں۔ دن بھر آگ برستی ہے۔ رات بھر ریت برستی ہے۔ نیند غائب ہے۔ ناس
 کروت چین آتا ہے نہ اس کروت۔ نکھا ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ ذرا ہاتھ رکھا اور دم گھٹنے لگا۔ ذرا خدا
 خدا کر کے نیند آئی اور کھٹھل نے چٹکی لی۔ آنکھ کھل گئی اور پھر وہی مصیبت۔ بیگم صاحب کیوں نہ
 ہو۔ گرمی ہو۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے۔ نہیں تو ایسی بے نقطہ
 سناؤں گی کہ تمام عمر یاد رکھے گی۔" بڑھیا کی باتیں سن کر بی گرمی تو آگ لگ گئی۔ کہا "بھڑ بھڑ بھیا
 کیجیو تجھے اس بد زبانی کا کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ خبر نہیں۔ مجھے تو کیا سمجھی ہے۔ یہ کہہ کر جو چھوٹک رہی
 تو ایسا معلوم ہوا کہ لو لگ گئی۔ بڑھیا تو "ہائے مری" کہتی رہی۔ بی گرمی۔ پیو پر ایک دو ہتھیرا ماہ کر
 چلنی بنیں۔

جب ان کو کبھی روکھی صورت بنائے آتے یا برسات نے دیکھا تو دل میں بہت خوش ہوئیں اور کبھی
 چلو میں نے پالا مار لیا۔ بڑی شگفتی ٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور کہا "نانی جان سلام۔ کیسے مزاج تو اچھا
 ہے۔" بڑی بڈنے کہا "بابا! مار لو، مار لو۔ پھر مزاج پوچھنا۔ دو تو اپنے دل کی بھڑاس نکال گئے۔ تم کیوں
 لگی پٹی رکھتی ہو۔ بے دار نہ سمجھ لیا ہے جو آتا ہے۔ مار جاتا ہے۔" بی برسات نے کہا "نانی جان خدا نہ
 کرے میں کیوں مارنے لگی۔ وہ تو دونوں سوئے ایسے ہی ہیں۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے سجاری بڑی بی بک

مار مار پھین نکال دیا۔ نانی جان آپ بے خوف رہیے۔ میں ایسا بدلہ لوں گی کہ وہ دونوں بھی تمام عمر یاد ہی کریں گے۔ یہ سن کر ذرا بڑھیا کے حواس درست ہوئے۔ آنکھ اٹھا کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک جوان لڑکی نہائی دھوئی آب رواں کا دوپٹہ اوڑھے سامنے کھڑی ہے۔ کہنے لگی، لڑکی کیا دیوانی ہے جو اس طرح گیلے بالوں سے شام کے وقت جنگل میں آئی ہے۔ اور تیرا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں جو اس طرح اکیلی ماری ماری پھرتی ہے۔ جا۔ اپنے گھر جا کر بیٹھ۔ کیوں باپ دادا کا نام بڑنام کرتی ہے اور میں؟ تو تو بالکل سنگی ہے۔ جا۔ جا۔ دور ہو۔ میں تجھ جیسی لچی لقمہ داریوں سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی۔“

بی برسات نے کہا، نانی جان خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں برسات ہوں۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ برسات کیسی بڑھیا نے کہا، ”برسات خدا نخواستہ آپ بھی تعریف کے قابل ہیں۔ اے۔ ہے۔ تم سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجہ دہلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا وہ پاکھا گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا اس میں یہاں ٹپکانکا وہاں ٹپکانکا۔ کبھی ادھر کے بچھونے ادھر بچھو رہے ہیں۔ کبھی ادھر کا پلنگ ادھر آ رہا ہے۔ باہر نکلنا مشکل ہے۔ ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اوپر گئے۔ سواری پاس سے نکل گئی تو سب کپڑے چھینٹ چھینٹ ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیمچڑ میں پھنس گئیں۔ ہوا بند ہے۔ اونس ہو رہی ہے۔ کپڑے ہیں کہ چپے جا رہے ہیں۔ رات کو مچھر ہیں کہ کھلے جاتے ہیں۔ کھٹل ہیں کہ کائے جا رہے ہیں۔ نذرات کو نیند نہ دن کو چین۔ اور پھر اس پر یہ سوال کہ نانی جان میں کیسی ہوں۔ نانی جان سے تعریف سن لی۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ اے۔ ہے۔ یہ بے موسم کی گرج کیسی۔ خدا خیر کرے۔“ بڑھیا یہ کہہ ہی رہی تھی کہ بی برسات کی نگاہ بجلی بن کر گرمی اور بڑی بی کے پاؤں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ ادھر بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر منہ پر کھوک رخصت ہوئیں اور ادھر ان کی بہو اور بیٹا اشرافیوں کی کھٹی لینے کے شوق میں بڑ کے نیچے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بڑی بی پٹی کٹی لوتھ لوتھ پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے لاوڈ کر گھر لائے۔ خوب ہلدی چونا کھو پیا۔ مرہم پٹی کی، جب کہیں جا کر دس بارہ دن میں بڑھیا اس قابل ہوئی کہ اپنی کہانی بیان کرے۔ بہو اور بیٹے نے جو سنا کہ بڑھیا نے جاڑے گرمی برسات کو برا بھلا سنا کر اور اشرافیاں کھو کر جوتیاں کھائیں۔ تو ان دونوں نے بھی اس کو خوب

مادا اور گھر سے نکال دیا۔ اب بے چاری سرک کے کنارے بیٹھی بھیک مانگا کرتی ہے مگر ایسی
نک چڑھی کو کوئی بھیک بھی تو نہیں دیتا۔ بیٹا بات یہ ہے کہ اللہ شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے
جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ اور موعے رونی صورت تو ہمیشہ
جوتیاں ہی کھاتے ہیں۔

اے۔ ہے۔ ایلو۔ یہ احمد تو سو گیا۔ سعیدہ۔ ذرا اٹھا کر اسے پیشاب تو کرائے کہیں
ایسا نہ ہو موت کر میرے بچھونے خراب کر دے۔“

کمسنی کی شادی

میں اول ہی سے رشیدہ کی شادی کے خلاف تھا۔ بھائی جان کے سر ہوا کہ خدا کے لیے ابھی اس لڑکی کو شادی کی مصیبت میں نہ پھنساؤں۔ بھائی جان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ لہذا اس پرہ برس کی چھوکری کے حال پر رحم کیجیے۔ مگر میری کون سنتا تھا۔ بھائی جان کو ارمان نکالنے کا شوق تھا۔ رہے بھائی جان تو وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تھے۔ بھلا ان کے مقابلے میں میری کیا چلتی۔ آخر نکاح کی تاریخ ٹھہری گئی۔ میں نے ڈپٹی عابد حسین سے کہا کہ آپ اس شادی کو تھوڑے دن کے لیے روک دیجیے۔ ذرا دو لہا دلہن دونوں کو کچھ بڑا ہونے دیجیے۔ یا یوں نہیں تو نکاح کر لیجیے۔ وداع دو چار سال بعد کیجیے گا۔ مگر وہ سب نئے والے تھے۔ کہنے لگے 'میاں تم کیوں خواہ مخواہ بیچ میں کھڑت ڈالتے ہو میرا ایک ہی بچہ ہے۔ بڑھاپے میں پیدا ہوا ہے ناشاء اللہ چودہ برس کا ہے۔ ایفانے میں پڑھتا ہے۔ میں اب قبر میں پاؤں ٹسکائے بیٹھا ہوں۔ رہیں ان کی اماں تو وہ خود چل چلاؤ پر ہیں۔ اگر ہم دونوں نے محبوب کا سہرا نہیں دیکھا تو شاید ہم کو قبر میں بھی چین نہ آئے۔ اگر تم کو اپنی بھتیجی ایسی ہی عزیز ہے تو بھائی جواب دے دو۔ ہم محبوب کے لیے دوسری جگہ تلاش کر لیں گے۔ بڑے میاں نے یہ باتیں کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی کہیں کہ میں ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ اٹھ کر چلا آیا۔ میں نے تو خود ان کے ہی بھلے کو یہ باتیں کہی تھیں اور بڑے میاں کی بیوی نے ہماری بھائی جان کو کہلا بھجوا یا کہ مختار سے دیویر اس رشتے سے خوش نہیں ہیں پھر کیوں خواہ مخواہ اس رشتے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

یہ سننا تھا کہ بھابی جان کے تو آگ ہی لگ گئی۔ بھائی بان سے ایک ایک کی سوسو لگائیں نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سچی بات کہنے سے بھائی جان الگ بگڑ بیٹھے اور ڈپٹی عابد حسین علاحدہ تن گئے کہ یہی شخص فساد کی جڑ ہے اور خواہ مخواہ اس رشتے میں حائل ہو رہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈپٹی صاحب کی ذات ذمات بری ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے ہاں رشیدہ کو تکلیف ہونے کا مجھے ڈر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ محبوب اچھا اور نیک بخت لڑکا نہیں ہے۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ ابھی یہ لڑکی اور لڑکا شادی کے قابل ہی نہیں ہیں۔ بارہ برس کی لڑکی اور چودہ برس کے لڑکے کی شادی بھلا کوئی شادی ہوئی۔ گڑے گڑیا کا بیاہ ہوا۔ جب کبھی بھائی جان سے کہو وہ یہی جواب دیتی ہیں کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کی ایک خاص حالت کو جوان ہونا سمجھ لیا جاتا ہے اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ نہ تو ابھی اس کے جوڑ بند مضبوط ہوئے ہیں اور نہ اس کے اعضاء ابھی تکمیل کو پہنچے ہیں۔ نہ اس کی عقل ایسی پختہ ہوئی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کو سمجھ سکے یا گھر سنبھال سکے۔ بس غل مچا ہوا ہے کہ لڑکی جوان ہو گئی۔ اب اس کو کسی کے پلو سے نہ باندھ دیا گیا تو خدا معلوم کیا آفت پیا ہو جائے۔ یہ نہیں سمجھا جاتا کہ جس کے ساتھ اس کو باندھا جا رہا ہے اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اس نے ابھی تعلیم کی تکمیل نہیں کی ہے۔ اس میں بھی بردباری نام و نشان کو نہیں ہے۔ وہ ابھی اخراجات کے لیے دوسروں کا دست نگر ہے۔ بھلا ایسے بچے سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شادی کے تعلقات کو سمجھ سکے گا یا اپنی اور اپنی بیوی کی صحت کا خیال رکھ سکے گا یا آئندہ اپنی تعلیم جاری رکھ کر کھانے کمانے کے قابل ہو سکے گا۔

بہر حال میں نے ہزارہ طرح سمجھایا۔ میری ایک نہ چلی۔ بڑی دھوم سے شادی ہوئی دونوں مہمان داری ہوئی۔ ہزاروں کا جہیز دیا گیا۔ اور بی رشیدہ اور میاں محبوب میاں بیوی ہو ہی گئے۔ دونوں میں وہ ملاپ ہوا وہ ملاپ ہوا کہ خدا کی پناہ۔ ایک جان دو قالب تھے۔ جب دیکھو دونوں کے دونوں ایک دوسرے کے پاس جمے ہوئے ہیں۔ میاں محبوب نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ یار دوستوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آخر تھوڑے

ہی دنوں میں کالج جانا بھی چھوڑ دیا۔ بھابی جان خوش تھیں کہ میری بیٹی کو ایسا چاہئے والا شوہر ملا۔ بھابی جان خوش تھے کہ چلو بیٹی آرام چین سے ہے۔ ڈپٹی صاحب اور ان کی بیوی نہال نہال تھے کہ چاند جیسی بٹو اسی بہو گھر میں آئی ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ میاں محبوب کی لکھائی پڑھائی کا خاتمہ ہو گیا۔ بہو کی صحت نے جواب دے دیا۔ لڑکے کے توئے مضحمل ہو گئے اور جن باتوں کو میں ابتدا ہی سے رو رہا تھا ان کا دوہی مہینے میں ظہور ہو گیا۔

شادی کو شاید تین ہی مہینے ہوئے ہوں گے کہ مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی کہ بی رشیدہ پیٹ سے ہیں۔ میں نے بھابی جان سے پوچھا۔ انہوں نے پہلے تو ماننا چاہا لیکن آخر کو قبولیں۔ میں نے کہا۔ ”دیکھیے بھابی جان میں پہلے ہی آپ کو روکتا تھا کہ اللہ ابھی اس لڑکی کی شادی نہ کیجیے۔ ابھی اس کی عمر سی کیا ہے لیکن آپ نے ایک نہ مانی۔ خدا کرے ساتھ خیر و خوبی کے بی رشیدہ کے ہاں بچہ ہو۔ مگر یہ سمجھ لیجیے کہ تیرہ برس کی عمر میں اولاد ہونے سے اس بچاری کی صحت تیاہ ہو جائے گی اور اگر دو درم سے وہ سنبھل بھی گئی تو یہ بتائیے کہ اس عمر میں وہ بچہ کو کیسے پالے گی اور تربیت کیا خاک کرے گی۔ ابھی تو اس کی تربیت خود ہی پوری طرح نہیں ہوئی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں نے ان سے جو کچھ کہا تھا کیا اس میں کوئی بری بات تھی۔ مگر صاحب میری باتیں سن کر بھابی جان تو بگڑ ہی گئیں۔ کہنے لگیں ’نوح۔ میری رشیدہ کی صحت خدا نخواستہ کیوں خراب ہونے لگی، ہوگی اس کے برا چاہنے والوں کی۔ میری بیٹی تولاوں کی لال نبی بیٹھی ہے۔ ماشاء اللہ وہ صورت شکل اور ہاتھ پاؤں نکالے ہیں کہ نظر لگتی ہے۔ اب رہا بچہ ہونا تو میری بہن بی نظیر کے ہاں بارہ ہی برس کی عمر میں سعیدہ ہوئی تھی۔ لڑکی کو جوان ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ تمہاری طرح تھوڑی کہ بیس اکیس برس کی عمر ہے اور بارہ برس کے لونڈے معلوم ہوتے ہو۔ اب رہی تربیت تو بھئی ذرا میں بھی تو سنوں کہ بی رشیدہ کی تربیت میں کون سی کمی ہے۔ ماشاء اللہ کھانا وہ پکائے، گھر داری وہ کرے۔ سینا پر ونا اس کو آئے کیا یہ کچھ جاننے کے بعد وہ ایک پھونڈے کو بھی نہ پال سکے گی۔ اللہ کالا کھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہماری زندگی میں یہ دن دکھایا اور تم ہو کہ ابتدا ہی سے جو نہیں، نہیں کی زڑ لگائی ہے تو کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ بھئی مجھے تمہاری ایسی باتوں سے وہم ہوتا ہے۔ خدا کے

واسطے میرے سے تو تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ تم جانو اور تمہارے بھائی جانیں۔ ان سے تمہارا جو جی چاہے کہو۔ مگر مجھ سے اگر کچھ کہی ایسی باتیں کہیں تو یاد رکھنا کہ میں سرپیٹ لوں گی۔ لیجیے دیکھا آپ نے نیک صلاح کا نتیجہ۔ ہے یہ کہ کسی سے سچی بات کہنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے۔ بھابی جان سعیدہ کا پیدا ہونا تو بیان کر گئیں لیکن یہ نہیں دیکھا کہ بی سعیدہ کے پیدا ہونے کے بعد بی نظیر پر کیا گزری۔ بیماری زچگی کے بعد سے جو بیمار ہوئی تو دو برس کے بعد مری کر اٹھی۔ کون سی بیماری تھی جو اس غریب نے نہیں اٹھائی اور کون سی تکلیف تھی جو اس مرنے والی نے نہ سہی روپیہ پانی کی طرح بہ گیا۔ دنیا جہاں کے علاج ہوئے مگر اس کو نہ بچنا تھا نہ بچی۔ اب اس کی یادگار بی سعیدہ رہ گئی ہیں مگر ان کا کیا حال ہے۔ بالکل دھان پان ہیں۔ آج زلہ ہے تو کل بخار۔ آج پسلی میں درد ہے تو کل معدہ خراب ہے۔ غرض اس کے لیے تو جینا ویاں جان ہو گیا ہے۔ عمر پوری کرنی ہے وہ کسی نہ کسی طرح پوری کر رہی ہے۔ ذرا کوئی جھٹکا لگا اور اس کا بھی خاتمہ ہے۔ بہر حال اس روز سے میں نے توبہ کر لی کہ اب بی رشیدہ کے بارے میں کچھ کہوں تو جو چور کا حال وہ میرا حال۔

شادی کے نو مہینے کے بعد رشیدہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ مگر کس مصیبت سے ہوا یہ نہ پوچھو۔ بیماری کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مہینہ بھر تک یہ حال رہا کہ کوئی دن نہ ہوتا ہوگا جو ڈاکٹر اور میمیں نہ آتی ہوں۔ اور پچاس ساٹھ روپے روزانہ خرچ نہ ہوتے ہوں آخر خدا خدا کر کے لڑکی پلنگ سے اٹھی، لیکن صورت ایسی ہو گئی تھی کہ دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی۔ منہ پر دانت ہی دانت دکھائی دیتے تھے۔ چلتی تھی تو ہر قدم پر چکر آتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ موت کے منہ سے نکلی۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ غریبوں کو خیرات ہی۔ رشتے داروں کی دعوت ہوئی۔ ڈاکٹروں اور میموں کو تحفے دیے گئے اور سمجھے کہ چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔

رشیدہ کا بچہ صادق اتنا کا دودھ پیتا تھا مگر کسی طرح پیتا ہی نہ تھا۔ ہڈی سے چہرا لگ گیا تھا۔ دستوں کا جو سلسلہ لگا تو کہیں پندرہ بیس دن میں جا کر ختم ہوا۔ ادھر دست لگے اور ادھر بخار نے آیا۔ بیماری کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا۔ رشیدہ اور صادق کی حالت دیکھ کر

مجھ سے نرہا گیا اور میں نے پھر بھابی جان پر زور دیا کہ ان کو تھوڑے دنوں کے لیے بلا کر اپنے ہاں رکھو۔ جب ذرا پنپ جائیں تو بھیج دینا۔ بھابی جان بھی بچی کی حالت دیکھ کر اس پر راضی ہو گئیں۔ مگر رشیدہ کی سسرال والے کب ماننے والے تھے۔ ہزار ہزار زور دیا لیکن انھوں نے ناسے ہاں نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی اس بے چاری کو بیماری سے اٹھ کر تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ پھر حالہ ہو گئی۔ میں نے تو یہ خبر سنتے ہی انالٹھ پڑھ لی اور سمجھ گیا کہ اب کی دفعہ نبی رشیدہ کی خیر نہیں۔ پانچویں مہینے سے اس کی طبیعت بگڑنی شروع ہوئی۔ ہلکی ہلکی حرارت رہنے لگی۔ کھانسی کا بھی لگاؤ تھا۔ پہلے تو موسمی خرابی اس حرارت کا باعث سمجھی گئی۔ لیکن جب بخار نے بلندے کا نام نہیں لیا تو اس وقت بھاگ دوڑی شروع ہوئی۔ ڈاکٹر آتے، نسخہ لکھتے، فیس لیتے۔ چلے جاتے مگر بخار تھا کہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ بیس پچیس روز کے بعد معلوم ہوا کہ بخار اتر گیا۔ بھابی جان کی جان میں جان آئی۔ اچھا ہونے کے کوئی آٹھ دس روز بعد رشیدہ نے غسل صحت کیا۔ ہمارے ہاں آئی۔ پس کیا کہوں کہ اس کا کیا حال تھا۔ سوکھ کر نقات ہو گئی تھی پھونک مارو تو اڑ جائے۔ کہتی تھی کہ کیا بتاؤں دل بیٹھا جاتا ہے جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ کھانستی ہوں تو سینہ میں درد ہوتا ہے۔ بخار اترنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ درد جائے تو جانوں۔ دو تین روز ہمارے ہاں رہی تھی کہ سسرال والوں نے بلا بھیجا۔ جانے کو تو اس کا جی نہیں چاہتا تھا مگر لاچار جانا پڑا۔ جا کر کوئی آٹھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ پھر بخار نے آیا۔ اب کے بخار بھی ذرا تیز اور کھانسی بھی زیادہ تھی۔ سول سرجن کو بلا کر دکھایا۔ انھوں نے شش دیکھ کر کہا کہ میں بغیر خون کا امتحان کیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیر خون کا امتحان کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ خون میں دق کے جراثیم ہیں۔ گو ابتدائی درجہ ہے، مگر مرض بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ سنتا تھا کہ گھر بھر کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور جو سیدھا سیدھا علاج ہو رہا تھا۔ وہ بھی نارت گیا۔ کوئی کہتا حکیم کو دکھاؤ۔ کوئی کہتا وید کا علاج کرو۔ کوئی کہتا کہ نہیں جس طرح علاج ہو رہا ہے اسی طرح چلنے دو۔ غرض اس گڑ بڑ میں یہ ہوا کہ آج اس کا علاج ہے تو کل اس کا۔ آج حکیم کا نسخہ پیا جا رہا ہے تو کل وید صاحب کی گویاں کھائی جا رہی ہیں۔ آخر اس الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل کا بگڑا مریض آج بگڑ گیا۔ میں نے بہت کہا کہ اس کو دن پلے جاؤ۔ مگر ڈپٹی عابد حسین

کیا ماننے والے تھے۔ پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ کہنے لگے کہ "نہیں بھئی۔ میری بہو اور عیاشیوں کے ہاتھوں میں جا کر پڑے۔ تو بہ کرو۔ اور اگر بچوں بھئی تو اس کی خبر گیری کون کرے گا۔ میری یہ عمر نہیں کہ خود بدن پٹی جاؤں۔ اب رہے میاں محبوب، تو وہ ابھی بچے نہیں۔ ان سے کیا خاک بیمار کا رکھ رکھاؤ ہو سکے گا۔ اب جو قسمت میں لکھا ہے یہیں ہونے دو۔ ہائے۔ میں بھی کیا بد قسمت آدمی ہوں کہ ایسی خوب صورت اور سلیقہ مند بہو آئے اور دو ہی برس میں اس حال کو پہنچ جائے۔"

غرض بڑے میاں نے بہت کچھ محبت کی۔ بہت کچھ بسورے مگر بہو کو بدن پٹی بھیجنے پر راضی نہ ہوئے۔ ہر پھر کر یہی کہتے تھے کہ یہ مرض لاعلاج ہے کیوں اس غریب کو اس حالت میں تکلیف دی جائے۔ سمجھتے تھے کہ رشیدہ مرگئی تو دوسری بہو بیاہ لائیں گے۔ ان کا کیا جانا تھا۔ جانا تو سہارا تھا کہ پالی پوسی لڑکی ہانتہ سے جا رہی تھی۔ میں نے بھائی جان اور بھابی جان سے آکر کہا کہ آپ ڈپٹی صاحب پر زور دیجیے شاید راضی ہو جائیں۔ مگر وہ بڈھا اس بلا کا بنا ہوا تھا کہ لاکھ لاکھ سب سے، سر بٹخا اس کو نہ راضی ہونا تھا نہ ہوا۔ جب ادھر سے بالو سی ہو گئی تو سب راضی برضا ہو کر بیٹھ رہے۔ بھابی جان کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت روتیں اور آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی تھیں کہ اس کی آئی مجھے آنگے مگر اس سے کیا ہوتا ہے جس کی ہوتی ہے اس آتی ہے۔ ایک کی بیماری دوسرے کو آنگے تو دنیا کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو جائے۔

میاں محبوب کی یہ کیفیت تھی کہ بیوی کی پٹی جو بنا کر بیٹھے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ رات ہے تو جاگ رہے ہیں۔ دن ہے تو جاگ رہے ہیں۔ نرس نوکر تھی مگر سارا کام خود کرتے۔ دوا خود پلاتے۔ پکڑے خود بدلواتے۔ کھانا پلانا خود کرتے۔ یہاں تک کہ سر میں کنگھی خود کرتے اور چوٹی خود ڈالتے ہیں۔ نے منع بھی کیا کہ میاں محبوب اس طرح تم خود بیمار پڑ جاؤ گے۔ آخر نوکر، ماما میں اور میمیں ہیں کس کام کے۔ کام ان سے ہو۔ نگرانی خود رکھو۔ مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ سمجھتے تھے کہ محبت کے اظہار کا یہی موقع ہے اور واقعی اس سے رشیدہ خوش بھی بہت تھی۔ یہ جاننے کے باوجود یہی کہ اب میں جینے کی تو نہیں رہے۔

وقت مسکراتی رہتی اور میاں کی محبت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ ایک دن اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ صلاح ہوئی کہ کئی ڈاکٹروں کو بلا کر مشورہ کیا جائے۔ سول سرجن کو بلایا اور اس کے ساتھ مشورہ کرنے میں شہر کے پانچ چھ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو شریک کیا گیا۔ سب نے اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد یہی رائے دی کہ رشیدہ کا بچنا محال ہے اور بیماری کا اصل سبب اس کی کم عمری کی شادی ہے۔ اس کے اعضاء ابھی پوری طرح تکمیل کو نہ پہنچے تھے کہ ان پر ناقابل برداشت بار پڑا۔ اس لیے بجائے بڑھنے کے ٹھہر کر رہ گئے۔ اس پر ہونی اولاد۔ اعضاء میں جو کچھ تھوڑا بہت دم تھا وہ بھی نکل گیا۔ کمزوری میں ہر مرض زور کرتا ہے دق ہو گئی اور اب آخری درجہ پر ہے۔ ڈاکٹر تو یہ کہہ اور فیس لے رخصت ہوئے اور ہماری بھابی جان نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ مجھے بلوایا اور کہنے لگیں: "بھابی تو سچ کہتا تھا میرے شوق نے رشیدہ کو تباہ کیا۔ اب کیا کروں۔ وہ نہ رہی تو میں کیسے جیوں گی۔ کاش اس کی آتی مجھے آجائے؛ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کی یہ حالت ہو اور میں ان کی پہلی غلطیوں پر انھیں لکچر دینا شروع کر دوں میں نے یہ کیا کہ بڑی دیر تک بیٹھا ان کو سمجھاتا رہا۔ وہ بھیڑی روتی اور میری باتیں سنتی رہیں۔ آخر میں کہنے لگیں "سعید خدا کے لیے تو یہ کر کہ رشیدہ کا سارا قصہ شروع سے آخر تک لکھ کر چھپو ادے۔ شاید مجھ جیسی بیوقوفوں کو پڑھ کر عبرت حاصل کریں اور اپنی نازوں کی پٹی ہوئی بچیوں کا چھٹنے میں بیاہ کر کے ان کو تباہ نہ کریں۔ ارے۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں مرجاتی اور ساری عمر اس کی شادی نہ کرتی؛ میں نے کہا "یہ آپ دوسری غلطی کھائیں زیادہ عمر تک بچیوں کو بٹھا رکھنا بھی ویسا ہی مضر صحت ہے جیسا تھوڑی عمر میں شادی کرنا۔ خیر میں رشیدہ کا قصہ لکھے تو دیتا ہوں مگر مجھے امید نہیں کہ میری ہندوستانی بہنیں اس سے سبق حاصل کریں گی کیوں کہ بچوں کی شادی کا وہ شوق ہوتا ہے کہ ان کو اس وقت بھلا برا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ کم عمری میں شادی کر دیتی ہیں اور آخر میں پھپھکتی ہیں۔"

بھابی جان سے جو وعدہ میں نے کیا تھا۔ اسی کی تکمیل میں یہ مضمون لکھا ہے اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میری بہنیں اس سے سبق لینی ہیں یا پڑھ کر اور بھوٹا قصہ سمجھ کر "اونٹھ" کر دیتی ہیں اور کتاب کو اٹھا کر پھینک دیتی ہیں۔

انجمن صلاح حال بد معاشان

اب کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو یہ ایمان ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی نہیں جس میں ہر قسم کی برائی کا مادہ موجود نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ گرد و پیش کے واقعات سے بعض لوگوں میں یہ مادہ پرورش پاتا ہے۔ بڑھتا ہے۔ اور بالآخر نچتہ ہو جاتا ہے اور بعض کے حالات اس مادے کو سراٹھانے نہیں دیتے۔ دل میں برائی کا جوش اٹھتا ہے لیکن باہمی تعلقات ذاتی، وجاہت، خاندانی شرافت، غرض ایسی ہی بہت سی چیزیں مانع آتی ہیں اور اس ابال کو ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ آپ یقین مانیے کہ اگر مذہبی قیود، سماجی ذمہ داریاں اور ذاتی وقعت کا خیال لوگوں کے دلوں سے نکال دیا جائے تو آپ کو یہ جتنے شریف صورت انسان نظر آئے ہیں ان کے کارناموں سے شیطان بھی پناہ مانگے اور یہ لوگ وہ حشر بنا کر دیں کہ دنیا دوزخ کا نمونہ بن جائے۔ یہ تو شاید آپ بھی مانتے ہوں گے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ خطاب اس کو محض اس کی دماغی قوتوں کی وجہ سے ملا ہے۔ چونکہ شیطان اور اس کی ذریات یقیناً اشرف المخلوقات کے زمرے سے خارج ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کے سروں میں دماغ نہیں ہے اور جب دماغ ہی نہیں ہے تو وہ کسی طرح بھی سوچ سوچ کر وہ بد معاشیاں نہیں کر سکتے جو انسان کر سکتا ہے اور جو جو باتیں دماغ سے اتار کر یہ کر جاتا ہے۔ وہ فرشتہ تو کیا حضرت عزرائیل کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوتا ہے اگر واقعات کسی شخص کو نیک سے بد اور اچھے سے برا کر سکتے ہیں تو کیا واقعات کسی بد معاش کو نیک معاش بھی بنا سکتے ہیں۔ اس بارے میں

میری اور دنیا کی بعض قابل احترام ہستیوں کی رائے میں اختلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ چیز ممکن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ برائی کا مادہ پختہ ہو کر کوئی بیرونی اثر قبول نہیں کر سکتا۔ یہی وہ بحث ہے جس کے سلسلے میں اپنی زندگی کے بعض حالات لکھ کر میں آپ کی رائے کا طالب ہوں۔ مگر خدا کے لیے رائے ظاہر کرتے وقت آپ صرف واقعات کو دیکھیے اور اس کا خیال نہ کیجیے کہ ایک طرف تو ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس کی تمام عمر بدعاشیاں کرتے گزری ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی رائے ہے جن کی عزت دنیا میں ہر شخص کے دل میں ہے اور جن کے قول آپ حدیث اور آیت کے ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ وہ کیا طریقے ہو سکتے ہیں جو پختہ کار بدعاشیوں کو راہ راست پر لاسکیں اور ان کی اصلاح حال کر سکیں۔

اس سے غرض نہیں کہ میں کہاں پیدا ہوا اور کب پیدا ہوا۔ اس سے مطلب نہیں کہ میں کس خاندان میں پیدا ہوا۔ میرا نام کیا رکھا گیا اور میں نے اس ایک نام کے رفتہ رفتہ کتنے نام کر لیے۔ ہمارے گرد و پیش کے واقعات سمجھنے کے لیے بس اتنا جاننا کافی ہے کہ ہم پیدا ہوئے اور ایسے والدین کے ہاں پیدا ہوئے کہ جناب والد صاحب قبلہ سخت شرابی اور بے فکرے تھے اور ہماری اماں بالکل ابا بچ۔ گھر میں پہلے کچھ جمع پونجی ہو تو ہو۔ لیکن جب سے ہوش سنبھالا۔ ہم نے تو یہاں خاک ہی اڑنے دیکھی۔ ہم کو اب تک یہ معلوم نہیں کہ آخر گھر کا خرچ چلتا تھا تو کیوں کر چلتا تھا۔ آٹھ نو برس تک ہماری عمر لوندوں میں گریباں اور گلی ڈنڈا کھینے بدعاشیاں کرنے اور شہر بھر کے گلی کو چوں کی خاک چھلانے میں گزری۔ کوئی ہم دس برس کے ہوں گے کہ والد صاحب نے گھر کا خرچ چلانے کا آلہ ہم کو بنایا۔ یعنی چوری کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح ہم نے چوری کی۔ بسم اللہ سامنے کے گھر والے مولوی صاحب کے مرغے سے کی لیکن وہ مرغے بھی آخر مولوی صاحب کا مرغے تھا اور ہم نے اس پر ہاتھ ڈالا اور ادھر اس نے غل مچا کر سارے محلے کو جمع کر لیا۔ مولوی صاحب بھی باہر نکل آئے۔ مرغے کو ہماری بغل سے رہائی دلائی۔ ہمارے دو تین چپت رسید کیے۔ خوب ڈانٹا۔ ہماری اماں سے شکایت کی اور ڈرامے کا یہ سین ختم ہو گیا۔ ہماری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے کسی کو یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ ہم نے چوری کی نیت سے یہ مرغے پکڑا تھا۔ یہ سمجھے کہ جس طرح بچے جانوروں کو ستاتے ہیں

اسی طرح اس نے بھی کیا ہوگا۔ چلیے گئی گذری بات ہوئی۔ ہم روتے ہوئے اماں کے پاس آئے انھوں نے ہم کو ایک ایسی ترکیب بتادی کہ اب کہو تو سارے شہر کی مرغیاں پکڑ لاؤں اور کیا مجال ہے کہ ایک بھی ذرا چوں کر جائے۔ خیر وہ ترکیب بھی سن لیجیے۔ مگر لٹا اس پر عمل نہ کیجیے ورنہ یاد رکھیے کہ چوری کا جو مادہ فطرت نے آپ کو ودیعت کیا ہے اس میں ہیجان پیدا ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے آپ بھی ”مرغے چور“ ہو جائیں۔

یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ مرغی پر اگر پانی کی ایک بوند بھی پڑ جائے تو وہ سکر کر وہیں بیٹھ جاتی ہے اور چاہے مار بھی ڈالو تو آواز نہیں نکالتی اور اسی سے بھگی مرغی ”کا محاورہ نکلا ہے۔ فطرت کے مطالعے نے چوروں کو سکھا دیا ہے کہ مرغیوں کے چرانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کو کسی طرح گھبرا کر دیا جائے۔ وہ کیا کرتے ہیں کہ جہاں کسی مرغی کو اپنے موقع پر دیکھا اور چپکے سے گھبرا کر اس پر ڈال دیا۔ ادھر گھبرا کر اڑا اور ادھر وہ دکلی۔ انھوں نے اٹھا کر بغل میں دبایا اور چلتے بنے۔ اب مرغی ہے کہ آنکھیں بند کیے سکر کر ائی بغل میں دبی چلی جا رہی ہے۔ نہ کڑا کرتی ہے اور نہ منہ سے آواز نکالتی ہے۔ بہر حال یہ طریقہ سیکھ ہم نے سب سے پہلے مولوی صاحب کے مرغے ہی پر ہاتھ صاف کیا۔ اس روز بہت دنوں کے بعد ہمارے ہاں مرغ کا سالن پکا اور سب نے بڑے مزے سے اڑایا۔ مرغ کے بال وال سب گڑھا کھو کر گھری میں دفن کر دیے۔ بات یہ ہے کہ بچے کو جو چیز سکھائی جاتی ہے وہ جلد سیکھ جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہاتھ کی جالا کی دکھا کر لوگوں کو بتائے کہ ہم کسی کارروائی میں بڑوں سے دب کر رہنے والے نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی مرغیاں پکڑنے کا تانا باندھ دیا۔ شاید ہی کوئی منحوس دن ہوتا ہوگا جو ہم مرغیاں پکڑ کر نہ لاتے ہوں۔ کچھ دنوں تو یہ مرغیاں صرف ہمارے کھانے میں آتی رہیں۔ اس کے بعد ان کی تجارت شروع کی۔ یہاں کی مرغی پکڑی وہاں بیچ دی۔ وہاں کی مرغی لائے یہاں فروخت کر دی۔ غرض ہمارے بل پر گھر کا خرچ چلنے لگا۔ گھر کے خرچ سے جو کچھ بچتا وہ والد صاحب قبلہ مار پیٹ کر لے جاتے اور مفت کی شراب اڑاتے۔

اسی آوارہ گردی میں ہماری ملاقات ایسے لوگوں سے ہو گئی جو چوری میں مشاق تھے۔ ان

میں بعض ایسے تھے جو قید خانے کی ڈگریاں بھی حاصل کر چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی صحبت میں ہم کو مزہ آنے لگا۔ ہم اپنے کارنامے بیان کرتے رہ اپنے قصے سنتے۔ ہمارا شوق بڑھتا اور جی چاہتا کہ کچھ ایسا کام کر دو جو یہ بھی کہیں کہ ”واہ میاں صاحبزادے تم نے تو کمال کر دیا۔“ غرض ”بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا“ کے خیال نے ہم کو مرغی چور سے پکا چور کر دیا۔ پہلے جیب کترنے کی مشق کی۔ گندہ بروزہ مل کر انگلیوں کی کنگریں ایسی سخت کر لیں کہ مضبوط سے مضبوط اور موٹے سے موٹے کپڑے کو چپٹکی میں لیا۔ ذرا مسلا اور جیب ہاتھ میں آگئی۔ ہوتے ہوتے انگلیاں ایسا کام کرنے لگیں کہ قینچی بھی کیا کرے گی۔ جب اس میں کمال حاصل ہو گیا تو پھر قفل شکنی کی مشق بہم پہنچائی۔ قفل دو طرح سے کھولے جاتے ہیں یا کنجیوں سے یا تار سے۔ اب یہ چور کا کمال ہے کہ قفل کو دیکھتے ہی اپنے لچھے میں سے کنجی ایسی نکالے جو قفل میں ٹھیک بیٹھ جائے۔ اور تار کو اس طرح موڑ کر ڈالے کہ پہلے ہی چکر میں سب پتلیاں ہٹ کر کھٹ سے قفل کھل جائے۔ یہ کچھ خدا کی دین تھی کہ مجھے اس کام میں ید طولی حاصل ہو گیا۔ معمولی قفل تو درکنار چپ کے کارخانے کا قفل بھی میں ایک منٹ میں کھول دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے چور بھی میری خوشامد کرتے۔ سب سے بڑا حصہ دیتے۔ اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھے ساتھ لے جاتے۔ مگر میں سوائے قفل کھول دینے کے چوری سے کچھ غرض نہ رکھتا تھا۔ قفل کھولا اور چلا آیا۔ بار لوگوں نے چوری کا مال فروخت کیا اور میرا حصہ چپکے سے میرے پاس بھیج دیا۔ میرے ساتھی اکثر گرفتار ہوئے جیل گئے لیکن میرا نام کبھی عدالت کے سامنے نہیں آیا اور میں باوجود سینکڑوں وارداتوں میں حصہ لینے کے بچا رہا۔ ہوتے ہوتے میرے ہاتھ کی صفائی نے وہ نام پیدا کیا کہ مجھے شہر بھر کے چوروں نے اپنا سردار بنا لیا۔ کوئی بڑی واردات نہ ہوتی تھی جس میں مجھ سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو۔ کوئی بڑی چوری نہ ہوتی تھی۔ جس کا میں نقشانہ ڈالتا ہوں اور کوئی مقدمہ نہ ہوتا تھا جس میں میری ذمہ داری سے مدد لے کر ملزمین رہا نہ ہوتے ہوں۔ بڑے بڑے گھاگ جیب کترے میرا لوہا مانتے تھے اور بڑے بڑے دھاڑی چور میرے مشورے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالتے تھے۔

میری عمر کوئی اٹھارہ انیس سال کی ہوگی کہ اخبار ”حفاظت“ میں ایک اشتہار میری نظر

سے گزرا۔ بہارے ملک کے ایک بہت بڑے ادیب مسٹر مسعود نے لکھا تھا کہ ”میں ایک ناول لکھنا اور چوری کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس فن کا کوئی ماہر میری مدد کرے تو میں اس کو مناسب معاوضہ دینے پر بھی تیار ہوں۔“ آپ جانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے کارناموں پر فخر کرتا اور ان کو مشتہر کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے اور اس سے کوئی فرد بشر خالی نہیں ہے۔ خیر انعام و اکرام کا تو مجھے فکر نہ تھا۔ ہاں میرے دل نے کہا کہ ذرا ان صاحب سے حل کر لے اور دیکھو کہ ہیں یہ کتنے پانی میں۔ چوروں کے قصے لکھ لکھ کر یہ اتنے مشہور ہو گئے ہیں لیکن یہ جانتے بھی ہیں کہ چور کیسے ہوتے ہیں اور چوری کس طرح کرتے ہیں خطرہ ضرور تھا مگر میرے شوق نے مجھے اس قدر گھیرا کہ میں آخر شریفوں کی سی شکل بنا ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔ میرے خیال نے ان کا جو حلیہ قائم کیا تھا اس کے لحاظ سے میں سمجھتا تھا کہ یہ بڑی عمر کے تجربے کار آدمی ہوں گے۔ ولایت کے اہل ادب کی طرح لمبی داڑھی ہو گی۔ ڈھبیدا ڈھالالباس ہو گا۔ سر پر بڑے بڑے پٹھے ہوں گے۔ طوطے کی سی ناک ہو گی۔ اس کی نوک پر عینک دھری ہو گی۔ چند ہی چندھی آنکھیں ہوں گی۔ غرض ایسے ہوں گے اور ایسے ہوں گے۔ مگر جب یہ سامنے آئے تو میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت نوجوان سا شخص سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے آنکھوں میں ذہانت اور چہرہ پر مہمانت کے ساتھ شوخی۔ اور لباس میں سادگی کے ساتھ صفائی ہے۔ آتے ہی ہاتھ بڑھایا۔ اور کہا ”معاف کیجیے گا میں نے آپ کو نہیں پہچانا“ میں نے کہا ”میں آپ ہی کی طلبی پر حاضر ہوا ہوں۔ آپ ہم لوگوں کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں آپ کی اس خواہش کو پورا کر سکوں؟“ کہنے لگے کہ ”اوہ۔ آپ میرے اشتہار کے جواب میں تشریف لائے ہیں۔ ذرا ٹھیرے۔ میں ابھی اپنی موٹر لانا ہوں۔ ایسی باتیں کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ کہیں سو فٹے میں بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے ممکن ہے کہ ہماری یہ گفتگو دونوں کے لیے فائدہ بخش ہو؟“ وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ اور مجھے خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ حضرت مجھے گرفتار کر ادیں۔ پھر سوچا کہ مجھ پر الزام ہی کیا ہے جو میں ڈروں۔ اور ان کو میرے حالات ہی کیا معلوم ہیں جو مجھے کچھ اندیشہ ہو۔ اگر

گڑبڑ ہوئی بھی تو خود انھی کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میں یہ سوچ کر رہا تھا کہ وہ موٹر لے آئے اور میں ”ہرچہ باد بادا کشتی در آب انداختیم“ کہتا ہوا ان کے ساتھ سوار ہو گیا۔

موٹر فرارے بھرتی شہر سے گزرا آبادی کو پیچھے چھوڑا، جنگل میں سے ہوتی ہوئی ایک ندی پر پہنچی۔ مسٹر مسعود نے موٹر روکی۔ ہم دونوں اترے۔ چائے کا سامان نکالا گیا اور ندی کے کنارے دسترخوان بچھا کر ہم دونوں بیٹھے۔ اب کھاتے جاتے ہیں اور باتیں ہوتی جاتی ہیں۔ مسٹر مسعود نے کہا کہ ”معاف کیجیے۔ میں آپ کا نام نہیں جانتا اس لیے آپ کو گفتگو میں صرف ”مسٹر“ کہوں گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے حالات شاید اس کی اجازت نہ دیں کہ آپ اپنا نام کسی اجنبی شخص پر ظاہر کریں۔ اور اگر آپ نے ظاہر کیا بھی تو وہ یقیناً آپ کا اصلی نام نہ ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ صرف لفظ ”مسٹر“ سے ان تمام وقتوں کو رفع کیا جائے۔ اس سے تو آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ میں آپ کو ایسی جگہ لایا ہوں جہاں کوئی شخص چھپ چھپا کر ہماری باتیں نہیں سن سکتا۔ اور میں نے یہ صرف اس لیے کیا ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ میں آپ کے واقعات سننے میں کسی دوسرے کو شریک کر کے گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ اب ہم نہایت اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ آپ کا جو جی چاہے مجھ سے پوچھیے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر چیز صاف دلی سے بیان کروں گا اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میرے سوالوں کے جواب میں سچائی کا پہلو اختیار کریں گے اور اس طرح ممکن ہے کہ یہ صحبت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا دوست اور پکا دوست بنا دے۔

مسٹر مسعود کی آواز میں کچھ ایسا لہجہ، الفاظ میں کچھ ایسی شیرینی، لگاؤ میں کچھ ایسی محبت اور گفتگو میں کچھ ایسی دل چسپی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ تمام اندیشے ہوا ہو گئے۔ جو مجھ جیسے شخص کے دل میں پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے لازمی تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں کسی شخص کی وقعت قائم ہوئی۔ اور خود اپنے متعلق کبھی سمجھا کہ میں بھی آدمی ہوں اور ایک شریف آدمی بن سکتا ہوں۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مسٹر مسعود کو ابتدا ہی سے مجھ جیسے لوگوں سے ملنے کا شوق ہے اور وہ کوئی کتاب نہیں لکھتے جب تک اس کی بنا واقعات پر نہ ہو۔ ان کو بہت سے بد معاشوں نے دھوکے بھی دیے۔

اور دوستی کی آرٹ میں ان کو خوب لٹا۔ یہاں تک کہ کسی دفعہ تو خود ان کے گھر میں چوری کی اور مرزا یہ ہے کہ خود اس چوری کا حال ان سے بیان بھی کر دیا مگر اس اللہ کے بندے نے نہ کبھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ کبھی کوئی شکوہ و شکایت زبان پر لایا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اور تو اور خود میرے حالات سے پوری طرح واقف ہیں۔ انھوں نے اپنا حال کچھ اس طرح پھیلا یا تھا کہ کوئی واردات نہ ہوتی ہوگی جس کا رتی رتی حال ان کو نہ معلوم ہو جاتا ہو۔ اور کوئی مشہور چور یا ڈاکو ایسا نہ تھا جس کو وہ ذاتی طور پر نہ جانتے ہوں اور ضرورت کے وقت اس کی مدد نہ کرتے ہوں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ضرورت اکثر لوگوں کو چوری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ گرد و پیش کے واقعات جال بن کر ان کو اس طرح پھنسا لیتے ہیں کہ وہ جتنا نکلنا چاہتے ہیں اتنی ہی جال کی رستیاں ان کو کستی چلی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ کسی جیل خانے میں مکر رہ جاتے ہیں یا ضمیر کی ملامت کسی مرض میں مبتلا کر کے ان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

میرے مسعود جیسے شخص کے ساتھ دل کھول کر گفتگو نہ کرنا واقعی ظلم تھا۔ میں نے بھی اپنے اگلے پچھلے واقعات سب بیان کر دیے۔ چوری کرنے کی ترکیبیں بتائیں بقیہ کھونٹے کے طریقے بتائے۔ اپنے ساتھیوں کے قصے بیان کیے۔ غرض کوئی تین چار گھنٹے اسی قسم کی گفتگو میں گزر گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ اس لیے ہم دونوں اٹھے۔ شہر کے کنارے پر انھوں نے مجھے موٹر سے اتار دیا۔ دوسرے دن ملنے کا وعدہ لیا اور اس طرح ہم دونوں کی گفتگو کا سلسلہ کوئی مہینہ بھر تک چلتا رہا۔ انھوں نے مجھے معقول معاوضہ دینا بھی چاہا۔ لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے ”میرے اب معلوم نہیں کہ آئندہ ہمارا ملنا ہو یا نہ ہو لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ آپ کی صحبت میں جو مرزا مجھے آیا ہے وہ شاید ہی کسی کی صحبت میں آیا ہو۔ میرا ارادہ ہے کل یہاں سے چلا جاؤں گا اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ آج میری اور آپ کی آخری ملاقات ہے۔ قصے تو آپ نے بہت کچھ کہے اور مجھ سے بہت کچھ سنے۔ اب میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا ٹھڈے دل سے سوچ کر کریم صحیح جواب دیجیے۔ کیوں کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن پر میں اپنے ناول کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

یابہ خود لالچ میں آکر سرکاری گواہ نہ ہو جائیں۔ وہ خود چوری کے حاصل کیے ہوئے مال کو جلد جلد
ٹھکانے لگانا ہے کہ کہیں برآمد ہو کر اس کے جرم کا پتہ نہ دے۔ وہ اس جرم سے حاصل کیے
ہوئے روپیے کو نہایت بے دردی سے اٹھاتا ہے کہ کہیں دوسرے اپنا حصہ ختم کرنے کے بعد
اس میں پھر حصہ بٹانے نہ آجائیں اور حصہ نہ ملنے کی صورت میں مجبوری نہ کر دیں۔ غرض اتنا مال جو
اس کو مہینوں کے لیے روزی سے بے فکر کر سکتا ہے چند دنوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ مجبور
ہوتا ہے کہ چوری کے لیے کوئی اور جگہ تاکے۔ اور اس طرح اس کی ساری زندگی بے اطمینانی کا
ایک لامتناہی سلسلہ ہو جاتی ہے۔ ان کا تیسرا سوال گویا مقطع کا بند تھا۔ یعنی یہ کہہ کہ
”جس شخص کو چوری کا مرض پڑ گیا ہو اس کی اصلاح حال کی جاسکتی ہے؟“ اس سوال
پر میری اور ان کی رائے میں اختلاف ہو گیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مرض سخت ہو کر عادت ثانی
ہو جاتا ہے اور عادت ثانی کا چھڑانا ناممکن ہے۔ میں کہتا تھا کہ اگر ان لوگوں کی صحبت بدل
دی جائے تو وہ یقیناً درست ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں سینکڑوں
مثالیں دیں مگر افسوس ہے کہ میں ایک نظیر سے بھی ان کی تردید نہ کر سکا۔ لیکن میرا دل
کہتا تھا کہ تو جو کہہ رہا ہے وہ سچ کہہ رہا ہے۔ نظیر کیوں پیش کرے خود کر کے دکھا دے
کہ دیکھو چوری کی عادت اس طرح چھوٹ سکتی ہے۔ بہر حال کئی گھنٹے اس پر بحث ہوتی
رہی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہ اپنی رائے پر قائم رہے اور میں نے اپنی رائے نہ بدلی۔ رات کو
وہ تو ریل میں بیٹھ خدا جانے کہاں چل دیے۔ اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو
جائے۔ میں ثابت کر دوں گا کہ کتنا ہی بڑا چور کیوں نہ ہو راہ راست پر آ سکتا ہے۔

ہے یہ کہ جب انسان کوئی بات دل میں ٹھان لیتا ہے تو کر ہی گزرتا ہے۔ میں نے جو
اس روز سے چوری کا پیشہ چھوڑا تو وہ دن اور آج کا دن اس طرف رخ بھی نہیں کیا۔
آپ جانتے ہیں کہ کسی چور کا چوری چھوڑ دینا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے جتنے دوست
ہوئے ہیں سب دشمن ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اس طرح رنگ بدلنے میں
اس کی کچھ غرض ضرور ہے۔ اور ممکن ہے کہ مجربن کر یہ ہم کو بھنسان دے۔ اسی خیال
سے مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ پاس پیسہ نہیں تھا۔ بھیک مانگنے کو جی نہیں چاہتا تھا بیٹ

کی دوزخ بھرنا ضرور تھا۔ آخر یہ کیا کہ محنت مزدوری کرتا اور وطن سے دور ہوتا جاتا۔ ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ قفلوں کے ایک بڑے کارخانے میں ایک کاریگر کی ضرورت ہے۔ اسٹی روپیے تنخواہ ملے گی مگر انھی لوگوں کو درخواست دینی چاہیے جو قفلوں کی پتلیوں کو سمجھتے ہوں اور ان میں ایجاد کرنے کا مشورہ دے سکتے ہوں۔ مجھ کو آتا ہی کیا تھا اگر کچھ آتا تھا تو انھی پتلیوں کا الٹ پھیر۔ دل میں آیا کہ چلو یہاں قسمت آزمائی کریں۔ جیب جو ٹوٹی نوکر اینٹک پاس نہ تھا اللہ کا نام لے کر پیدل چل کھڑا ہوا۔ سو میل کا فاصلہ چار دن میں طے کیا۔ کارخانے میں پہنچا میری زدہ حالت دیکھ کر کسی نے ننھ نہ لگایا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جگہ بھر چکی ہے۔ کارخانے کی سڑھیوں پر سر کپڑے بٹھکے گیا۔ تھوڑی دیر نہ ہوئی تھی کہ خدا کی قدرت سے کارخانے کے مالک وہاں سے گزرے۔ مجھے سر کپڑے بیٹھا دیکھ کر وہیں ٹھہر گئے۔ مجھ سے پوچھا کہ ”آپ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔“ میں نے اپنے پیدل آنے کا قصہ بیان کیا۔ ان پر اس کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجھے لے کر کارخانے میں گئے۔ ایک بڑی تجوری رکھی تھی۔ کہنے لگے ”ذرا بتاؤ تو سہی کہ اس میں کتنی پتلیاں ہیں۔ ہمارے کارخانے کا دعویٰ ہے کہ اسے کوئی نہیں کھول سکتا۔ میں نے ان سے ایک موٹا تار مانگا۔ قفل کے سوراخ میں ڈال کر گھمایا۔ اور کہا کہ ”اس میں گیارہ پتلیاں ہیں اور اس کے کھولنے کے لیے دو کنجیاں چاہئیں۔ لیکن اگر آپ کہیں تو اسی تار سے میں اس کو کھول دوں۔“ میں نے تار کو ذرا موڑ کر دو چکر دیے۔ قفل کھٹ سے کھل گیا۔ یہ دیکھ کر تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے کہ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس میں اور کیا ترمیم کی ضرورت ہے جو قفل بغیر کسی کنجی کے نہ کھل سکے۔“ میں نے اپنے تجربے کے لحاظ سے ان کو پتلیوں کی ترتیب بتائی۔ یہ سن کر تو وہ ایسے خوش ہوئے کہ وہیں کھڑے کھڑے اسٹی روپیے پر مجھے نوکر رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے اتنی محنت سے کام کیا اور قفلوں میں وہ ایجادیں کیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ کارخانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ کر تین سو روپیے ہو گئی۔ دوسرے کارخانے والوں نے مجھے توڑنا بھی چاہا۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ جس شخص نے مصیبت میں میری مدد کی تھی۔ اس کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ غرض یہ کہ تمام ملک میں ہمارے کارخانے کی دھاک بیٹھ گئی۔ جب اس طرح

اطمینان ہو گیا۔ تو میں نے گھر بسانے کا ارادہ کیا۔ شادی بھی ٹھہر گئی لیکن عین وقت پر از غیبی گولہ پڑا۔

ہوا یہ کہ ہمارے شہر میں "چورا اور چوری" پر ایک لکچر کا اشتہار دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ چلو دیکھیں کہ یہ لکچر اور صاحب اس پیشے کے متعلق کیا جانتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔ وقت مقررہ پر جو میں جلسہ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہے۔ سینکڑوں اخباروں کے نمائندے فوٹو کے کیمے لیے موجود ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ان بھلے آدمیوں کو چوروں سے کچھ ایسی دل چسپی ہے جو اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ بہر حال چار بجے کے قریب مقرر صاحب تشریف لائے۔ ان کے خیر مقدم میں تالیوں کا وہ شور اور ہرے ہرے کا وہ غل ہوا کہ زمین آسمان ہل گئے۔ وہ بھی نہایت شان سے چبوترہ پر آئے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو یہ تو میرے پرانے دوست مسٹر مسعود ہیں۔ میں نے کہا: "لو بھئی اچھا ہوا۔ اب ان کو بتاؤں گا کہ حضرت مجھے دیکھ کر آپ اندازہ کیجیے کہ میں صحیح کہتا تھا یا آپ صحیح کہتے تھے۔ میں پہلے کیا تھا اور اب کیا ہوں۔ آخر میری اصلاح حال ہوئی یا نہیں۔"

خیر لکچر شروع ہوا۔ مسٹر مسعود نے چوروں کی ٹولٹیوں کے۔ ان کے رہنے سہنے کے، ان کے چوری کرنے کے۔ ان کے خیالات کے۔ غرض ان کی زندگی کے ہر پہلو کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا کہ دل خوش ہو گیا۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ واقعی مطالعہ زندگی اس طرح کیا جاتا ہے اور تجربات کو اس طرح بیان کرتے ہیں اپنے لکچر کے آخر میں انھوں نے وہی پرانی بحث چھیڑی کہ "جس شخص کو چوری کا مرض پڑ گیا ہو کیا اس کی اصلاح حال کی جاسکتی ہے۔" اور اپنی وہی پرانی رائے ظاہر کی کہ "یہ مرض سخت ہو کر عادت ثانی ہو جاتا ہے۔ اور عادت ثانی کا چھڑانا ناممکن ہے۔" لکچر ختم ہونے کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا اور میں سیدھا لکچر اور صاحب کے چبوترے پر پہنچا۔ انھوں نے مجھ کو ذرا غور سے دیکھا لیکن یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ کون شخص ہے۔ مجھ کو لکچر دیکھ دینا تو آتا نہیں۔ ہاں میں نے سیدھی سیدھی زبان میں کہا "موزع حاضرین! ہمارے کرم فرما مسٹر مسعود نے آخر میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی دریافت میں کوئی ایسا چور نہ ملا ہو، جو راہ راست پر آیا ہو۔"

لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ بد سے بدتر شخص کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ خواہ اس کو مسٹر مسعود مانیں یا نہ مانیں۔ ”میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ جلسہ میں غلچ کیا کوئی کہتا ”حضرت آپ کے دماغ کا علاج کرایئے۔“ کوئی کہتا ”آپ کی فصد لیجیے۔ غرض کیسا سنا اور کیسا سمجھا۔ ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو گیا۔ مسٹر مسعود تو سوار ہو کر چل دیے۔ اور مجھے اخبار کے نمائندوں نے گھیر لیا۔ بیسیوں فوٹو لیے گئے۔ ہزاروں سوالات کیے گئے۔ میں نے پوچھا ”بھائیوں“ یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر میں نے ایسی کون سی عجیب بات کہی ہے جو مجھے یوں دیوانہ بنا لیا ہے۔“ آخر بڑی مشکل سے ایک صاحب نے کہا ”حضرت معلوم بھی ہے کہ آپ نے کس شخص کی تردید کی ہے۔ مسٹر مسعود وہ شخص ہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں کی واقفیت کے متعلق تمام دنیا ان کا لوہا مانتی ہے۔ آپ کے سوا اس شہر میں تو کیا ساری دنیا میں کوئی نہ ہوگا کہ مسٹر مسعود ان لوگوں کے بارے میں کچھ فرمائیں اور وہ آنا اور صدقنا نہ کہے۔ خیر اور کچھ نہیں یہ تو ضرور ہوگا کہ ساری دنیا میں شہرت ہو جائے گی کہ آج بھرے جلسے میں ایک صاحب نے مسٹر مسعود پر اعتراض ٹھونک دیا۔“ میں پریشان تھا کہ یا میرے اللہ یہ عجیب بات ہے کہ یہ دنیا والے جب کسی کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں تو پھر اس کے خلاف کچھ سنا ہی نہیں چاہتے اور اس کی صحیح اور غلط ہر بات پر تسلیم جھکا دیتے ہیں۔

چار روز بھی نہیں گزرتے تھے کہ ملک کے سارے اخباروں میں اس جلسے کی کیفیت اور میری تقریر چھپ گئی۔ ہر اخبار میں میری تصویر تھی اور اس کے نیچے لکھا تھا کہ ”آپ فلاں شہر میں لوہار ہیں۔ اور چوروں کے اصلاح حال کے بارے میں مسٹر مسعود کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں“ غرض کوئی پرچہ نہ تھا۔ جس میں مجھے خوب نہ بنایا گیا ہو۔ اور میرا مذاق نہ اڑایا گیا ہو۔ جو پرچہ چھپتا اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی آتی۔ میں دیکھتا اور منہس کر خاموش ہو جاتا۔ لوگوں کی اس بے ہودگی کی تو مجھے پر دانہ تھی لیکن غضب یہ ہوا کہ یہ اخبار میرے قدیم ہم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پڑے۔ وہ پہلے سے میری تلاش میں تھے۔ اور پیشہ چھوڑنے کی وجہ سے مجھ سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ کیا کہ میرے سابقہ حالات اخباروں میں چھپوا دیے۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ جن صاحب نے مسٹر مسعود کی مخالفت کی ہے۔ وہ خود

بڑے دھاڑی چور ہیں۔ اور اس لیے ان کی رائے کسی طرح بھی مسٹر مسعود کی رائے سے کم وقعت نہیں رکھتی۔ ان حالات کا چھپنا تھا کہ سارے ملک میں اودھم مچ گیا اور جو عزت میں نے اپنی محنت کا رگزار سی اور دیانت سے حاصل کی تھی وہ سب خاک میں مل گئی۔ ایک دن ہمارے کارخانے کے مالک نے مجھے بلایا اور کہا "حضرت اب تمہارا یہاں رہنا میرے کارخانے کو تباہ کر دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ کہیں اور جا کر روزگار کی تلاش کرو۔ تم نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے اس کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مگر بھائی یہاں نام کو دیکھتے ہیں کام کو نہیں دیکھتے۔ اب تمہارے اصلی حالات لوگوں کو معلوم ہو گئے ہیں۔ جہاں کوئی واردات ہوئی اور پولیس والوں نے تم پر یورش کی۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تم سے زیادہ ایمان دار شخص سارے شہر میں ملنا مشکل ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ بد بھلا اور بدنام برا۔ یہاں بروں کو چھوڑ دیتے ہیں بدنام لوگوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ پولیس اور تمہاری کش مکش میں کارخانہ بدنام ہو جائے گا۔ تم نے شادی کے لیے روپیہ جمع کیا تھا وہ میرے پاس موجود ہے۔ شادی تو اب وہ لوگ کرنے ہی کیوں لگے۔ اب بہتر یہی ہے کہ یہ روپیہ لو۔ کچھ روپیہ بطور صلہ کارگزار ہی میں دیتا ہوں۔ وہ لو۔ اور کہیں دور دراز مقام پر جا کر کاروبار پھیلاؤ۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن اب تمہارا میرے ہاں رہنا ذرا مشکل ہے۔"

میں خود سمجھتا تھا کہ اپنے ساتھ اس غریب کو پینا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے صرف وہ روپیہ لے کر جو میں نے اپنی محنت سے کمایا تھا اس شہر کو چھوڑا اور سیدھا وہاں گیا جہاں مجھے اخباروں سے معلوم ہوا تھا کہ مسٹر مسعود لکچر دینے والے ہیں۔ لوگوں سے پتا پوچھا اور رات کے بارہ بجے چوروں کی طرح دروازہ کھولتا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا جو نہی میں نے ان کے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "اوہ۔ آپ ہیں۔ مجھے آپ کا کئی روز سے انتظار تھا۔ بندہ خدا اس روز تم کو اس طرح دخل در معقولات دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر کچھ کہنا تھا تو مجھ سے آکر ملنے۔ میرا مطلب سمجھتے۔ مجھ سے حجت کرتے مجھے قائل کرتے۔ آخر اس طرح بھرے جلسہ میں تڑپ سے اعتراض کرنے سے تمہاری کیا غرض تھی بھلا ممکن تھا کہ میرے مقابلے میں تمہاری کوئی سنتا۔ اور تمہاری کسی سچی بات کی قدر کرتا۔ اس عجیب و

غریب دنیا میں بعض لوگوں کی وقعت قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں۔ ان کے لیے سب جائز ہے اور ان کے خلاف جو کوئی کچھ کہے وہ مردود ہے۔ نامعقول ہے کافر ہے۔ اچھا بیٹھو، کھڑے کیوں ہو۔" میں غصے میں بھرا ہوا گیا تھا مگر اس شخص کی نرم نرم باتوں نے سارا غصہ اتار دیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا "مسٹر مسعود، خیر جو مصیبت مجھ پر تمہارے لکچر سے پڑی ہے اس کو تو جانے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ بد معاشوں کے اصلاح حال کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ کیا میں نے اپنے طرز عمل سے ثابت نہیں کر دیا کہ برے سے برا شخص بھی اچھا بن سکتا ہے اور تم ہو کہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے چلے جاتے ہو۔ اب تم ہی ایمان سے کہو کہ تم سچے ہو یا میں سچا ہوں۔" مسٹر مسعود میری بات سن کر ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ۔

"واہ بھئی واہ تم نے میرا مطلب خوب سمجھا۔ حضرت میں نے یہ تھوڑی کہا تھا کہ کسی بد معاش کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ ایسے لوگوں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اگر وہ لوگ خود اپنی اصلاح کرنی چاہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ چنانچہ خود تمہارا معاملہ اس کا عملی ثبوت ہے۔ یقین مانو کہ میں تو کیا چیز سوں اگر ساری دنیا کی قوت تم کو راہ راست پر لانا چاہتی تو کبھی نہ لاسکتی۔ ہاں تم نے خود اپنی اصلاح کرنی چاہی اور اصلاح ہو گئی۔ میں تو ہر جگہ یہی کہتا ہوں کہ جیل خانوں وغیرہ میں جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے لکچر دینے کے جو طریقے، ان کو ازکان مذہب پڑھانے کے جو قواعد، ان کو کارآمد پیشے سکھانے کا جو رواج ہے۔ وہ سب بے کار ہے۔ جو لوگ سنبھلنا چاہتے ہیں وہ خود سنبھل جاتے ہیں اور جو نہیں سنبھلنا چاہتے ان کو نہ کتنی فوج والے سنبھال سکتے ہیں اور نہ آپ کا کوئی مبلغ" ان کی یہ گفتگو سن کر میرا دل خوش ہو گیا اور میں نے کہا "مسٹر مسعود، خدا کی قسم آپ نے میرے دل پر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا۔ مجھے نوکری جانے یا آوارہ ہو جانے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ رازق ہے یہاں نہیں کہیں اور نوکری مل جائے گی مگر خیر یہ ثابت ہو گیا کہ اگر آپ غلط نہیں کہتے تھے تو میرا کہنا بھی کچھ غلط نہ تھا۔ اچھا خدا حافظ!" میں یہ کہہ کر اٹھنا چاہتا تھا کہ انھوں نے میرا ہاتھ مکرپڑ لیا اور کہا کہ "واہ حضرت، خوب چلے۔ بڑی مشکل سے تو مجھے ایک کام کا آدمی ملا ہے۔ اب میں جانے تھوڑی دیتا ہوں۔ آپ کو میرے ساتھ مل کر کام کرنا ہو گا اور ہم دونوں یہ بات معلوم کرنے کی

کوشش کریں گے کہ جو لوگ راہِ راست سے ہٹ گئے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ کیوں کر ڈالا جاسکتا ہے کہ وہ خود اپنے اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوں۔ کیوں کہ اس وقت جو طریقے رائج ہیں ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کو سود مند کہا جاسکے یا جس نے کوئی مفید نتیجہ پیدا کیا ہو۔ اس واقعہ کو دو سال ہو چکے ہیں۔ میں اور مسٹر مسعود اس بارے میں مختلف تجربے کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کو یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ ہمارے بنائے ہوئے راستے پر چلی تو کم سے کم تیس فی صدی بد معاشوں کا راہِ راست پر آجانا ممکن ہے۔ یہ تجربے عنقریب ایک کتاب کی صورت میں پبلک کے سامنے آنے والے ہیں۔ اور ہم پبلک سے توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی ہم کو اصلاحِ حال بد معاشوں کے متعلق مشورہ دے تاکہ ہم آزمائش کر کے دیکھیں کہ وہ مشورے بکار آمد ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے اپنے حالات کا یہ خلاصہ لکھا ہے۔

اصلاح سخن

کے متعلق

میرے خیالات

مثل شہور ہے کہ ”ناؤکس نے ڈبوئی۔ خواجہ خضر نے“ اس مثل کو واقعات کی شکل میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”ہماری شاعری کا بیڑا کس نے غرق کیا۔ استادوں نے“ بھلا آپ ہی غور کیجیے کہ شاعری کو استادی و شاگردی سے کیا مطلب ایک شخص ہے کہ دلی جوش سے کچھ لکھنا ہے، واردات قلبی کو الفاظ میں ادا کرتا ہے، آپ بیتی دلی درد کے ساتھ دوسروں کو سنا ہے اور استاد صاحب ہیں کہ ٹھنڈے دل سے اس پر اس سرے سے اس سرے تک قلم پھیر دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ وہ استاد ہیں۔ ان کا حق ہے کہ اصلاح دیں ان کا فرض ہے کہ باپ دادا کی سنت پر شاگرد کو چلائیں۔ اگر مانے تو اس کی شاعری کو میر اور سودا کی پرانی شاعری کا نمونہ بنا دیں اگر نہ مانے تو ”نالائق“ کہہ کر شجرے سے اس کا نام نکال دیں۔

خدا جانے ہم لوگوں پر کیا خدا کی مار ہے۔ اور غلام بننے کا شوق کیوں ہمارے دلوں پر ایسا مسلط ہو گیا ہے کہ کسی بھاری بھر کم نام کا سہارا لیے بغیر ہم کو میدان میں آنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اندھے نہیں ہیں پھر بھی سکرطی کا سہارا لیے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتے۔

دل میں جوش، دماغ میں سلاجیت اور قلم میں قدرت ہے مگر پھر بھی مدد لیے بغیر اس کو ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ عاشق ہیں مگر صحرا نوردی تو کجارات کے وقت گھر سے نکلنے

دم پر بن جاتی ہے۔

مجھ میں نہیں آتا کہ اس استاد دی و شاگردی کے سلسلے نے ہم لوگوں میں ایسی جڑ کیوں بکڑی ہے ساری دنیا دیکھو ڈالو کہیں نہ دیکھو گے کہ ایک شاعر کے جوش کا خون دوسرا شاعر کڑے اور وہ اس کا منہ نہ نوچ لے استاد شعر کے معنی میں زمین آسمان کا فرق کر دے اور بیچارہ شاگرد دم نہ مارے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں ہمت نام کو نہیں رہی ہے۔ اعدا انہوں سے ہم ڈرتے ہیں۔ علم حاصل کیے بغیر شاعر بن جاتے ہیں۔ دوسروں سے مقابلہ کرنے کو جتنوں کی شکل میں میدان میں آنا پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ادھ کے رہتے ہیں نہ ادھ کے۔ استاد دی و شاگردی کی زنجیریں ہم کو سستی پٹی جاتی ہیں ہم بندشوں سے نکلنا پاتے ہیں۔ مگر جہاں استاد و ہم کو گیسٹنگ پھر اسی دائرے میں لے آتے ہیں۔ ہمت مضمون بنا نہ سنا پاتے ہیں مگر جہاں استاد پھر ہم کو پرانی ڈگر پر لٹا دالتے ہیں۔ ہم زبان کو وسعت دینا پاتے ہیں مگر جہاں استادوں کی اسلحہ میں ہم کو اٹھنی پرانے اور دقیقہ نوسی الفاظ و خیالات کی بھنوں میں پھنسا دیتی ہیں اور استاد و استاد اور پردہ استاد کی پیروی ہم کو ایک پتہ آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ اور ہم زمین پر لے ٹھیلے بیٹھے مانجھا کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ ہماری شاعری ہمارے زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس سلسلہ استاد دی کو نہ کاٹ دیا جائے اور جب تک بے استاد کافی کی سرحد سے نکل کر تعریف کے احاطے میں نہ آجائے۔

اس مزمن مزمن سے نجات پانے کی بس دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ بہ شاعری کر دہنستے تو بے اور پچھے دل سے تو بے کرنے۔ دوسرے یہ کہ ایسا کوئی چکر ڈال جائے کہ کسی استاد میں اتنی ہمت نہ رہے کہ کسی کو اپنا شاگرد بنا سکے۔ پہلی شکل کا پھنسا کس قدر مشکل ہے کیوں کہ آج کل سے ہر بولہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل ہنہ گئی!

لے برادہ کر مونی صاحب اس مضمون کو اپنے سے منسوب نہ فرمائیں اس میں برائے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو یقیناً شاعر نہیں ہے اور اس لیے نہ وہی نہیں ہے کہ شاعری کے متعلق اس کی رائے باوقوت ہو۔ علاوہ انہیں یہ ایک ذاتی رائے ہے اور محض ایک خیال۔ اور خیال کو غلط ہی جوتاتے۔
(مصنف)

کا دور دورہ ہے۔ ہر شخص خواہ کچھ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اس میں شعر گوئی کا مادہ ہو یا نہ ہو شاعر بننے کو تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بواہوسوں میں اتنی ہمت کہاں کہ کسی موٹے تازے استاد کا مہار ایسے بغیر میدان میں اثر میں اس لیے اس سلسلے کو چھوڑو۔ اب دوسری شکل کو بوز بظاہر یہ کام بھی دشوار نظر آتا ہے۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ کوئی معنی کی مٹھائیاں کھانی چھوڑ دے جنہیں بھروانی چھوڑ دے مٹھائیوں میں اپنی تعریفوں کے پل بندھوانے چھوڑ دے یا یوں کہو کہ شاگرد بنانا چھوڑ دے۔ ہاں یہ مشکل یوں آسان ہو سکتی ہے کہ ان قلعوں پر باہر سے حملہ کیا جائے اور اس طرح ان استادوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ دنیا میں غیرت بھی کسی چڑیا کا نانا ہے۔ اگر یہ بات یہ اہو گئی تو سمجھ لو کہ بیڑا پار ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مولوی عبدالعلی صاحب شوق نے اس استاد کی شاگردی کی مضبوط عمارت پر پہلی کدال بجاتی ہے۔ اب یہ خدا ہی کو معلوم ہے یہ کام انہوں نے سوچ سمجھ کر اس ارادے سے کیا ہے یا محض کتاب چھاپ کر پیسے جمع کرنے کو نیچے کچھ سہی ہو۔ اس کا جو نتیجہ ہو گا اس کے متعلق مجھے اس وقت ایک بہت پرانی حکایت یاد آگئی ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ ہمارے شہر کے بے وقوفوں کی ایک فہرست تیار کرو۔ وزیر نے کئی مہینے میں ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست بنا کر بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کی۔ بادشاہ جو دیکھتے ہیں تو فہرست میں سب سے پہلے انھی کا نام ہے کہنے لگے کہ "ہیں۔ یہ کیا؟ وزیر نے عرض کی کہ "یہاں پناہ نے فلاں سوداگر کو گھوڑے خریدنے کے لیے کئی لاکھ روپے بلا کسی ضمانت کے دے دیے۔ اس سے زیادہ بے وقوفی اور کیا ہو سکتی ہے۔

بادشاہ نے کہا "اور جو وہ سوداگر گھوڑے لے آیا تو پھر کیا؟" وزیر نے کہا کہ "اس وقت حضور کا نام کاٹ کر اس سوداگر کا نام یہاں لکھ دوں گا۔" تو ہاں میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ شوق صاحب نے پسند ا خوب تیار کیا ہے۔ اب دیکھیے یہ استادوں کے گلے میں ٹھیک بیٹھتا ہے۔ یا شاگردوں کی گردن میں۔ نیز کسی کا خاتمہ ہونے کا نتیجہ حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر اس طرح کے دو چار ہمت والے کدال پھاڑنے لگے کہ اس عمارت کے پیچھے پڑ گئے تو تھوڑے ہی دنوں میں یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور غلامی کا جیل خانہ اڑاڑا دم کر کے ایک دفعہ ہی زمین پر آ رہتا ہے۔

صفر صاحب مرزا پوری نے بھی یہ رنگ ڈالا۔ مگر وہ پھیکا تھا اس لیے چل نہ سکا اور

بہت سے لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ یہ استادوں پر درپردہ حملہ ہے یا کیا۔ بلکہ بعض حضرات کو تو یہاں تک شبہ ہوا ہے کہ یہ واقعی اصلاحیں ہیں یا محض ایجاد بندہ۔ ظاہر ہے کہ وہ کچھ ایسا بڑا یا مشکل کام بھی نہیں تھا چاہے تو مجھ جیسے بھلے مانس کو کسی بڑے سے بڑے شاعر کا دیوان دے کر دیکھ لو کہ سارے دیوان کو ایسی اصلاحوں سے بھر کر رکھ دیتا ہوں یا نہیں کسی شعر کو ایک دو لفظ بدل کر لکھ دیا کہ یہ شعر پہلے یوں تھا پھر دیوان کا اصلی شعر لکھ دیا کہ استاد کی اصلاح سے یوں ہو گیا۔ تھوڑی بہت استاد کی تعریف اور واہ واہ کر دی۔ نوٹ میں کسی کے خط کا حوالہ دے دیا۔ بیچے آدمی صاف بھر گیا نہ کوئی ان اصلاحوں کی تنقید کر سکتا ہے اور نہ ان خطوں کی سحت کی تلاش اگر کسی کو اتنی فرصت ہوتی تو وہ مشاطہ سخن کے حوالوں کی جستجو کرنے کی بجائے اہلو و ایسا کن بٹالہ کے میرے کے سرے کے صداقت ناموں ہی کی کیوں چھان بین نہ کرتا کہ مفت میں دس ہزار روپے انعام مل جاتا۔ مگر یہ کس سے ہو سکتا ہے کہ بٹالے جائے۔ ان ساٹھ فیگٹوں کو دیکھے، دیکھنے والوں سے تصدیق کرائے جب کہیں جا کر کوئی غلطی پکڑی جائے اور انعام ملنے کی کوئی صورت نکلے پنچاں چہ دیکھ بیچے کہ دنا دان میرے کے سنے کا اشتہار چھپ رہا ہے کمپنی والے مزے میں روپے کا سودا پہلے تک سے لے رہے ہیں اور ہندوستان بھر میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں نکلتا کہ ذرا ہاتھ پاؤں بلا کر اس دھوکے کو غلط ثابت کرے۔ خیر یہ تو ایک لمبا سا جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ مصنف صاحب نے مشاطہ سخن لکھ کر اس قصہ کہنہ پر پہلا ہاتھ مارا تھا۔ مگر وہ ذرا اوجھا پڑا۔ دوسرا ہاتھ شوق صاحب کا ہے اور واقعی بھرپور پڑا ہے۔ اگر استادان فن نے "نگاہ عبرت" سے اس کو دیکھا تو کہتے کہ یہ تو ہو گا کہ مرض "استادیت" میں تھوڑا بہت افاقہ ضرور ہو جائے گا۔ یہ تو جرح و رکبیں گے کہ ان بے چارے استادوں کے خطوں کا چھاپنا اور پھر ایک کی غلطی دوسرے پر ظاہر کر کے دونوں کو لڑا دینا ذرا شاگردیت کے خلاف ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ مرض کو دفع کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی نسخہ ملنا بہت دشوار ہے۔ اگر کوئی روپے والے صاحب اتنا کریں کہ ان استادان فن کو ریل کا کرایہ دے کر ایک جگہ جمع کر دیں اور پھر پالی میں انہیں غلطیوں کا وازہ پھیلا کر مقابلہ کرا دیں تو انشاء اللہ آدھے استاد تو وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔

اب رہے باقی آدھے تو وہ اس بزرگ غظیم میں ایسے بال و پر شکستہ ہو جائیں گے کہ شاگرد بنانے کی بہت خود ان میں نہ رہے گی۔ اور اگر کسی میں رو بھی گئی تو نشاط سخن اور اصلاح سخن کی تیسری جلد تنفیہ سخن نکل کر ان کا بھی خاتمہ بالآخر کر دے گی۔ ترکیب تو نکل آتی ہے۔ اب اس پر عمل کرنا یہ نہ کرنا ان صاحبوں کا کام ہے جو زبان اردو پر جان دیتے ہیں اور اس کو سارے ہندوستان کی زبان بنا نا چاہتے ہیں۔

خیر ان باتوں کو تو چھوڑیے۔ اب یہ دیکھیے کہ مولانا شوق نے اپنی اس جدید تالیف کا سلسلہ کیوں کر ڈالا۔ یہ خود شاعر ہیں اور خانے چمے شاعر ہیں ایک شاعرانہ خیال ان کے دل میں آیا۔ چند غزلیں لکھ کر ہندوستان کے مشہور استادوں کی خدمت ایک ہی ڈاک سے روانہ کیں۔ وہاں سے یہ غزلیں جس جس طرز میں منع ہو کر آئی ہیں بس دیکھنے ہی کے قابل ہیں۔ ایک صاحب نے تو غزلیں کی اصلاح کے ساتھ تخلص میں بھی اصلاح کر دی اور شوق کو ماحصل بنا دیا۔ وجہ یہ نظر نہ دیا کہ پہلے زمانے میں بہت سے شوق گذرے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے شاگرد کا کلام تمہیں کران مانے والوں کا حصہ ہو جائے۔ اصلاح تو اچھی اور بہت اچھی ہے۔ لیکن اس کے ایک فائدے کو شاید نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یعنی ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ پرانے شوقوں کا کچھ کلام نہ شوق کے حصہ میں بھی آجائے۔ اور سائل بن جانے کی وجہ سے اس "فتوح نبوی" سے ہاتھ دھونا پڑے۔ دوسرے استاد مٹھانی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اور سچ بھی ہے۔ مٹھانی بغیر نہیں کوئی شاگرد بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آج اس کو جائز کر دیا تو کل مہر کا بغیر نکاح ہونے لگیں گے تیسرے استاد صاحب خود ہی اصلاح دیتے ہیں اور خود ہی اصلاح پر وارد کر کے فرماتے ہیں۔ "کہ بعض اشعار میں بلا ضرورت اصلاح دی ہے۔ مگر فنسور اصلاح نہیں دی ہے۔ آپ غور کریں گے تو لطف آئے گا۔" آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بد ضرورت بھی اصلاح کی ضرورت بعض وقت استادوں کو پڑتی ہے اور یہ وقت اس لیے کہ استاد ہی کا رعب قائم ہو اور کہیں خدا نخواستہ شاگرد یہ نہ سمجھ لے کہ میں خود استاد ہو گیا۔ چونکہ صاحب ان سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے ہیں اور تمام دنیا کے استادوں کے کلام کو قابل اصلاح سمجھ کر فرماتے ہیں کہ "بیشک کلام ہمیشہ ناقص رہتا ہے اساتذہ کے کلام میں گنجائش

اصلاح پائی جاتی ہے۔۔۔ اس پر پانچویں صاحب نے بے چارے غالب کو بھی چلتے چلتے ذرا ٹھکرا دیا ہے۔ شوق صاحب کا شعر تھا۔

بے جا ہے ہزاران کا شکوہ یہ کون کہے بجا نہیں ہے

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ”یہ بالکل متعقد تھا۔ ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ مرزا غالب

کا یہ شعر ہے

زخم گردب گیا ہونہ تھا کام گر رک گیا روانہ ہوا

میں نے اس کا محل بدل کر صاف کر دیا ہے اور اب یہ محل ندرت سے خالی نہیں ہے۔

اصلاح کے بعد شوق صاحب کا شعریوں ہو گیا ہے۔

چند بجا ہے ان کا شکوہ کچھ بھی یہ گلا بجا نہیں ہے

کاش غالب مرحوم کے شعر میں بھی اسی قلم ندرت۔ قیمت کچھ اصلاح فرما کر غالب پرستوں

کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا جاتا۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان استادان فن نے اپنے

شاگردوں کو یہ مشورہ کیوں دیا ہے کہ تھوڑے دنوں کے لیے ہمارے پاس آ جاؤ ورنہ پکے شاعر

ہو سکو گے۔ کوئی تو اپنے شہر کو رشک پر سر بتا کر اس بے چارے شاعر کو گھسیٹنا چاہتے ہیں اور

کوئی یہ فرماتے ہیں کہ یہ ”کوشش ہونا چاہیے کہ انسان فارغ از اصلاح ہو اور یہ بات

بغیر ملاقات ناممکن یا قریب الممتنع ہے“ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کوئی ایسی دوائے تیز یا زہر

قاتل ہے کہ اردو شاعری کے یہ ڈاکٹر اپنے سامنے اس کو پلانا چاہتے ہیں تاکہ بیمار پر نظر رکھ

سکیں اور زہر کے اثرات کو دیکھ سکیں۔ ایک صاحب نے شوق صاحب کو بلانے کی وجہ یہ

بیان کی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو مشاعرے میں لے جانا چاہتے ہیں اور جس طرح میونسپل کمیٹی

کی ممبری کے ووٹ خریدے جاتے ہیں اس طرح ”کرا یہ آمد و رفت“ اپنے ذمے لے کر ایک

صحبت مشاعرہ میں اپنے ہوا خواہوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ کئی استادوں

نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اصلاح کے ساتھ ان کے کلام کا بھی ورد رکھا جائے ورنہ شاعر بننا ممکن نہیں

اور اس سلسلے میں اپنے دیوانوں کے نام ان کی قیمت اور ان کے ملنے کا پتا بھی درج کر دیا ہے

تاکہ تلاش میں زحمت نہ ہو ایک شاگرد اپنے استاد کی طرف سے شوق صاحب کے خط کا جواب دینے بیٹھتے ہیں لیکن اپنی طرف سے کبھی کچھ بڑھا جاتے ہیں۔ اور اپنے کمیشن ایجنٹ ہونے اور ایک نیو پریچر جاری کرنے کا ذکر کر کے طالب امداد ہوتے ہیں۔ ایک استاد صاحب کو اپنے دیوان طبع کرانے کا شوق ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کل کے زمانے میں دیوانوں کو کون پوچھتا ہے۔ اس لیے اس کی طباعت کے بار کو اس طرح ہلکا کرتے ہیں کہ ”میرے دیوان کی اشاعت کے متعلق میرے شاگردوں نے یہ فیصلہ کیلئے کہ ہم اپنے مصارف سے چھپوائیں گے چنانچہ ان لوگوں نے ایک فنڈ کھولے آپ بھی چندہ بھیجیں“ مگر بھلا شوق صاحب کب اس جال میں آنے والے تھے کچھ عرصے تک چندہ کا انتظار استاد نے کیا، آخر جل کر لکس کہ: ”مجھے سخت حیرت ہے کہ اب تک آپ نے اپنے دیوان کی اشاعت میں کسی قسم کی امداد نہ دی محض معذرت تو کافی نہیں۔ توجہ کرنی چاہیے۔ اب خدا کو معلوم ہے کہ بے چارے استاد کی مشکل آسان ہوتی، یا شوق صاحب کا نام شاگردوں کی فہرست سے نکال دیا گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جن اصلاحوں پر یہ دے ہوئی ہے وہ اصلاحیں آخر کیا ہیں۔ سب سے پہلے تو استاد ان فن نے اس پر زور دیا ہے کہ ”ہمارے دادا استاد نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لیے ہمارا کوئی شاگرد اس کے استعمال کرنے کا مجاز نہیں ہے دوسرے یہ کہ لال لفظ ہمارے ”خاندان میں متروک ہے“ اس لیے اس کا سکھنا حرام مطلق ہے بعض استاد جن کو خدا نخواستہ عربی میں کچھ دخل ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ عربی زبان کے یہ لفظ کوس کے اسی مفہوم و معنی و لہجے میں باندھا جائے گویا اس طرح وہ کسی لفظ کا ”مہنتہ ہونہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی برعربیت دیکھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں حسرت موہانی نے علی گڑھ میں ایک بڑا زبردست مشاعرہ کیا تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے

سے سننے میں آیا ہے کہ اللہ کے فضل سے بعض ”خاندان“ تو ایسے ہیں کہ انھوں نے ان متروکات خاندانی کی ایک فہرست طبع کرائی ہے۔ اور بیعت کے بعد بطور شجر و پیری مریدی شاگردان باعقیدت کو عطا کی جاتی ہے۔ (مصنف)

شاعر جمع تھے طرح تھی۔ ع

اشک جو آنکھوں سے ٹپکا بڑھ کے دریا ہو گیا

اس پر علی گڑھ کے طالب علموں نے عجیب عجیب شکل کی غزلیں لکھی تھیں۔ اور اکثر استادان فن نے اپنے بے معنی اور مہمل شعروں پر محض اپنی بزرگی و تقدس کے بل پر لوگوں کو بہت کچھ واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور کیا تھا لیکن استادوں میں بھی سب سے زیادہ دلچسپ ہستی "ایک مولوی شاعر" کی تھی انھوں نے طرح کی غزل پڑھنے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ میں نے اردو زبان کی دنل ہزار غلطیاں نکال کر سب کو نظم کر دیا ہے۔ اجازت ہو تو کچھ سناؤ لوگوں نے کہا ضرور ارشاد ہو۔ بھلا اس سے زیادہ احسان اردو کے حق میں اور کیا ہو سکتا ہے اس میرے شیر نے جو پڑھنا شروع کیا تو رات کے دو بجادے۔ آخر جب بڑے میاں کی آواز ہی بیٹھ گئی اس وقت چپ ہوئے۔ رنگ یہ تھا۔

سقاوا صحیح اور سقاوا غلط ہے سکینہ صحیح اور سکینہ غلط ہے

غرض ایک لفظ کے ساتھ "صحیح" و "دوسرے کے ساتھ" غلط ہے" لگا کر شو کی تکیں کر دیتے تھے۔ جب خدا خدا کر کے یہ چپ ہوئے تو قاری سہ فرزند حسین صاحب عزیزی نے کڑے ہو کر کہا: "عالی جناب! ہم اور ہماری اردو آپ کی بہت مشکور ہے۔" مولوی صاحب نے بگڑ کر ارشاد فرمایا: "شکر گزار صحیح اور مشکور غلط ہے" آپ شکر گزار ہیں اور میں مشکور، تو ہاں دوسرے قسم کے استاد وہ ہیں جنہوں نے اردو کو عربی اور فارسی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ اب تیسری قسم کے استادوں کو لیجیے۔ یہ بزرگ سمجھتے ہیں کہ شاگرد ابھی ننھے میاں ہیں۔ اگر ان کو ایک آدھ کھلو نادے دیا جائے تو یہ خوش ہو جائیں گے چنانچہ انہوں نے ہر غزل کی مسدود کے ساتھ دو دو تین تین شعرا اپنی طرف سے بھی بڑھادے ہیں کہ لومیاں صاحب زادے تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی استاد سے پالا پڑا تھا۔ ان میں بعض حضرات نے دوسرا رنگ اختیار کیا ہے شوق صاحب کے شعر پر صرف یہ لکھ دیا کہ "قلم زد" یہ نہیں بتایا کہ آخر اس شعر کا خاتمہ بالآخر کیوں کیا گیا اور کیا واقعی یہ ایسا تھا کہ اس کا دنیا میں رہنا قطعاً مضر صحت یا باعثِ ہلاکت تھا۔ اس "قلم زدگی" کے بعد ارشاد ہوا کہ اس کی جگہ یہ شعر لکھ دو یہ شاید اس خیال سے ہو کہ بے چارہ

شاگرد آزدو نہ ہو جائے۔ یا شاید اس وجہ سے ہو کہ ایک شعر کی کمی اس غزل کی وقعت کو تباہ نہ کر دے۔ بہر حال یہ تیسرے قسم کے استادوں کا رنگ ہے۔

اب رہے چوتھی قسم کے استاد۔ تو ان کو کچھ نہ پوچھیو۔ وہ اللہ کے فضل سے اس طرح اصلاح دیتے ہیں کہ اصل شعر غائب ہو کر صرف اصلاح ہی اصلاح رہ جاتی ہے۔ شاعر کا خیال غائب مضمون غائب الفاظ غائب۔ بندش غائب قصہ مختصر خود شاگرد غائب اور استاد حاضر۔ چند شعرو اصلاح لکھتا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے کہ استاد کی اصلاح نے شعروں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اور اس اصلاح سے شاگرد کو اپنی اصلاح حال کا کیا اچھا موافق ملا ہے۔

قبل اصلاح	مسورت حال یہ آئینہ آزد دل ہے	رنگ چہرے کا سر بزم ہو اہو جانا
بعد اصلاح	آئے ہو بد بہاری کی طرح دیکھو تو لو	رنگ رخ کا دم دیدار ہو اہو جانا
قبل اصلاح	اے تغافل یا س گزر دل میں نہ ہو کر	پا مال نہ کر گور غائبان تمنا
بعد اصلاح	اے صوغ و غم و وسط اس غیرت گل کا	یرباد نہ کر رنگ گلستان تمنا
قبل	کشتہ ناز تغافل کا بت اب کیا پوچھنا	زندہ بناوید تیری کھل کے ٹھوکر ہو گیا
بعد	قتلہ دو راں کی جو مدت سے تھا سو یا ہو	اک قیامت وہ بھی کیا کرتی ٹھوکر ہو گیا
قبل	لنگڑے دل کرتا ہوا جھونکہ نسیم صبح کا	بہل نالوں کے حق میں تیرے بچے ہو گیا
بعد	کیا دیا ہیں برہیں ہونے نے وقت فرح کا	ان کو حصے میں جو دیکھا تیرے بچے ہو گیا
قبل	نہیں مجھ پر آہ اے دلنکار آرزو اچھا	کرے گا درد اور فزوں ہوا زخموں میں کھلانا
بعد	خلاف شیوہ بیدارے نوک مژہ ہو گا	ترے عہد تغافل میں سے زخموں کا بھجانا
قبل	نہ پوچھیو کوئے محبت کی واردات کا حال	کہ ایک دشمن جنس و فانیے لوٹ گیا
بعد	رہی نہ دل میں تمنامرے کوئی باقی	شب وصال کسی بے وفائیے لوٹ گیا
قبل	مسافر رہتی کو جائے حسرت ہے	اجل کے کھیس میں بیم ورجائے لوٹ گیا
بعد	متاع دل کو سر بزم جائے حیرت ہے	کر شہ رنگ رفتہ زائے لوٹ گیا
یک درصاحب فرماتے ہیں کہ	بیم ورجا کو توٹ لینا کچھ مناسب حال نہ تھا۔ اب ذرا	

ملاحظہ فرمائیے۔

رہی نہ جسم میں اک جان زارتک باقی مسافر ان عدم کو فضا نے لوٹ لیا
 قبل اصلاح دل سے ہوتی ہے تو خانی بھی کہیں جاتی ہے تم یہ چاہو کہ مے قلب پر تاثیر نہ ہو
 بعد " اس پر امیڈاثر آہ کی نادانی ہے جس کے عجز ہر بھی کھالوں میں تو تاثیر نہ ہو
 قبل " نکاح شوق کی گرمی سے اڑ جاتا ہے رنگ اس کا تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ مانیں نکلی
 ایک بڑے استاد اس شعر کی بے انتہا تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے قلمرو کرتے ہیں۔

تیسرے یہ اصلاح دیتے ہیں۔

بعد اصلاح کہ کیا شوق چمکے چمکے یہ کہ جاتی ہے کج تری تصویر تجھ سے بھی سواناز آفریں نکلی
 قبل " شب کو ہے و شبیوں کے آبلہ پا کی جھلک جا بجار استے روشن ہیں بیابانوں کے
 بعد " غول کے غول چلے آتے ہیں دیوانوں کے راستے بند نہ ہوں بائیں بیابانوں کے
 قبل " ہوں وہ ببل پن دہر سے خست جو ہوا پتی پتی گل مقصد کی بخت دیکھی
 بعد " چمکی جو وقت اسیری نگہ ببل سے تو نے کن آنکھوں سے سید کی حسرت دیکھی
 قبل " اللہ ہے اک تیرا سہارا اب کوئی بھی سرا نہیں ہے
 بعد " موہوم ہے زندگی فانی دم کو کرنی آ سرا نہیں ہے
 قبل " پر و انہیں کسی کو بھی جلتا ہوں ناماد تصویر بن گیا ہوں چراغ مزار کی
 بعد " اٹھیں ہزار گور غیبیاں پر اندھیاں تصویر کیا بکھے گی چراغ مزار کی
 قبل " ظالم تری بکا میں قیامت کا تھا اثر اک زلزلہ تھا نعش کو جنبش کفن میں تھی
 بعد " رفتار فتنہ گر سے یہ تھیں حسرت خیزیاں بہ لاش قبر کی متحرک کفن میں تھی

ہر حال یہ "مشتے نمونہ از خروارے" ہے ورنہ جو جو اصلاحیں ان استادان فن نے شوق صاحب کو دی ہیں اور جو جو وجوہ ان اصلاحوں کے ظاہر کیے ہیں وہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصلی اشعار دیکھنے سے یہ بھی علوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے جان بوجھ کر اپنے شعروں میں لفظوں کو ذرا تتر بتر کر دیا ہے۔ ورنہ ان کے مضامین پر غور کرنے سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر ضرور ہیں۔ اور یہ خود بھی تھوڑی سی الٹ پلٹ سے اپنے شعروں کو درست کر سکتے تھے

لیکن محض استادوں کو ستانے اور ان کی قلعی کھولنے کے لیے انھوں نے ان شعروں کو بگاڑ کر بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ خیر کچھ سہی ہو۔ اس طریقے سے انھوں نے ایک ایسی کتاب تو مرتب کر لی جس سے خود ان کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا۔ مگر اردو زبان میں خوش مذاقی کا ایک باب ضرور بڑھ گیا۔

شعروں کی اصلاح کے ساتھ ہی ساتھ بعض الفاظ کی صحت کے متعلق بھی کچھ ”تو تو میں میں“ ہو گئی ہے۔ صرف ایک مثال دے دیتا ہوں۔ زیادہ دیکھنے کا شوق ہو تو حکیم محمد بہاؤ الدین صدیقی وائٹ گینج ہر دوئی کو تین روپے بھیج کر اصلاح سخن منگوا لیجیے۔ ورنہ صبر کیجیے۔ تو ہاں۔ ایک استاد نے فرمایا کہ ”میدان محشر“ کی ترکیب غلط ہے۔ کیوں کہ محشر افرادِ احشر کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن ترکیب کے ساتھ اس کی صحت میں کلام ہے۔ اس لیے کہ محشر خود ظرفِ مکان ہے۔ اب میدان کے ساتھ اس کے کیا معنی ہوں گے؟ شوقِ صاحب بھلا ایک ہی استاد کا کہنا کب ماننے والے تھے انھوں نے یہ اعتراض دوسرے استاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ان حضرت نے نظروں سے ثابت کر کے کہ اساتذہ نے بر بنائے تصرف اس قسم کی صد ہا ترکیبوں کو جائز رکھا ہے۔ یہ ہدایت فرمائی کہ ”ان شواہد کے ہوتے ہوئے اس اجتہادِ اساتذہ کو کون مان سکتا ہے۔ آپ جب تک مجھ سے دریافت نہ کریا کریں کسی ایسی تحقیقات پر اعتبار نہ کریں“ تیسرے صاحب نے ان دوسرے صاحب کی تائید کی۔ چوتھے صاحب نے اس کی تردید کر کے نکھا کہ ”میدان محشر صحیح نہیں ہے۔ میدان محشر کے معنی ہوں گے“ میدان جائے محشر اور بیغور ہے۔ میدان خود جائے کے معنی میں اس معاورے میں ہے۔ ”پانچویں صاحب اس تردید کی تائید کر کے فرماتے ہیں کہ ”میدان بھی ظرفِ مکان ہے۔ اور محشر بھی ظرفِ مکان۔ اس لیے ان کو ملا کر“ آپ کو تصرف اور ترکیب بنانے کا کوئی حق نہیں ہے ”خیر کچھ ہو یا نہ ہو ہم کو تو ان آخری دو صاحبوں کی بات کچھ خدا لگتی معلوم نہیں ہوتی۔ اول تو خود ان کی عبارت میں ”ترکیب بنانے“ کا لفظ آیا ہے۔ در آنحالیکہ ”ترکیب“ کے معنی خود بنانے کے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کو بھی اس تصرف کا کوئی حق نہ تھا۔ اور اگر ان کا یہ لفظ صحیح ہے تو ”میدان محشر“ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا دوسرے ظرف کا ظرف میں ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے تھالی میں کٹورا اور کٹورے پر سر پوش

ہوتا ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ مکان کے لیے میدان کی ضرورت ہے۔ باغ میں مکان بنتا ہے جنگل میں جھونپڑا پڑتا ہے۔ آخر یہ بھی تو طرف مکان میں طرف مکان کی صورت ہے۔ جب کچہری کے گرد اگر داہل مقدمات کے بیٹھنے کو زمین چھوڑی جاتی ہے تو پھر محشر یعنی حشر کی کچہری کی چاروں طرف میدان کا ہونا کونسی عجیب بات ہے۔ خود ہی غور فرمائیے کہ اگر سب کے سب اہل معاملہ قیامت کے دن کچہری میں گھس گئے تو بہت سے تو دم گھٹ کر مر جائیں گے۔ اس لیے ہماری رائے میں ”میدان محشر کی ترکیب“ ”میدان حشر“ سے بدرجہا بہتر ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ہماری اس سیدھی بات کو بھی محض اپنی استاد کی زعم میں کوئی نہ مانے۔ خیر۔ آدیم پر سہ مطلب چھٹے صاحب تاؤ میں آکر یہاں تک فرمائے ہیں کہ ”میدان محشر“ یقیناً درست نہیں ہے اور نہ کسی کا لکھنا سند ہو سکتا ہے چاہے وہ لکھنے والے کوئی بھی ہو، مگر حروف جو فیصد سا تو میں صاحب نے کیا ہے۔ اس کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ ”میدان محشر غلط ہے میں خود تو لکھتا ہوں۔ ہاں تم نہ لکھا کرو“ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ استادوں کو غلط الفاظ بھی لکھنے کا حق ہے مگر شاگرد اس حق سے محروم ہیں۔

ہاں جناب اب یہ فرمائیے کہ اس ساری بحث کا کیا نتیجہ نکلا۔ میدان اس کی ترکیب صحیحہ ہوئی یا غلط۔ سنتا ہوں کہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کوئی اردو کی نعت تیار کر رہے ہیں دس برس میں پوری ہوگی اگر وہ ان استادوں کے ”میدان محشر“ میں اردو کے الفاظ صحت و تحقیق کی غرض سے پھیلا دیں تو یقین مانیے کہ کسی لفظ کے کوئی معنی نہ رہیں اور پوری کتاب کٹ کر اور چھیل چھلا کر کوئی ڈیڑھ جزو میں ختم ہو جائے۔ اور پھر اس میں بھی شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہو جس کے معنی پر تمام استادان فن متفق ہوں۔ ہم تو مولوی صاحب کو کبھی اصل دیتے ہیں کہ وہ اس کام میں شوق صاحب کو اپنا اسسٹنٹ بنالیں۔ یہ ایسے کاموں میں شاق بھی ہو گئے ہیں۔ دس برس تو کیا دس مہینے میں پوری ڈکٹری تیار کرادیں گے۔ اور ساتھ ہی تنقید و تنقیح کے وہ وہ پُر لطف مباحث جمع ہو جائیں گے کہ مزاجیہ نویسوں کی سات پشتوں کو کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہوں گے۔

شوق صاحب نے جو حال پھیلا یا تھا اس میں سے دو تین استاد ذرا پھڑپھڑا کر

نکل بھی گئے ہیں۔ سب سے تیز تو وہ صاحب ہیں جنہوں نے غزل دیکھ کر لکھ بھیجا کہ مجھے اردو کی ایسی شاعری میں درک نہیں ہے۔ جب ان کو فارسی کی غزل بھیجی گئی تو جواب دیا کہ آپ کو فارسی نہیں آتی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ دوسرے صاحب ایسے تھے کہ پہلے ہی خط میں شوق صاحب کی چال سمجھ گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "آپ کے معاملے میں سخت متحیر ہوں۔ آپ جیسا خوش فکر ہوس اصلاح کیوں کرتا ہے مجھے معاف کیجئے گا۔ میں تو بار بار یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ مجھے بناتے نہ ہوں۔ اگر خود ہی اپنی تصنیف پر نظر کر لیا کیجئے تو میرے شرمندہ کرنے کی آپ کو ضرورت نہ ہو"۔ تب سے صاحب کو خدا معلوم شوق صاحب کی اس "پچھیدہ کارروائی" کا حال کیوں کر معلوم ہو گیا۔ وہ بہت بگڑے لیکن شوق صاحب نے تھپک تھپک کر چہرہ انہیں جال کے پھندوں میں پھنسا دیا پہلے خط میں سوال کیا گیا کہ "آپ کی نسبت ایک صاحب نے ایک صحبت میں مجھ سے تذکرہ کیا کہ وہ سب سے اصلاح لیا کرتے ہیں مجھے یہ خیال تھا کہ کبھی آپ کو لکھوں گا کہ یہ طریقہ اچھا نہیں۔ ایک شخص کو منتخب کر لیجئے۔ اس کے نقائص آپ اگر غور کریں تو معلوم ہو جائیں گے اگر ہر مذکورہ بالا ناطق ہو تو کبھی کبھی آپ کچھ بھیج دیا کریں" اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان استاد صاحب کو واقعے کا علم اچھی طرح ہو گیا۔ چنانچہ غصے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "چند ماہ ہوئے کہ مجھے کانپور جانے کا اتفاق ہوا۔ اتفاقاً... صاحب سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے آپ کی ایک غزل دکھائی جو بغرض اصلاح آپ نے ان کے پاس بھیجی تھی۔ میں نے کہا کہ ہاں کچھ غزلیں میرے پاس بھی آئی تھیں۔ وہ غزل یہ تھی "نقش تو دیر پا نہیں ہے"۔ یہ غزل میری بنائی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں امید ہے کہ آپ مجھ کو معاف کریں گے" معاف نہیں کہ شوق صاحب نے ان کے اس غصے کو کیوں کر رفع کیا اور کیا چال چلے کہ آخر یہ بے چارے من گئے۔ اور یہاں تک صاف ہو گئے کہ اپنے دیوان کے مقدمے میں اپنے تلامذہ کی فہرست میں شوق صاحب کا نام نامی بھی شریک کر دیا۔ کہتے ہیں کہ بہت لمبا چوڑا ریویو لکھنا خلاف اصول و عقل مندی ہے مجھے لکھنا تو بہت ہے اور لکھنے کو ابھی بہت کچھ مواد بھی موجود ہے۔ لیکن عقل مند بننے کا شوق اس مضمون کو بادل ناخواستہ ختم کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس لیے میں اس کو اس زعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ یا مولا بھیج "عاف الذنوب" جیسے اور چند نیک بخت شاگرد جو "شجر استادی" پر نغمہ زن ہو کر زنا زن

آریاں چلائیں۔ خود بھی گر کر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ لیں مگر ساتھ ہی گڈے کاٹ کاٹ کر اس
”نناور درخت کو ٹھنٹ بنا دیں۔ اور یا اللہ نہ بھیج مجھ جیسی چند زبان دراز ہستیاں جو ان شاگردوں
کی کارگزاری پر شاباش اور واہ واہ کا غل مچائیں اور اس ”استادیت“ کے زوال پر
ہڑے ہڑے کے نعرے لگائیں۔ مضمون ختم۔ والسلام۔

مثنوی گزشتہ کا حاشیہ
سے معلوم نہیں کہ یہ القاب کس جگہ استعمال ہوتا ہے لیکن ایک جید استنا صاحب نے ”اصلاح سخن“ میں
اس لفظ سے شوق صاحب کو یاد کیا ہے۔ شاید شوق صاحب کا لقب یا خطاب ہو اس لیے میں نے ان کا نام لکھنے
کی بجائے یہ لفظ لکھ دیا ہے اگر غلط ہے تو میں اس غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ (مصنف)

مردہ بدست زندہ

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نواب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری ہی دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرنے کا تو ایسا رنج ہوتا تھا گو یا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازے کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ۔ جیتنے ہی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا مرنے کے بعد پھر کبھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آئیے میرے ساتھ آئیے آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجیے۔ سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سنکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بے چارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ بڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے 'کیا مر گئے؟' بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے؟ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیانگالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا یہ دیکھتے ہی دروازے کے سامنے کی بھٹی چھپ گئی۔ کچھ ادھر

ہو گئے۔ کچھ ادھر آگے آگے جنازہ ہے اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہوئی شروع ہوئی۔ اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنہیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے۔ یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اجرت پر بلا یا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سوار یا نہ تھیں یا شراثر می پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا ہٹتا اپنی سواروں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے میں کوئی عہدے دار میں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاح پر سی کی مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کہیں۔ اگر حکیم لے علاج سے مراد ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کہیں۔ اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے سمجھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آگے۔ اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمارے بیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہیندہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے۔ دوسرے وہ ہیں جو نہادھو کپڑے بدل۔ خاص اسی نماز جنازہ کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں۔ یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دوسرے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی بوڑھے یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہوئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی اور ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سیبے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھنا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے۔ مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کر دیا ہے۔ اور

یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔
 موٹر لشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لیے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک
 پر سے گزرنے کا زمانہ کوزہ معلوم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رفتار
 کم ہونے سے سڑول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے سڑول کا نقصان کرے۔ شو فرے کہ
 ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ سڑھا تر چھا
 ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور
 نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں
 خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے
 قبرستان کیا ہے خاصا ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک
 سٹے صاحب ان کی بیوی۔ دس بارہ بچے۔ پانچ چھ بچیاں۔ ایک لنگڑا ٹوڑ۔ سو دو سومر غیاں۔ پانچ
 چھ بتیاں اور خدا معلوم کیا کیا بیات بھے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانسیں
 بڑھ کر مکر ہو گئی ہے۔ دیواریں توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔ نیم پیل اور خدا معلوم کس کس
 قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چوڑے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے
 کسی کا تعویذ ہی نماب ہے۔ کسی چوڑے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں بغرض کس
 میرسی نے اس حصے کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر
 صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مرنے
 تو اپنی قبروں کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز
 پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپیے کھرے کر چلے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق
 دوسرے حصے کا صاف دکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دکان دار
 اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپیے گز والی زمین کو
 کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدنے وقت اچھا مال دیکھ لو۔ پھر تم جانو اور تمہارے مردے جانیں۔
 میاں سٹے رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی بیج پرستے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا

گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیے۔ خیر کیا ہرج ہے، زندوں کا کام بھی نکل گیا۔ مردے بھی خوش ہو گئے اس گھر میں سب بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لار کھا بکریاں قبروں پر قلائچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کمرہ رہی ہیں۔ بچے یا تو چبوترے پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذ کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بے چارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔ اس پر بی سفنی نے گیسوں سکھانے ڈال دیے ہیں۔ ٹوٹانی کو ایک اگلی اور ایک پھلی مانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر چھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چوڑا گرا۔ کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلے کے بعد کانگریس کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا۔ فوج میں ترم سبج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا۔ اور اناج لینے کو برتن لے۔ لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پندے کا تام چینی کا کورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی ہوئی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رازق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔ یہ تو قبرستان والوں کی حالت تھی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیے۔ جنازہ لالہ لیب گور لکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر و جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا بھلا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے کبھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے چبوترہ کو تخت بنایا۔ اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کے دم لگانے۔ کسی نے سقے سے حلیم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلف بھر حاضر کیا۔ حقہ مزے لے لے کر پیے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلف پر سلف بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ تو فینق نہیں ہوتی کچھ خدا کی ید کی تریا

یا ان خفتگانِ خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض صاحب ہیں کہ گھانس سے بچتے بچتے۔ قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدا نخواستہ فاتحہ کے لیے کیوں آئیں گے۔ آج شراشرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھے لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔ ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلانیا۔ اور بجائے فاتحہ پڑھنے کے داد سخن گویا دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا۔ کچھ اُن کا سنا بغرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال ہی لیا۔ جو لوگ چبوتروں پر منگن ہیں۔ اُن کی کچھ نہ پڑھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلی منٹ ہے اور ہر قبر کا نگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ انوائموں کے ذرائع اور اُن کی تصدیق دتر دید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ عدے نیے جا رہے ہیں۔ غرض۔ ب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خیر آئی کہ تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیے۔ دو مصاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا۔ سنبھال کے۔ سنبھال کے۔ میت بھاری ہے۔ مگر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ سے۔ اب میت قبر کے منہ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے 'ذرا مگر کی چادر کو کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پا کھانا گرے۔ ہاں۔ ہاں۔ ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ۔ میت بھاری ہے۔ ذرا سنبھال کے۔ آہستہ آہستہ۔ بس بھی بس۔' کوئی چیخ رہا ہے 'مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں۔' تو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ نبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی

منہ پورا نہیں پھرا بس بھی بس۔

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص بے کہ غل مچا ہوا ہے۔ جو بے چارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب چٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے: یہ کڑی نہیں۔ وہ کڑی لو۔ کوئی کہتا ہے: لاجول ولاقوۃ بھفت میں سو روپے مار لیے اور کڑیاں دیں تو ایسی؛ غرض کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور اسی گڑبڑ میں چٹاؤ بھی بوجاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے مگر یہ خدا ہی معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے وہ پڑھنا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ 'منہا' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ملتے ہیں مگر شاید سو میں سے بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ کیا کیا سو رہیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوتھی رہی بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزاء کون ہیں۔ اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بے چاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور، گھر سے چکاکار لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ فاصلہ بہت تھا، کبھی کہتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے دوسری میت کو تھوڑا کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے ہاں سے دگنائل رہا تھا، بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھو یا آپ نے اس زمانے کی میت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوا اس کے کیا ہے کہ خدا سے دعا کیجیے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں، اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

ایک اور ایک چار

خدا نخواستہ مجھے ذاتی تجربہ تو نہیں، لیکن یہ دیکھا اور سنا ضرور ہے کہ پہلی زچگی میں تکلیف ضرور ہوتی ہے اور خاص کر ایسی صورت میں کہ یہ آفت اس وقت نازل ہو جب عورت ذرا پُرانی ہو گئی ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کو تو وہی بی بیایا بیان کر سکیں گی جن پر یہ مصیبت پڑ چکی ہے۔ ہاں، اپنے گھر کا صرف ایک واقعہ دیکھ کر یہ یقین آ گیا ہے کہ واقعہ یہ مثل صحیح ہے کہ جینا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔

وہ واقعہ کیا تھا۔ اس کو بھی سن لیجیے۔ ہماری بیگم صاحبہ جب سے گھر والی بن کر آئیں۔ ہم اور وہ مل کر بس ایک اور ایک دو ہی رہے۔ سنتے تھے کہ گنڈے تعویذوں سے ایک اور ایک تین ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی گنڈا تعویذ حساب کے اس مسئلے کو نہ توڑ سکا کہ ایک اور ایک برابر ہیں دو کے۔ آخر ہارمان فی اور سمجھ گئے کہ ہم دونوں بھی ایک ایک کر کے چل دیں گے اور اس طرح ایک دو تین ہو جائیں گے۔

یہ سب کچھ تھا، مگر دنیا بامید قائم کی دم برابر لگی ہوئی تھی، کوئی ڈاکٹر نہیں تھا، جس نے فیوں سے جیب نہ بھری ہو۔ کوئی حکیم جی نہیں تھے۔ جنھوں نے قدحوں کی بھرا مار سے ہماری بومی کا معدہ خراب نہ کیا ہو۔ کوئی وید نہیں تھے۔ جن کی رسائیں ہر چیز کہ کان نمک رفت نمک شہ۔ نہ ہوتی ہوں۔ مگر ہماری بیگم صاحبہ کے جسم کا درمیانی حصہ جیسے کا ویسا ہی رہا۔ انسان کی یہی وہ حالت ہے جس کو دنیاوی زبان میں لہجہ می اور نہ ہی زبان میں قسمت کہتے ہیں۔ آخر تنگ آ کر حکیموں، ڈاکٹروں، ویدوں، ملاؤں، داڑھی والوں، موچھوں والوں، صفا چٹوں، زلفوں والوں اور خرمندوں سب کو چھوڑ بیٹھے اور کیوں نہ چھوڑ بیٹھتے جب بچہ پیدا کرنا تو کجا ان میں سے کوئی یہ بھی نہ بتا سکا کہ اس نسلی نسل کے متعلق دونوں میں سے تصور کس کا

ہے۔ میرا یا میری بیوی کا۔ جب کسی کام سے انسان لاپرواہ ہو جاتا ہے تو ہمیشہ لعنت پر اتر آتا ہے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی یہی کہا کہ "بچوں پر لعنت بھیجو جس طرح گھر کی حکومت رعایا کے بغیر صرف بادشاہ اور وزیر پر چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔ میں اس وقت اس بحث میں جانا بے ضرورت سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں وزیر کون تھا اور بادشاہ کون۔ ہاں یہ اصول بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس گھر میں بچے تشریف لے آئے ہیں وہاں حکومت کی باگ ڈور بیوی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ کیوں کہ میاں ڈرتے ہیں کہ اگر بیوی نے بغاوت پر مکر باندھ لی تو یہ ساری رعایا ان کے ساتھ ہو جائے گی اور پھر اس سلطنت بے آئین میں ٹکڑا کھانے کو نہ ملے گا۔ البتہ جہاں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ وہاں کا رنگ ہی کچھ دوسرا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ بیوی ڈرتی ہیں کہ اگر بھلے مانس نے کوئی دوسرا وزیر مقرر کر لیا تو جینا مشکل ہو جائے گا اور وزراء کا اختلاف رائے سلطنت میں آفت بنا کر دے گا۔ لیکن یقین مانیے کہ ہمارے گھر میں اس اصول کے برسرِ کار آنے کی وجہ باقی نہیں رہی تھی اور وہ اس لیے باقی نہیں رہی تھی کہ اس کم ترین کا وہ زمانہ بیوی کی دوا درمن میں گذر چکا تھا۔ جب سلطنت کو دو وزیروں کے ذریعے سے چلانے کا خیال پیدا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم نے ارادہ کر لیا کہ اب بہت گئی ہے تھوڑی رہی ہے اس کو بھی کسی طرح بڑی بی کے ساتھ رہ کر نشہ پشتر گزار دو۔

الغرض کئی برس یوں ہی نکل گئے۔ ایک دن میں دفتر سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ ہماری بیگم صاحبہ کچھ شرمائی ہوئی آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں۔ اب کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر شرمائی جاتی ہیں۔ آخر بڑی ہمت کر کے ذرا سچی آواز میں کہا "اجی ایک بات کہوں" میر نے کہا "کہیے تمہیں کہنے سے کس نے روکا ہے۔ ایک نہیں سو باتیں کہو۔ مگر آج آپ کچھ جھینپی جھینپی سی کیوں ہیں۔" کہنے لگیں "میں امید سے ہوں۔" یقین مانیے کہ میں بالکل نہ سمجھا کہ اس موقع پر "امید سے ہوں" کے کیا معنی ہیں اور ہو سکتے ہیں یہ سچ ہے کہ کسی زمانے میں یہ پڑھا ضرور تھا کہ "امید سے ہونا" حمل سے ہونے کے معنی رکھتا ہے لیکن اول تو یہ فقرہ ہماری بیوی صاحبہ نے کہا تھا۔ جن کا "امید سے ہونا" ایک خلاف امید واقعہ تھا۔

دوسرے امید میرے سالے کا نام بھی تھا۔ خیال یہ ہوا کہ شاید گفتگو انھی حضرت سے متعلق ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ خود ان سے متعلق تھا تو اس عمر کی عورت کو ایسی معمولی بات کے کہنے میں شرمانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال میں نے ان سے کہا کہ "ذرا وضاحت فرمادی جائے تو مناسب ہے۔" پھر کچھ

شرما کر کہنے لگیں۔ "کیوں ننھا بچہ بنتے ہو۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امید سے ہونا کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت میں ذرا سمجھا۔ مگر اس واقعے کو کسی طرح بھی اپنی بیگم صاحبہ سے متعلق نہ کر سکا۔ اس لیے میں نے کہا: پیٹ سے بے تو ہونے دو۔ بیماری اور ننھاری جوڑے سے، جب کیا ہے ویسا بھرے گی۔" اس پر انھوں نے اس زور سے 'نوح' کی بکر میں اچھل پڑا۔ اور کہا "آخر ان پھیبیوں کے بوجھوانے سے فائدہ۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کیا امید کی بڑی پیٹ سے بے یابی ہسانی کی بیٹی۔" انھوں نے ذرا شرما کر کہا "میں" یقین مانے کہ اگر کوئی بڑھکا گور ٹھیک مہری چند یا پر گرتا تو اتنا جھٹکا نہ پڑتا جتنا اس "میں" سے پڑا۔ میں بیٹھا لکھ با ننھا کہ تھوڑو۔ بخود میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں نے ٹھوڑی کو مٹھی میں بڑے زور سے دبا کر کہا "کیا ارشاد ہوا۔ کیا آپ امید سے ہیں۔ بس جانے بھی دو۔ اتنا تھوٹ بولنے سے فائدہ۔" کہنے لگیں "نہیں میں سچ کہتی ہوں۔" میں نے کہا "میں نہیں مانتا، تمہارے کبھی پہلے کوئی بال بچہ ہوا ہے جو مختص معلوم ہو کہ پیٹ سے ہونا کس کو کہتے ہیں؟" کہنے لگیں "واہ۔ یہ کبھی خوب ہوئی۔ خاندان میں سینکڑوں بچے میرے سامنے ہو چکے ہیں، مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ آنا کیا ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "اب جو ننھاری عمر ہے اس میں وہی شکل ہو جاتی ہے جو امید سے ہونے میں ہوتی ہے۔ جاؤ جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ خواہ مخواہ کیوں چھوڑوں میں اپنی ہنسی اڑواتی ہو۔ قسم خدا کی اگر ننھا را یہ وہم نہیں گیا تو خاندان بھر میں نگو ہو جاؤ گی اور ہر شخص تمہیں دیکھ کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا کرے گا۔" کہنے لگیں "آخر تم مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہو۔ اللہ کی دین ہے جب نہ دیا، اب دیا۔ میں نے مسیتی دانی کو آج بلا یا تھا، اس کا بھی یہی خیال ہے کہ....." یہ کہہ کر انھوں نے گردن جھکالی اور پھر مسکرا کر میرے پاس سے اٹھ گئیں۔

اب جناب آپ ہی غور فرمائیے کہ اس خبر وحشت اثر کا مجھ پر کیا کچھ اثر نہ ہوا ہو گا۔ فرض کر لیجیے کہ چالیس پینتالیس برس کی بڑی پیٹ سے ہیں اور اس بیماری کا یہ پہلا حملہ ہے۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سن میں یہ اس جھٹکے کو سہ بھی سکیں گی یا نہیں اور فرض کیجیے کہ سہ بھی گئیں تو سوال یہ ہے کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔ اور فرض کیجیے کہ وہ ہوا بھی یا ہوئی بھی۔ تو سوال یہ ہے کہ اس بڑھاپے کی اولاد میں اتنی سکت بھی ہو گی کہ وہ جی سکے۔ اور فرض کیجیے کہ وہ جیا بھی یا جی بھی۔ تو سوال یہ ہے کہ ہم اس وقت تک زندہ بھی رہ سکیں گے۔ جب تک وہ لڑکا پڑھ لکھ کر کھانے کمانے کے قابل

ہو جائے۔ یادہ صاحب زادی صاحبہ جوان ہو کر 'سپر دم تو باہ' خویش را بن سکیں۔ قصہ مختصر یہ کہ بیگم صاحبہ کی اس 'میں' نے لفظ 'کن' کی طرح خیالات کی ایک نئی دنیا قائم کر دی۔ باپوسی نے ہم دونوں کا اتنا دل توڑ دیا تھا کہ اس 'چھپر بھاڑ' دولت کا یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن جب کئی ایسی دائیوں اور ڈاکٹر فو نے تصدیق کر دی۔ جن کو میری بوی سے مخالفت کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت بات چیت ہو گئی اور مجھے اور میری بوی کو یقین ہو گیا کہ ہم دونوں عن قریب کسی مرد یا عورت کے ماں باپ بننے والے ہیں۔ اس واردات کے اطمینان کے بعد ہم میں اور ہماری بوی میں دنوں تک کچھ کچھ کھچھ بھی رہی۔ وجہ اختلاف وہی پیٹ کے اندر والی چیز تھی۔ میں کہتا تھا کہ بیٹا تو اچھا۔ بوی کہتی تھی کہ بیٹی تو اچھا۔ میری یہ حجت تھی کہ بیٹا ہوگا تو جائداد کا وارث ہوگا۔ ہم نے اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ نیک گئے گا۔ بوی فرماتی تھیں کہ بیٹی ہوگی تو ہوا کی طرح بڑھے گی۔ آج اتنی ہے کل اتنی ہوگی۔ پوسوں اتنی ہو جائے گی۔ کم سے کم مرے سے پہلے ہم اس کا سہرا تو دیکھ لیں گے۔ غرض کوئی دن نہ جانا ہوگا جو اس مضمون پر کچھ کش کش نہ ہو جاتی ہو۔

زمانہ جس تیزی سے گزرتا ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے۔ ایک مہینہ گیا۔ دو مہینے گئے۔ تین مہینے گئے اور تسلی کے ساتھ ہی 'اوع اوع' کا وظیفہ دن رات پڑھا جانے لگا۔ بسین آخر کہاں تک۔ یہ بھی ہوتے ہوتے ساتواں مہینہ لگ ہی گیا۔ ہماری بوی کو اگر رنج تھا تو یہی تھا کہ اب نذران کے بڑے بوڑھوں میں کوئی ایسا نہیں رہا تھا جو اس عمر میں ان کی گود بھرتا۔ کوئی ایسا نہیں رہا تھا جو تشریف لانے والے بزرگوار کے کپڑے سینا۔ نہالچے اور تکنیاں تیار کرتا۔ کوئی چھوٹا موٹا زیور نہ ہوتا۔ غرض جدھر نظر ڈالتے سارا میدان صاف پاتے۔ آخر خود ہونے والی زچہ ہی نے یہ دوسروں کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور جھپا جھپ کپڑے سننے اور زیور بننے لگے۔ خیر کپڑوں کی حد تک تو مجھے کچھ اعتراض نہ تھا۔ کیوں کہ لڑکی ہو یا لڑکا، دونوں کے کپڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ مگر زیوروں کے معاملے میں میری رائے بیگم صاحبہ سے ذرا مختلف تھی۔ فرض کیجیے کہ ان کے ہاں لڑکا ہوا تو ایسی صورت میں یہ زیور کہاں جائے گا اور جانتے یہ بے کہ زیور بناؤ تو سو روپیے میں بنے اور نکالو تو پچیس روپیہ میں جائے۔ ہماری بیگم صاحبہ ایک حجت قائم کرتی تھیں مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اچھا سمجھو کہ اب کے لڑکا ہوا زیور رکھے رہیں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ لڑکی ہوگی۔ یہ زیور اس کے کام آئے گا۔ میں تو کیا ذرا آپ ہی انصاف کیجیے کہ کیا اس حجت میں کوئی قوت ہے جس عورت کے ہاں چھبیس پچیس تک

لڑکا لڑکی ہونا تو درکنار چوہے کا بچہ بھی نہ ہوا ہوا، اس کا صرف ایک دفعہ امید سے ہوجانے کے بعد یہ سمجھ لینا کہ دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے کا تمغہ آئندہ اسی کو ملنے والا ہے، کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر بھی بات یہ ہے کہ اولاد ہونے یا کم سے کم ہونے کی توقع ہوجانے کی خوشی ایسی ہوتی ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی خانہ جنگلیوں سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور بڑھاپے میں پہلا باپ بننا یا بننے کا متوقع ہونا انسان کے دماغ کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔

اب کیا تھا بیوی بیچ میں سے دن بدن کچھ بڑھتی ہی گئیں۔ آخر اتنی بڑھیں۔ اتنی بڑھیں کہ ایک دن میں نے جل کر کہا کہ "بیوی ذرا میں بھی تو سنوں کہ آخر مختار ارادہ کیا ہے۔ کیا کوئی پالا پوسا بچہ جنا چاہتی ہو۔" یہ سن کر وہ تو بگڑ گئیں اور کہنے لگیں: "مختار ایسی فال زبان منھ سے نکالتے ہوئے وہم نہیں آتا۔ جو بوجھ ہے وہ مجھ ہی پر تو ہے۔ تم کیوں بلبلائے جاتے ہو۔" ہوتے ہوتے ان کا گھیر پھیر ایسا بڑھا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ پاؤں پر درم آ گیا۔ سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ اور خدا کی عنایت سے نواں مہینہ لگ گیا۔ اب کیا تھا، ذرا کچھ پیٹ میں گرہ بڑھتی یا بچے نے پھیر لیا اور نیم صبح بلاگ پر دراز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر میں یہ درد کم ہوا اور بات پھر کل پر جا پڑی اور ہم بھی مایوس ہو کر دفتر چلے گئے۔ آخر یہ دھوکے بازی کب تک چلتی۔ ایک دن وہ آہی گیا کہ ان کو سچ مچ کے درد شروع ہوئے دردن کا اٹھنا تھا کہ انھوں نے فل مچا کر سارے محلے میں منادی کر دی کہ اب اس گھر کی بیوی بچے کی ماں بننے پر پوری طرح تیار اور آمادہ ہیں لیکن بڑھاپے کی لاج رکھنے کے لیے انھوں نے کسی کو نہیں بلایا جانتی تھیں کہ اگر ایک کو بھی اطلاع دی تو یہ بن کوڑی بن پیسے کا تماشا دیکھنے سارا کنبہ الٹ آئے گا۔ ہاں یہ کیا کہ پہلے تو ایک کھوسٹ دانی کو بلوایا۔ لیکن ادھ گھنٹے کے بعد ہی اس کو ناکافی سمجھا گیا۔ ڈاکٹر نے بلانی گئی۔ اس نے اپنی مدد کے لیے اپنی دوسری بہن کو بلوایا۔ ان دونوں نے مل کر یہ صلاح دی کہ کسی بڑے ڈاکٹر کا بھی بلانا اچھا ہے۔ ان کے ننگے بندھے ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔ اس کے بعد ان تینوں کی رائے ہوئی کہ ڈاکٹر پھوڑ گاؤں کر کا بھی آنا مناسب ہے۔ کیوں کہ پہلی زچگی ہے اور زچہ کی عمر زیادہ ہے۔ یہ بھی آگئے اور اپنے ساتھ ڈاکٹر سیفی کو بھی لائے۔ الغرض اتنے ڈاکٹر اور ڈاکٹر نیاں آئیں کہ تھوڑی دیر میں ہمارا گھر خاصا جنرل ہسپتال بن گیا۔ خیر بیوی کو تو درد لگ ہی رہے تھے مگر مجھ کو بھی ان سے کچھ کم درد نہیں تھے۔ کسی تو دست آگئے اور مانگیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھرتے پھرتے شل

ہو گئیں۔ جو کوئی ڈاکٹر نی اندر کے کمرے میں آتی، اس سے پوچھتا "کہو کیا حال ہے۔ کب تک سوجھ ہو جائے گا۔" وہ یہی جواب دیتی "ہو جائے گا۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں؟" لیجیے سنا آپ نے ان کا جواب۔ یہاں تو بیوی کی جان کے لالے پڑے ہیں۔ ان کی چیخوں سے دل بیٹھا جا رہا ہے اور یہ بی صاحبہ فرماتی ہیں "گھبراتے کیوں ہو۔ ہو جائے گا طبیعت تو اس وقت بے قابو ہو جاتی تھی۔ جب ان ڈاکٹروں میں سے کوئی آکر کسی ڈاکٹر سے کھسکھس کر تکی تھیں اور مزایہ سے کہ جب میں پوچھتا تھا کہ کیا بات ہے، تو جواب ملتا تھا "کچھ نہیں"۔ غرض اسی گڑبڑ میں ایک رات اور ایک دن گزر گیا۔ دوسرے دن رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ اس اندر باہر کی آمد و رفت میں بہت تیزی آگئی۔ میں سمجھا کہ اب معاملہ بس لپٹ دو چار پر آ گیا ہے۔ لیکن میری اس امید کو ڈاکٹر سیفٹی نے یہ کہہ کر خاک میں ملا دیا کہ سوجھ پاپل ہے۔ زچگی ذرا مشکل سے ہوگی۔ شاید بے ہوش کر کے آلوں سے نکالنا پڑے؟ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب خواہ کچھ بھی کیجیے، مگر میری بیوی کی جان بچا لیجیے۔ میں دھابا اس زچگی سے۔ ہم دونوں بغیر بچہ ہی کے اچھے تھے۔" ڈاکٹر صاحب نے پھر وہی بے ہودہ فقرہ کہا کہ "آپ گھبراتے کیوں ہیں؟" لیجیے ان کی نیسے ہماری بیوی کی توجان پر بنی ہے اور یہ حضرت بڑے ٹھنڈے دل سے فرما رہے ہیں کہ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ ان کی بیوی پر اگر یہ گزر رہی ہوتی تو حقیقت معلوم ہوتی۔ اتنے میں اندر سے دائی نے آکر کہا "چلیے بیگم صاحبہ آپ کو بلاتی ہیں" ایسی خطرناک جگہ جانے کی۔ ت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ تو کہو کہ میں بچپن ہی سے کچھ مضبوط دل والا ہوں جو ذرا ڈرتے ڈرتے کمرے میں چلا گیا دیکھتا کیا ہوں کہ بیگم پلنگ پر لوٹ رہی ہیں، اور ہائے ہائے کے نعرہ مار رہی ہیں۔

مجھے دیکھ کر ان کی آواز کچھ اور اونچی ہو گئی اور لوٹنے میں بھی تیزی آگئی۔

میں پٹی کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا، کچھ تسلی دینا چاہتا تھا کہ انھوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے "ہائے مری، کہا کہ وہ تو وہ خود میرے آنسو نکل آئے۔ اس کے بعد انھوں نے اس نمونے کی باتیں کہیں جو رنے سے ذرا پہلے کی جاتی ہیں اور عرف عام میں وصیت کہلاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے بچے بالے ہوتے تو وصیت کا

میں نے خدا مغفرت کرے۔ میرے ایک دوست تفضل حسین تھے۔ وہ اکثر ایسے فقرے بولا کرتے تھے "دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا"۔ کو انھوں نے مختصر کر کے "لب دو چار" کر دیا تھا۔ میں ان کا یہ فقرہ بولنے میں تو کیا اکثر دیکھنے میں بھی استعمال کر جاتا ہوں۔ (مصنف)

رنگ یہ ہونا کہ ان بچوں کی خبر گیری کرنا ان کو تکلیف نہ دینا۔ میری ننھی کا دل بہت چھوٹا ہے۔ اس کا دل نہ دکھانا۔ ننھے پر تم بہت خفا ہوتے ہو۔ میرے بعد خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل اور ٹوٹ جائے گا۔ اور دیکھنا خدا کے لیے ان بچوں پر سوتیلی ماں نہ لانا۔ وہ ان کو ستائے گی اور میری روح قبر میں بے قرار ہوگی۔ لیکن ہم بال بچوں کی مصیبت سے آزاد تھے۔ اس لیے ہماری بیگم صاحبہ کی گفتگو ذرا دوسرے نمونے کی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ میرے مرنے کے بعد ہی دوسری شادی کر لینا۔ گھر میں کوئی نہ رہا تو تمہیں تکلیف ہوگی اور تمہیں تکلیف ہوئی تو میری روح بھی بے چین رہے گی۔ غرض پریشان کرنے اور رونے رلانے کی جتنی شکلیں ہو سکتی تھیں وہ انھوں نے رو کر اور بیچ میں ہائے ہائے کے گندے ڈال ڈال کر سب پوری کر دیں۔ جب رقت کا یہ سین کچھ حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو ایک ڈاکٹر نے آکر مجھے زبردستی پنک کے پاس سے اٹھایا۔ گھسیٹ کر کمرے کے باہر کیا اور شاید میری بیوی کو سمجھایا بھجایا۔ کیوں کہ ہائے ہائے کے ساتھ ہچکیوں کے جوڑ تھے وہ بند ہو گئے۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد میری بس وہی حالت ہو گئی جو میدان جنگ کو دیکھنے کے بعد کسی کمزور دل والے سپاہی کی ہو جاتی ہے اور یہ کمزوری اس طرح دفع کی جاتی ہے کہ جس جس طرح اور جس جس پہلو سے ممکن ہو دعا مانگی جائے۔ اب رہا یہ امر کہ دعا کے الفاظ صحیح نکلنے میں یا غلط۔ تو اس کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم نے بھی یہی پرانا اور آزمودہ طریقہ کار اختیار کیا۔ جب کمرے کی آوازیں تیز ہو جاتی تھیں اس وقت اس وظیفے میں بھی تیزی آ جاتی تھی۔ اور جب دھیمی پڑ جاتی تھیں تو وظیفہ بھی ذرا مدھم ہو جاتا تھا۔ اب ڈاکٹروں میں یہ بحث شروع ہوئی کہ درود بڑھانے کے لیے پچپکاری دینی مناسب ہے یا نہیں۔ یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جو شخص زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے وہ اپنے سے کم پڑھے لکھے شخص کی بات ماننا اپنی توہین سمجھتا ہے، جو کم تعلیم یافتہ ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ دوسرے صاحب اپنی تعلیم کا دباؤ مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ ان سے دینا گویا اپنی نظروں میں خود اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی اور حجت طول پکڑ گئی۔ ابھی ان لوگوں میں یہ بحث جتنی ہو رہی تھی کہ اندر کے کمرے سے اس زور کی چیخ آئی کہ میں نے بلا سوچے مجھے "انا للہ" پڑھ لی۔ ساتھ ہی ایک ڈاکٹر نے صاحبہ اندر سے تشریف لائیں اور کہا کہ اب پچپکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو پچپکاری دی جا رہی تھی۔ وہ ختم ہو گئیں۔ یہ سوچ کر میں نے بھی ایک چیخ ماری اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میری یہ حالت دیکھ

کر ڈاکٹر سیفی میرے پاس آئے اور کہا ”مسٹر تم کیوں روتا ہے۔ بگم صاحب کے اب بچہ ہو گا۔“ میں نے بسور کر کہا ”وہ تو مر گئیں، کہنے لگے، نو۔ نو۔ ابھی جینا سکتا ہے، مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آتا تھا مگر جب دوسرے ڈاکٹروں سے بھی اس کی تصدیق کی اس وقت کہیں جا کر کچھ اطمینان ہوا اور انھیں کے کہنے سے میں زمانے مکرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو ڈاکٹروں کی آوازوں میں بیوی کی آواز سائی نہیں دی لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کی ادھ ادھ بھی سائی دینے لگی۔ ابھی پوری طرح اطمینان کا سانس نہیں لیا تھا کہ بیوی نے زبردست چیخوں پر چیخیں مارنی شروع کیں۔ بھلا ایسی حالت میں مجھ سے دروازہ پر کیا نکالنا تھا۔ بری طرح بھاگا اور برآمدے میں ٹہل ٹہل کر وظیفے پر شروع کر دیے۔ چیخوں کی رفتار تیزی اور بلندی برابر بڑھی چلی جا رہی تھی۔ آخر ایک اس زور کی چیخ آئی کہ تمام گھر مل گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکٹر فی صاحبہ ہنستی ہوئی مکرے سے نکلیں اور میرے پاس آ کر کہنے لگیں ”مبارک ہو بچہ ہوا“ میں نے کہا ”لڑکا یا لڑکی؟“ جواب ملا ”یہ ابھی نہیں بتا سکتی، اب ذرا میرے سوال اور ان کے جواب پر منطقی پہلو سے غور کیجیے۔ یا تو میری یہ حالت تھی کہ ڈاکٹروں کی خوشامد مکر رہا تھا کہ بچہ جائے جہنم میں، کسی طرح میری بیوی کی جان بچاؤ۔ یا اب جو یہ مشکل آسان ہوئی تو یہ فکر پڑی کہ لڑکا یا لڑکی اور ساری مصیبتوں کو بھول کر جنس اختلاف کے مسئلے کو حل کرنے کی سوچی۔ ڈاکٹر نے جو جواب دیا وہ مشاہدہ انسانی کے بالکل خلاف تھا کیا اس امر کا تصفیہ کرنے میں کہ جو بچہ پیدا ہوا ہے لڑکی ہے یا لڑکا کوئی دقت پیش آ سکتی ہے مگر وہ تو کہو کہ ان ماہران فن کو اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانے کا یہی موقع ہوتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فی پھر اندر گئی اور ادھر میں نے شکر اتے کے دو نفل پڑھنے کے لیے جانناڑ بچھائی۔ لیکن یہ دونوں نفل اتنی جلدی ختم ہو گئے کہ مجھے خود تعجب ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہی خیال آتا تھا کہ شاید ایک ہی رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ خیر اللہ میاں تو انسان کی نیت دیکھتے ہیں۔ یہ تھوڑی گنتی ہیں کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔ نماز پڑھیں یا توتے کی طرح ادوان پر چل کر۔ لیجیے ہم بھی بچے والے ہو گئے۔ ابھی یہاں جا کر کیا چل رہی تھیں کہ دانی نے آکر ڈاکٹر پھوڑ گاؤں کر کے کان میں کچھ کہا۔ انھوں نے ڈاکٹر سیفی سے کچھ کاننا پھوسی کی۔ اور ڈاکٹر سیفی نے مجھ سے آکر کہا کہ ”ایک اور آنا مانگتا ہے،“ اب میں بھی دیکھتا کہ وہ ایسے کون بوجھ بوجھ کر ہیں جو ڈاکٹر سیفی کے اس فقرے کو سمجھ سکیں۔ میں نے بلا سوچے سمجھے

”اونھ“ کر دی بگر اس کے ساتھ ہی اندر کے کمرے کی گڑ بڑ اور بیوی صاحبہ کی مکرر اور مستقل چیخوں نے اس فقرہ کے معنی کھول دیے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے والے ہیں۔ بعض دفعہ عالم بالا والے بھی دعاؤں کے سمجھنے میں کچھ غلطی کر جاتے ہیں یہ ضرور ہے کہ میں لڑکے کی دعا مانگتا تھا اور ہماری بیگم صاحبہ لڑکی کی۔ لیکن اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں تھے کہ دونوں کی دعائیں ایک ساتھ قبول کی جائیں اور ایک کے بجائے دو بچے عنایت ہوں۔ مگر کیا کیا جائے، جب دونوں دعائیں قبول ہو چکی تھیں تو ان کا اثر ظاہر ہوئے بغیر یہ کھوڑی سکتا تھا۔ غرض پھر رونے کا وہی غل و شور اندر، اور ٹہلنے اور وظیفہ پڑھنے کا زور باہر ہونے لگا۔ خدا خدا کر کے یہ دوسری مشکل بھی آسان ہوئی اور ہم سمجھے کہ چلو، گنتا نہالیے۔ اس کو کچھ دیر نہ گزری تھی کہ اُبکائیوں کا سلسلہ بیوی صاحبہ نے لگا دیا مجھے ڈر ہوا کہ کہیں تیسرے صاحب تو تشریف نہیں لارہے ہیں۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ آنول نکالنے کے لیے چوڑی کے بال منہ میں ڈال کر یہ اُبکائیاں لوائی جا رہی ہیں۔ اس وقت پریشانی رفع ہوئی۔ غرض اس گڑ بڑ میں صبح ہو گئی۔ ڈاکٹر اپنی اپنی فیسیں لے کر رخصت ہوئے۔ ڈاکٹروں نے دونوں بچوں کو نہلا دھلا کر زچہ کے دونوں پہلوؤں میں لٹا دیا۔ باہر آ کر مجھے مبارک باد دی۔ فیسیں لیں اور خدا حافظ کہا۔ اب گھر میں ہماری بیوی اور ایک کھوسٹ والی رہ گئے۔ شوڑی دیر میں اس نے آکر کہا ”میاں آئیے۔ بچوں کے کان میں اذان دے دیجیے۔“ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ اول تو کبھی اذان دی ہی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ بچے کے کان میں اذان دینے کسی کو سنا بھی نہیں تھا اور سب سے زیادہ مشکل یہ تھی کہ اذان دی جائے تو آواز کو کس درجے تک بند کیا جائے۔ لیکن وقت یہ آن پڑی تھی کہ گھر میں ہمارے سوا کوئی مرد تھا ہی نہیں۔ اس لیے ہم ہی بسم اللہ کہہ کر اذان دینے کو تیار ہو گئے۔ اندر گئے۔ بیوی دو شانہ تانے میں بیٹھی پڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کچھ شرمائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے کہا ”واہ بیوی واہ۔ یا زاتنی ٹھس تھیں کہ ایک بچہ دینا بھی گوارا نہ تھا۔ بابا دو دو کی لین لگا دی ہے۔ اگر بیوی دو اور دو چار اور دو چھ کا سلسلہ چلا تو پھر تمہارا اور میرا اللہ ہی مالک ہے۔ بس اب ایک بات کرو۔ اول تو بچے کے لیے دعا ہی نہ مانگو اور اگر مانگو تو پہلے مجھ سے کہ دیا کرو۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں بھی دعا مانگوں اور پھر اس کی منظوری میں کچھ غلط نہی ہو جائے۔“ بیوی منہ سے تو کچھ نہ بولیں۔ ہاں مسکرا کر

چپ ہو گئیں۔ آپ نے دیکھا کہ واقعات کے تھوڑے سے اول بدل میں میری اور ان کی حالت میں کتنا فرق آگیا۔ سچ ہے دل کو اطمینان ہونے کے بعد انسان کو اسی طرح مذاق کی سوجھتی ہے۔ خیر کچھ کھجی ہو ہم میاں بیوی نے مل کر یہ تو ثابت کر دیا کہ ایک اور ایک بل کر چار ہوتے ہیں نہ کہ دو۔ اور ساتھ ہی میری نقی تمیر کے اس شعر کا کہ :

غم ساتھ ہوا گلی سے اس کی

ایک آئے تھے اور دو گئے ہم

اس طرح جواب دے دیا کہ :

بیوی کے ہوئے ہیں جرطواں بچے

دو پہلے تھے چار ہو گئے ہیں

قصہ مختصر یہ کہ آج کی تاریخ سے ہم کو کسی قدر یقین ہو گیا ہے کہ ہمارا سلسلہ نسب دنیا کی

تاریخ میں کچھ عرصے تک بظاہر چلنے والا ہے۔ لڑکے کا تاریخی نام تو میں نے مشکل و رودخاں رکھ لیا ہے۔

البتہ لڑکی کا نام ٹھیک نہیں بیٹھا۔ اس لیے دوستوں اور عزیزوں اور خاص کر شعراء صاحبان ملک سے

دست بستہ عرض پر داز ہوں کہ کوئی مناسب نام تجویز کر کے ممنون و مشکور فرمائیں۔ لیکن اس کا خیال ہے

کہ اترسوں عقیقہ ہونے والا ہے اور بقول ہماری بیوی صاحبہ کے عقیقہ ہی میں نام ڈالنے کا قاعدہ

ہے۔ اب یہ نام ڈالنا چہ معنی دارد۔ اس کو وہ سمجھتی ہوں تو سمجھتی ہوں میں تو نہیں سمجھتا۔

مہینے کی پہلی تاریخ

اکثر بھلا آدمیوں کے حالات پر غور کرنے کے بعد میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ میاں بیوی میں سب سے بڑا جھگڑے کا جھوٹا بیخودہ حساب ہے۔ یقین مانتے کہ اگر کوئی منڈ اپنے ملازموں کے ہاتھ میں بیخودہ دے کر خود ہی اپنے کسی اہل کار کے ذریعے سے مہینہ بھر کا نقد بھروادے، قضائی کا حساب کرادے، ترکاری والے کا چکلتا کرادے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں خود ہی فراموش کرادے تو جن گھروں میں اسے دن دانتا کھل رہتی ہے وہ ایک قدر موقوف ہو جائے۔ ہاں یہ ضرورت ہے کہ جو اہل کار صاحب مہینہ کا حساب کرنے آئیں ان کو دفتروں سے بجائے شاید اسپتال جانا پڑے۔

دنیا میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ساری کی ساری بیخودہ چھپتے لاکر بیوی کے ہاتھ میں دھو دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خود حساب کرتے ہیں اور حساب سے زیادہ ایک کوٹری بیوی کو نہیں دیتے۔ اور سلف یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں بیوی کو میاں سے شکایت ہوتی ہے اور میاں کو بیوی سے دلوں جھگڑے چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ پندرہ تاریخ آکر ان جھگڑوں کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اور دوسری بیخودہ کا انتظار اس بڑائی کی آگ پر کونڈا ڈھک دیتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ جب میاں پورنی بیخودہ بیوی کو دے دیتے ہیں تو پھر جھگڑے کی

سے اللہ کے فضل سے یہ بھلا آدمی کے گھر کا نقشہ پڑھ کر ہر شخص دل میں قائل ہو گا لیکن انشا اللہ
 امدت حال کی ایک بھی کوشش نہ کرے گا۔ (مصنف)

کون سی صورت رہی۔ جناب عالی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میاں اس طرح جیب نمائی کر کے ٹھک ہو جاتے ہیں۔ آخر وہ بھی آدمی ہیں۔ سیکڑوں شوق ہیں۔ ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ لاکھوں کام ہیں۔ آخر ان کو بھی روپے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اب جو یہ بیوی سے کچھ مانگتے ہیں تو ٹکا سا جواب مل جاتا ہے۔ آپ خود ہی غور کیجئے کہ جو شخص پورے مہینہ بھر محنت کر کے آنکھوں کا تیل نکال کر افسروں کی خفگیوں اٹھا کر گھر میں تنخواہ لائے تو اس کا تنخواہ ہیں کوئی حق ہے یا نہیں۔ میں نے ماما بیوی بڑی چیز ہے۔ مگر صاحب میاں کو بڑی چیز نہ سمجھو تو کم سے کم چھوٹی چیز تو سمجھو۔ یہ کیا کہ بیوی تو ساری تنخواہ اٹھانے کی حق دار ہوں اور میاں کو اس میں سے ایک حقہ نہ ملے۔ بس انھی باتوں پر میاں کو غصہ آتا ہے اور جب یہاں کو غصہ آئے تو پھر بیوی کو کیوں نہ آئے گھر بار کی مالک ہے تو وہ سب روپیہ پیسہ ہے تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ کھانے پکانے کا انتظام ہے تو اس کے قبضے میں ہے۔ اگر میاں کی حکومت دفتر میں ہے تو اس کی حکومت مکان میں ہے۔ یہاں برابر کی جگہ ہے۔ دو کہوگے تو چار ستوگے۔ غرض لڑائی ہوتی ہے اور ثوب ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ٹریفوں میں ڈراکھڑ پسر کی صورت میں ہوتی ہے۔ معمولی وگوں میں ذرا اونچی آواز میں ہوتی ہے۔ اور رذیلوں میں دھواں دھواں ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ہے سب میں۔ ہاں نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ میاں کے پلے کوڑی نہیں پڑتی۔ میاں ہارتے ہیں اور بیوی جیتی ہیں۔

اب دوسری صورت کو بھیجئے کہ پہلی تاریخ ہوتی۔ میاں تنخواہ لائے اور حساب کرنے بیٹھے۔ بیوی سامنے آکر بیٹھ گئیں کا خدا یا۔ میاں نے فونٹین پن نکالا اور رکھائی شروع ہوئی۔
میاں: ہاں صاحب تو اب حساب بولیے۔

بیوی: میں کیا بولوں۔ آخر پچھلے مہینے کا پرچہ کیا ہوا۔ جہاں مہینہ پورا اور تم نے کہا ہاں صاحب اب بولو حساب۔ آخر پرچہ سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔ خدا نے صندوق دیا ہے، میز دی ہے، الماری دی ہے، اللہ کے فضل سے سب چیز رہ جاتی ہے اور نہیں رہتا تو مویہ چار انگلی کا پرچہ۔ دس برس سے حساب کر رہے ہو۔ اور اب تک یہ نہیں معلوم کہ گھر میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ بتاؤں تو میں بتاؤں، نہیں تو آپ ایک حرف نہ

لکھیں۔ اچھا لکھے نیاز کا ایک روپیہ۔

میاں: نیاز کا ایک روپیہ۔ میں نے لکھ تو لیا۔ مگر یہ بتائیے کہ آخر یہ روپیہ ہوتا کیا ہے۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ تم نے کسی کو ہاتھ اٹھا کر ایک پیسہ دیا ہو۔ یا کبھی نیاز کے لیے مٹھائی آئی ہو کہیں ایسا نہ کرنا کہ روپیہ تو تو نیاز کے لیے اور کسی اور کام میں اٹھا بیٹھو۔ خدا کی قسم نیاز کے پیسے میں سے خود اپنے پر کچھ خرچ کرنا بڑا گناہ ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا تم جانو اور تمہارے اللہ میاں جانیں۔ ان کے روپے میں سے حصہ بٹایا تو خود جہنم میں جاؤ گی۔

بیوی بس جی بس ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں کیوں جہنم میں جانے لگی۔ جائیں گے میرے۔ برا چاہنے والے۔ ایسا ہی ہے تو اٹھو اپنی تنخواہ۔ خود ہی حساب کرو۔ خود ہی تقسیم کرو۔ کوٹری کوٹری کا حساب کر کے تو روپیہ کھسکتے ہو اور اوپر سے ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔

میاں: واہ بی واہ۔ تم تو خفا ہی ہو گئیں۔ خدا معلوم تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے کہ ذرا مذاق کیا اور تم بگڑ گئیں۔ اچھا آگے چلو۔

بیوی: مکان کا کرایہ بائیس روپیہ۔

میاں: اف۔ فور۔ خدا غارت کرے اس مکان دار کو ظالم لرا یہ تو پہلی تاریخ آکر وصول کریتا ہے اور مرمت کو کہو تو جواب تک نہیں دیتا۔ سامنے کی دیوار کو دیکھو ادھر کھڑی ہے اب کی برسات میں نہ آپڑے تو میرا ذمہ خدا معلوم کون کون اس کے نیچے دب کر مرنے والا ہے۔ چھتیں ہیں تو ان کی یہ حالت ہے کہ دن کو اس میں تارے دکھائی دیتے ہیں۔ غسل خانہ ہے تو ماشاء اللہ اور ڈیوڑھی ہے تو سبحان اللہ۔ کہو جی اگر یہ مکان چھوڑ دیں تو کیا۔ دفتر کی قربت کی وجہ سے اس کھنڈر میں پڑے ہیں۔ ورنہ خدا کی قسم بائیس روپے میں ایسے چار مکان مل سکتے ہیں۔ بھئی اس مکان دار سے ہم تو تنگ آگے۔ یہ غضب تو دیکھو کہ مکان کی تو یہ حالت اور پچھلے مہینے سے بیس کے بائیس کر دیے۔ تو ہاں مکان کے بائیس روپیہ۔ آگے چلو۔

بیوی: امیرن کے نو روپیے۔

میاں: یہ امیرن کون بلا ہیں۔

بیوی: تم امیرن کو نہیں جانتے۔ اور آخر تمہیں روز روٹیاں ٹھونک کر کون دیتا ہے تم تو دن بدن ننھے ننھے بنتے چلے جاتے ہو۔ سال بھر سے پکانے والی نوکر ہے اس کا حساب کرتے ہو۔ اور پھر پلو چھتے ہو کہ امیرن کون ہے۔

میاں: بیوی۔ تم نے بھی کس سڑیل ماما کو رکھ چھوڑا ہے۔ نکالو چڑیل کو۔ مجھے تو اس کی صورت دیکھے سے لگن آتی ہے۔

بیوی: تو میں کب منع کرتی ہوں۔ نکال دو۔ اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر و منع دار طرح دار خوب صورت ماما کو لے آؤ۔ پھر دیکھو کہ وہ کھانا پکاتی ہے یا اپنی کنگھی چوٹی میں گرفتار رہتی ہے جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہیں۔ تھوڑے دن میں کھلے گا آپ کی ڈیوڑھی اس کے رشتے داروں کی بیٹھک ہو جاتی ہے یا نہیں۔ کوئی بھائی بن کر آئے گا تو کوئی ماموں بن کر آئے گا۔

میاں: خیر جانی کٹی باتیں چھوڑو۔ ہاں یہ بتاؤ کہ یہ بی امیرن جو آٹھ روز گھر میں جا کر بیٹھ رہتی تھیں اس کی تنخواہ ان کو کیوں دی جائے۔ ہم ایک دن دفتر نہ جائیں تو تنخواہ کٹ جائے اور یہ آٹھ آٹھ روز اپنے گھر سے نہ آئیں اور پوری تنخواہ رکھ والیں۔

بیوی: اچھا! کاٹ لو آٹھ دن کی تنخواہ۔ دیکھ لو کل اپنے گھر چلی جاتی ہے یا نہیں۔ یہ تو بڑا غضب ہے کہ کوئی بیمار پڑے اور اپنے گھر نہ جائے۔ کسی کے ہاں شادی غمی ہو اور گھر نہ جائے۔ نوکری کیا ہوئی عذاب جان ہو گئی۔ کوئی اس نے نو روپیے میں اپنے کو بیچا ہے کہ مرتے مر جائے اور آپ کی دلہیز سے باہر قدم نہ رکھے۔

میاں: امیرن کے آٹھ روپیے۔ اور فرمائیے۔

بیوی: آٹھ نہیں نو۔ کلو کے چار روپیے۔

میاں: کلو کے چار روپیے۔

بیوی: کیوں اس کی تنخواہ پر کچھ نہیں کہا۔ میاں کا چاہتیا نو کرے نا۔ جب دیکھو ڈیوڑھی خالی

پڑی ہے۔ کچھ لانے بھیجو تو صبح کا گیا شام کو آئے۔ سو دالائے تو پیسے میں سے پون پیسہ کھا جائے۔ جب آواز دو غائب۔ اور نواب صاحب ہیں کہ گھر سے دور درخت کے نیچے بیٹھے یا لوگوں سے تماش کھیل رہے ہیں۔ جو اکیلے مو اچھا جائے تو میرے دل میں ٹھنڈک پڑے۔

میاں: تم تو خواہ مخواہ جس کے چاہتی ہو پیچھے پڑ جاتی ہو۔ آج کل کے زمانے میں چار روپے پر کہیں نوکر ملتا ہے۔

بیوی: چار روپے۔ تم اس بھروسے پر نہ رہنا وہ اس گھر سے خاصے دس پنرہ روپے اور پیز کر لیتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی کیا بنا ٹھنڈ پھر تا ہے۔ گویا دنیا جہان کی دولت اس کے ہاں آگئی ہے۔ عید میں جو اس نے شیروانی بنوائی ہے وہ تو ذرا جا کر دیکھو۔ دس روپے گز کا کپڑا ہے۔ ایسی شیروانی تم نے ساری عیبی نہ پہنی ہوگی۔ میں خفا ہوتی ہوں تم اس کی پیچ کرتے ہو۔ میں نے بھی سمجھ لیا کہ جب گھر والے ہی گھر لٹوانا چاہتے ہیں تو لٹوانے دو۔ میں بیچ میں بول کر کیوں بری بنوں۔ چار روپے کی تم اس کے دس کروڑ دو میری بلا سے۔

میاں: اجی چھوڑو۔ ان جھگڑوں کو۔ اچھا آگے چلو۔

بیوی: قصائی کے سات روپے۔

میاں: اس کو تو میں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ بمعاش نے سارے مہینے کتوں کا راتب کھلایا ہے۔ ذرا تم ہی ایمان سے کہنا ایک دن بھی گوشت کلا۔ روپے کا دو سیر گوشت دیتا ہے۔ اور اٹھا کر دیکھو تو نرے چھپچھڑے ہوتے ہیں۔

بیوی: نہ دو میرا کب جاتا ہے۔ وہ جانے اور تم جانو۔ تمہارے میاں کلو جانیں۔

میاں: قصائی کے سات روپے۔ اور۔

بیوی: ترکاری والی کے پانچ روپے۔

میاں: ترکاری والی کے پانچ روپے۔

بیوی: بنیے کے پچھتر روپے۔

میاں: پچھتر روپے۔ غضب خدا کا۔ ہم دو میاں بیوی اور یہ دو بچے مہینہ بھر میں

پچھتر روپیے کا اناج کھا گئے۔ آدمی کیا ہوئے پیٹھا رتھو ہو گئے۔
بیوی: کھا گئے یا نہیں کھا گئے یہ تو میں جانتی نہیں۔ لو یہ بنیے کا پرچہ ہے۔ خود دیکھ لو
پچھتر روپیے ہوتے ہیں یا نہیں۔

میاں: (پرچہ دیکھ کر) گہیوں ایک من دس سیر۔ دس روپیے کے۔ کیا بھاؤ ہوئے
روپیے کے پان سیر ہیں۔ تمام دنیا میں غل چج۔ بات کہ غل سستا ہو گیا۔ غل
سستا ہو گیا۔ اور ہمارے ہاں وہی پرانا بھاؤ چلا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ
کسی ایک دوکان سے حساب رکھنے میں یہی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آئندہ میں
میں ہم خود بازار سے جا کر غل لائیں گے۔ گھی سوادس روپے کا۔ گھی کیا ہو گھی
کہتے ہیں جو اس بد معاش کی دوکان سے آتا ہے۔ سارا بنا ہو گھی جوتا ہے بس شہر
کے رہنے میں یہی آفت ہے۔ نہ گھی اچھا ملے نہ غل اچھا ملے۔ نہ گوشت اچھا ملے۔ نہ
نہ ترکاری اچھی ملے۔ مسٹیاں بھر بھر کے۔ روپیہ جائے اور سامان آئے تو اس
شکل کا۔ میں تو اپنا تبادلہ کہیں باہر کر لیتا ہوں۔ کم سے کم یہ گھی تو مے گا جس سے
کچھ طاقت آئے۔ یہاں کیا ہے دس سوادس روپیے مہنے کا گھی کا۔ وہ مسخ پر پانی
پھرنا تو کیسا لٹا معدہ خراب ہو جائے۔

بیوی: اچھا آگے چلو۔

میاں: آگے چلوں کیا خاک۔ نواٹھاؤ اپنا حساب پچھتر روپے لکھ لیتا ہوں۔ ہے یہ کہ
تمہیں گھر داری کرنی نہیں آتی۔ جو چیز آتی ہے چپکے سے رکھ لیتی ہو۔ یہ نہیں بتاؤ
لانے والے کے منہ پر مارو کہ جاؤ ہم ایسا مال نہیں لیتے۔ یہاں محنت کرتے کرتے
ہم موے جاتے ہیں اور بیوی صاحبہ ہیں کہ مالِ مفت دل بے رحم سمجھ کر انہی دھند
لٹائے چلی جاتی ہیں۔

بیوی: یہ بھی اچھی کہی کہ میں آپ کا روپیہ لٹا رہی ہوں۔ کبھی حساب سے یک پیسہ زیاد بھی
مجھے دیا ہے جو یہ طوفان اٹھائے جا رہے ہیں۔ مجھے آپ ایسے کون سے نوے ٹکے
تھمائے دیتے ہیں جو ساری کمانی اٹھانے کا الزام مجھ پر لگا یا جا رہا ہے۔ اٹھاؤ

اپنے روپیے۔ خود ہی کماؤ اور خود ہی اٹھاؤ۔ میں بیچ میں پڑ کر مدت میں بڑی بنوں اپنی نہیں کہتے۔ یہ دوست آئے لاؤ چائے وہ دوست آئے لاؤ کھانا۔ آج ٹھیسٹر چمے جا رہے ہیں۔ کل سینما چلے جا رہے ہیں۔ آپ ہی نہیں جاتے دو تین دوستوں کو سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ پیسہ خرچ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ کیا کسی نفاختے کو یہ بھی نصیب ہوا ہے کہ لوکھنئی روز یہ ہم کو تماشا میں لے جاتے ہیں۔ آج ہم ان کو لے چلیں خود ہی تو تمہاری سہیلی کھلی پڑتی ہے۔ مجھے کیا کہتے ہو۔ پہلے اپنے کو دیکھو کہ تم روپیے لٹا رہے ہو یا میں۔

میاں: سارے دن محنت کر کے تفریح کے لیے شام کو تماشے میں بھی نہ جاؤں تو کیا جاؤں تم کو تو میرا ہر کام برا معلوم ہوتا ہے۔ اور تم ہی کہو کہ جب دو ایک دوست ساتھ ہوں تو یہ کیسے کروں کہ خود ٹکٹوں اور ان سے کہوں کہ میاں تم اپنے ٹکٹ خود خریدو۔ مجھ سے تو یہ بے حیائی نہیں ہو سکتی۔

بیوی: تو میں یہ کیسے کہتی ہوں کہ تم بے حیا بنو۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ جب تم خود روپیہ خرچ کرتے ہو تو اس کا الزام مجھ پر کیوں رکھتے ہو۔ تمہارا روپیہ ہے جس طرح چاہو رکھو۔ جس طرح چاہو اٹھاؤ۔ اگر میں کچھ کہوں تو جو چور کا حال و دیرا حال۔

میاں: اچھا آگے چلو۔

بیوی: دھو بی کے تین روپے۔

میاں: قسم خدا کی دھو بی سے تو میری جان بے زار ہو گئی۔ میری حکومت ہوتی تو سب سے پہلے اس کو سچا نسی پر لٹکا دیتا۔ اب یہی دیکھو کہ میں جو کرتا پہننے بیٹھا ہوں اس کا کیا حال ہے۔ دو دھوپ میں نا معقول نے دھجیاں کر دیا ہے۔ یہ جو کپڑے پھاڑنا ہے آخر تم اس کی تنخواہ میں سے کاٹ کیوں نہیں لیتیں۔ میں پھر وہی کہتا ہوں کہ تم میں مساواتی حد درجہ کی ہے۔ دو دفعہ تنخواہ کاٹ لو تو بیٹا ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

بیوی: لکڑیاں چھو روپیے کی۔

میاں: کیا کہا۔ لکڑیاں چھو روپیے کی۔ ایک مہینہ میں اکھٹی چھو روپیے کی لکڑیاں جلا دالیں۔

روپیے کی چار من تو لکڑیاں آتی ہیں۔ اور ماشاء اللہ آپ کے ہاں چھ روپے کی
جل جاتی ہیں۔

بیوی: روپیے کی چار من لکڑیاں آپ کے گھر میں آتی ہوں گی۔ بڑی مشکل سے پونے
دو من کی ملتی ہیں۔ اور آپ جانیں نہ بوجھیں چٹا عترت اٹھ کر بیٹھتے ہیں۔ خدا جھوٹ
نہ بلوائے صبح کے چار بجے سے جو چوہا سلکتا ہے تو کہیں رات کو بارہ بجے جا کر ٹھنڈا
ہوتا ہے۔ آپ ہیں کہ سنو دھوئیں تو گرم پانی سے۔ وضو کریں تو گرم پانی سے نہائیں تو
گرم پانی سے۔ دن میں کچھ نہیں کچھ نہیں تو بیس پچیس چیس نہ اور بھری جاتی ہیں جب
سارے دن چولہا دھردھر جلے گا تو لکڑی نہ اٹھے گی تو کیا ہوگا۔

میاں: اچھا صاحب تم سچی اور ہم جھوٹے۔ لوکھے لیتے ہیں۔ لکڑیاں چھ روپے کی۔
بیوی: مہتر کا ایک روپیہ۔

میاں: مہتر کا ایک روپیہ۔ مگر ہاں اب یہ دو وقتی کو نہیں آتا۔ ذرا اس سے بہ دینا کہ اب کی
ایسا کیا تو آٹھ آنے کا ٹوں کا غرض یوں ہی حساب کا سلسلہ چلتا رہا۔ اور تان
یوں ٹوٹی کہ

بیوی: قرضے کے اٹھارہ روپیے۔

میاں: خدا کے لیے بیوی تم سب کچھ کرو۔ مگر لہذا قرضہ نہ کرو۔ قرضے کے نام سے میرا دم نکلنا
ہے۔ آخر میں بھی تو سبوں کہ یہ قرضہ ہوا "کا ہے" میں

بیوی: تم بہت دن سے کہہ رہے تھے کہ مجھے چکن کے کرتے بنا دو۔ پیرسوں رام لال بزاز
آیا تھا اس سے دو کرتوں کی چکن لے لی کہو تو واپس کر دوں۔

میاں: تو کیا یہ دو کرتوں کی چکن اٹھارہ روپے کی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ ہوگی کوئی روپے
سوا روپیے کی۔

بیوی: روپیہ سوا روپیہ کیوں کہتے ہو تین چار آنے کہو۔ پورے ساڑھے سات روپے کی بت۔
ساڑھے سات روپیے کی۔

میاں: اچھا ساڑھے سات سات ہی۔ اور باقی۔

بیوی: باقی کامیں نے پیجاموں کا کپڑا لیا۔

میاں: کیوں پچھلے پیجامے کیا ہوئے، دو ہی مہینے تو ہوئے کہ چھ پیجاموں کا کپڑا لاکر دیا تھا تمہیں تو ہوکا ہو گیا ہے۔ نہ یہ دیکھتی ہو کہ ضرورت ہے۔ نہ یہ دیکھتی ہو کہ گھر میں پیسہ ہے۔ جہاں کوئی چیز دیکھی اور لوٹ گئیں۔ ضرورت ہو یا نہ ہو۔ تم کو خرید لینا ضرور ہے۔ میں نے کلو سے کہہ دیا تھا کہ ان بد معاش گٹھے والوں کو دروازے میں نہ گھسنے دیا کر۔ مگر جب گھر کی بیوی ہی روپیہ لٹانے پر آمادہ ہوں تو وہ بچا را کیا کرے۔ بلکہ صاحب تم کو معلوم بھی ہے کہ یہ پھیری پھرنے والے کیا کرتے ہیں۔ بڑی بڑی دوکانوں پر جو پرانا ڈھراننا، سڑا بسا مال ہوتا ہے وہ لے آتے ہیں اور تم جیسی گھر والیوں سے پیسے کے دو پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔ اور فریے۔ کیا اس کے علاوہ اور بھی کسی کو کچھ دینا ہے۔

بیوی: ہاں رامو کے چالیس روپے ہیں۔ دس روپے اس مہینے میں دے دو باقی پھر تھوڑے تھوڑے کر کے دے دینا۔

میاں: رامو کون ہے۔ وہی سوئی پوتھ وان۔ دیکھو بیوی کان کھول کر سن لو۔ مجھے اس عورت کا گھر میں آنا برا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اسی سیدھی چیزیں خرید کر تمہیں فرست لینے کی عادت پڑی ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ اس سے آپ نے ایسی کون سی چیز خریدی ہے۔ جو میرے کام آئی ہے۔ یا آپ کے کام آئی ہو۔ خیر اب تک تو میں نے نہیں کہا تھا ہاں اب کہتا ہوں کہ تم نے اپنے جہیز کا سارا کوٹا کناری اُدھیڑ اُدھیڑ کر اسی کے نزد کر دیا ہے۔ اور اس کے بدلے میں لیا کیا ہے کہ بارہ آنے درجن کی چینی کی رکابیاں، جھوٹے موتیوں کی لڑیاں، جاپان کی بنی ہوئی ٹڑھی گڑیاں غرض ایسی ہی الا بلا خرید کر سارا جہیز نیک لگا دیا۔ اور اس پر بھی بی رامو کے چالیس روپے باقی ہیں۔

لہ جیدر آباد کی یہ گٹھے وایاں ہیں۔ ہر قسم کا سامان خدا جانے کہاں کہاں سے خرید کر لاتی ہیں اور من مانے داموں پر گھروں پر بیچ جاتی ہیں۔ ان کے قرضے کا وہ پھیر ہے کہ مرتے دم تک اس سے بچھا چھوٹنا مشکل ہے۔

ہے یہ کہ تم نے گھر کا خوب گھروا ہا کیا ہے۔ میاں کو تنخواہ تو ہے سوادوسو اور بیوی مہینہ
میں اٹھائیں پونے تین سو۔ آخر یہ گھر چلے گا تو کیسے چلے گا۔ کوئی میرے باپ دادا جاگے
تو چھوڑ نہیں گئے ہیں کہ قرضہ ہوتا ہے تو ہونے دو۔ فصل پر روپیہ آئے گا تو اتنا
دیں گے۔ یہاں تو اسی سوادوسو میں مرنا جینا سب کچھ ہونا ہے۔ اور تم جو کہہ نہیں
کچھ نہ کچھ قرضہ ضرور کر بیٹھتی ہو۔

بیوی: تو میں نے کب کہا کہ خدا کے لیے یہ گھر داری میرے سپرد کرو۔ ایسا ہی ہے تو خود ہی تنخواہ
لاؤ۔ خود ہی اٹھاؤ۔ غضب خدا کا کہ گھر کے خرچ تو خود بڑھائیں اور بیوی پر انھیں
نکالیں۔ جاؤ میں تمہارا روپیہ دو روپیہ نہیں لیتی۔ تم جانو اور تمہارا گھر جانے۔

بیوی چل گئی۔ مگر جناب آپ سمجھے بھی کہ آخر اس گڑ بڑ کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میاں ہوں
یا بیوی بے ضرورت اخراجات بڑھالیتے ہیں۔ تنخواہ آنے پر جب جمع و خرچ پر نظر ڈالی جاتی
ہے اس وقت خیال آتا ہے کہ ہیں یہ قرضہ کیسے ادا ہوگا۔ میاں کو بیوی پر اور بیوی کو میاں
پر غصہ آتا ہے۔ ایک طرف سے حساب پر جاوے جا اعتراض ہوتے ہیں۔ دوسری طرف سے
جلے کٹے جواب دیے جاتے ہیں۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ شرافت پھر بیچ میں پڑ کر صفائی کر دیتی
ہے۔ دوسرے مہینے پھر یہی مصیبت پیش آتی ہے۔ مگر کوئی اللہ کا بندہ خیال نہیں کرتا کہ لاؤ
کچھ اس طرح خرچ کریں کہ تنخواہ میں پوری پڑ جائے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم لوگ
”جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ“ پر عمل کریں اور بے ضرورت خرچ سے ہاتھ روکیں تو
تنخواہ میں پوری پڑنی کیسی انشاء اللہ کچھ پچھ ہی ہو کر یہ جو آئے دن کے جھگڑے ہیں خود بخود
رفع ہو جائیں۔ مگر بھئی ہماری سستا کون ہے۔ خیر ہم تو اپنی سی کہہ دیتے ہیں۔ آئندہ تم جانو
اور تمہارا کام جانے۔

من انچ شرط بلاغ است با تو میگویم تو خواہ از سخنم پسند گیر خواہ ملال

پٹنا

دیوانہ راہوئے بس است

اب اس مضمون کی حد تک دیوانہ تو آپ مجھے فرض کر لیجیے اور "ہو" اس تحریک کو سمجھ لیجیے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے "پٹنے" کے متعلق کی ہے۔ ان کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے جوش ہی تو آ گیا کہ اپنے کسی پٹنے کے واقعے کو لکھ دوں۔ مگر میری بد قسمتی دیکھیے کہ مہینوں تک سوچنے کے بعد بھی کوئی واقعہ یاد نہیں آتا مجھے کیا معلوم تھا کہ مضمون نگار کے لیے "پٹنے" کی مشق کرنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ یقین مانیے کہ اگر مجھے پہلے سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دوچار واقعات اپنے اوپر ضرور نازل کر لیتا۔ اب بھی میں نے بہت کوشش کی کہ خیر جب نہیں پٹے تو اب پٹ جاؤ مضمون تو لکھ لو گے۔ مگر کیا کیا جائے کہ باوجود ایسی کہ روایاں کرنے کے جو ایک بھلے آدمی کے پٹ جانے کے لیے بالکل کافی ہو سکتی ہیں میری یہ ماد کسی طرح بر نہ آئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ مرزا عظیم بیگ صاحب یا کسی اور مزاحیہ نویس صاحب کو دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لائیں تاکہ ان سے پالی میں ایک ایک دو دو چو چوچیں ہو جائیں۔ اس کے بعد یقین ہے کہ اگر میرا مضمون پورا نہ بھی ہوا تو انشاء اللہ ان کا مضمون ضرور کمپلیٹ ہو جائے گا۔ اس لیے۔۔۔ سے صلاے عام ہے یا راں نکتہ داں کے لیے

اے مرداں بکوشید تا جامہ زنان پوشید

ہاں ایک شرط ہے اور وہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے یعنی یہ کہ جو صاحب اس مضمون کی تلاش میں بجز خود یہاں آئیں وہ اپنے نجیب الطرفین ہونے کا باضابطہ رجسٹری شدہ سائٹیفکٹ

لے کر آئیں کیوں کہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے نکتہ خیرے کے ہاتھ سے پٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس سارٹیفکٹ کے ساتھ ہی کسی ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ کا دیا ہوا "اجازت نامہ خودکشی" بھی شریک رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ایک مرزا جی کے ہاتھ کی مار کسی ماٹروازی کی تو ندر کی مار تو ہے نہیں کہ آواز تو آئے "دھن سے" اور چوٹ لگے کسی سڑے ہوئے تر بوز کی بہ حال جو کوئی آئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئے اور ایسی شکل میں آئے کہ مرد اور عورت کی باسانی تیسرے ہو سکے تاکہ پٹ جانے کی صورت میں یہ نالہ و فریاد بلند نہ ہو کہ:

درموتے تو مرد ذات ہو کر "بیر بانی" پیر ہاتھ اٹھاتا ہے

عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "کل شئی برجع الی اصلہ جس کے معنی یہ ہوتے کہ اے لوگوں کسی کام کو اختیار کرنے سے پہلے اس کی اصلیت کو معلوم کر لو گے اس لیے قبل اس کے کہ میرا چیلنج یا "مہارات" قبول کی جائے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس پٹنے کی ترکیب، اس کی تعریف اور اس کی تاریخ سے ہر کہ و مد کو آگاہ کر دوں تاکہ جس طرح ارکان مذہب کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ان کی ادائیگی میں مرزا آتا ہے اسی طرح ہر وہ شخص جس پر پٹنے کا عمل ہونے والا ہے بروقت وقوع واقعا اس سے پوزی طرح لذت اندوز ہو سکے۔

پس جاننا چاہیے کہ علم مجوریات میں یہ ایک ٹھیٹھ ہندی لفظ ہے اور قواعد اردو مولف مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی رو سے فعل متعدی جمہول یعنی یہ کہ اس فعل کا عمل ہمیشہ بے وقوفوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی قوم اور ملک کے لغات میں پایا جاتا ہے۔ جو کسی زبردست خاں کے زیر اثر ہوتا ہے یا ہوتی ہے یا ہونے میں گم اردو کے

لہ جو منی میں اس لفظ کا مترادف "فرالین" ہے جس سے اردو کا لفظ فلا لین نکلا ہے۔ یہ بانی کے معنی ہیں۔ لہ یہ اس کترین کا ترجمہ ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس ترجمہ کرنے میں اپنے استاد مرحوم مولوی نذیر احمد صاحب کے بھی ممنون احسان نہیں ہیں۔ ہذا من فضل ربی لہم خالصاً بنی لفظ ہے اس لیے

ہر کہ شک اردو کا فرگرد۔ ملاحظہ غیاث اللغات طبع ششم مطبوعہ مطبع نو لکثرو واقعہ کا پورہ صفحہ ۳۹ سطر ۱۹۔
گہ یہاں مجھ کو اس مصیبت کا سامنا ہوا کہ "قوم" موٹ ہے اور "ملک" مذکر۔ (باقی حاشیہ نمد پر)

علاوہ ہم خدا کے فضل سے فارسی اور عربی بھی جانتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے زبان فارسی میں ایسے معنی دینے والا کوئی مصدر نہیں ہے وہاں اس کی بجائے لفظ "کشتہ شدن" استعمال ہوتا ہے کیوں کہ جن ملکوں میں زبان فارسی رائج ہے وہاں ایسا کوئی بے غیرت نہیں ہوتا کہ سر بازار یا زیادہ سے زیادہ دیوار کی آڑ میں پٹے۔ اور پھر رسالوں میں اپنے پٹنے کی جواں مردی کا غلغلہ بلند کرے۔ وہاں جب پٹنے کی صورت پیش آتی ہے تو دو میں سے ایک "کشتہ شدن" ہو جاتا ہے۔ اب رہی عربی تو بھلا اس زبان میں یہ منحوس لفظ کیوں آنے لگا۔ بہادر عربوں نے اپنے ہاں ذرا پہلو بدل کر ایک مصدر "ضرب زید عمرو" ایجاد کیا ہے جس کے معنی ہیں کرے گا کوئی اور پٹے گا وہی۔ یہ ایک ایسا وسیع المعنی مصدر ہے کہ ہر فاتح قوم نے اس کو اپنی زبان میں لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ہر فاتح قوم کی معمولی سے معمولی غلطی کا خیارہ مفتوح "دقو مجھے" کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مثلاً میم صاحب سے پٹ کر اگر کوئی صاحب بہادر اپنا غصہ بندریے ولایتی جوتے کے عہد کسی قلی کے "بَيْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ" پر اتاریں اور اس طرح وہ نالائق اپنی تلی پھٹ جانے دے۔ تو ایسی صورت میں اس ولایتی جوتے کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ سارا قصور اس تلی کا ہے جو ایک ٹھوکر کی بھی تاب نہ لاسکی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مہذب ملک کی عدالت "ضرب زید عمرو" کے حاصل مصدر کو پیش نظر نہ رکھ کر یقیناً ولایتی جوتے اور ملزم "دونوں کو بری کرے گی۔ یہ تو ہونی "پٹنے" کی ترکیب اب اس کے بعد اس کی تعریف کو لیجیے۔

لہ قومیہ اسم تصغیرت لفظ قوم کا جیسے سندوق سے سندوقچہ۔ کسی مفتوح ملک کے رہنے والوں کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ قوم استعمال کریں۔ مفتوح ہونے کے بعد وہ قومیہ رو جاتے ہیں۔ (مصنف)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آخر اس جوڑے کے لیے فعل کیا استعمال کیا جائے۔ اس لیے میں نے بلحاظ قوم کے فعل مونث بلحاظ ملک کے فعل مذکر اور بلحاظ "قوم و ملک" کے فعل جمع استعمال کیا ہے اور میری رائے میں اس طریقہ سے زبان دانی میں تہذیب و تائینت کے جو جھگڑے ہیں وہ باسانی مٹ سکتے ہیں۔ (مصنف)

فلسفے میں "پٹنا" اس مسئلے کو کہتے ہیں جس کا مصنوعی جوتی اور جس کا کہہ لی لکڑی ہو۔ اور جس کا نتیجہ ٹائٹ کی صفائی نکلے خواہ وہ چکنائی کی صورت میں ہو یا بھنڈا زرد پھوٹ جانے کی شکل میں۔ سائنس میں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ ایک جسم کے جو ارتح کی گردش سے ہوا کا جوتیوں پیدا ہو کر دوسرے جسم پر ختم ہو اور اس دوسرے جسم کی رنگت کو مائل بہ سرخی کر دے "پٹنا" کہلائے گا۔ طب میں "پٹنے" سے مراد جسم کا وہ ابھار ہے جو مومیائی کھارے اور مہدی چوناملے بغیر دفع نہ ہو سکے معاشرت خانگی میں یہ لفظ بوجہ کثرت استعمال تعریف سے مستغنی ہو گیا ہے اور ارتقاء تہذیب کے لحاظ سے گو اس کی صورتیں بدل جاتی ہیں مگر معنی میں تغیر نہیں ہوتا مثلاً اگر کسی پانسو پانے والے انگریز نما ہندوستانی کی جینٹلمین بیوی بازار سے ایک ہزار کا سامان ایک دم خرید لائیں گے گو تھمڑ کلاس لوگ اس کو "ٹائٹ گنجی ہونا" کہیں گے۔ لیکن مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ اس واقعہ کا اظہار "پٹ جانے" سے کیا جائے گا۔ بہر حال ہمارے روزمرہ کی زندگی میں یہ لفظ ایسا عام ہو گیا ہے کہ امیر ہو یا غریب شریف ہو یا رذیل۔ موٹا ہو یا دبل۔ بنا ہو یا ٹھکانا۔ کالا ہو یا گورا۔ اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ فرق نہ رہتا ہے کہ شریفوں میں اس پٹنے کے اثرات میاں پر اور رذیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور نہ یہ موجودہ کی تہذیب میں انھی مائل بہ سرخی اثرات کو دیکھ کر انسان کی شرافت اور رذالت کا تعین کیا جاتا ہے۔

تحقیق لغت کے لیے لازمی ہے کہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی غور کیا جائے کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی ہے لفظ "پٹنا" میں "تا" تو مصدر کی علامت ہے۔ اب رہ گیا "پٹ" تو اس کے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ اسم صورت ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کوئی پھلکنی یا دسپنا میاں کے کپڑے پٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ مستند انسانوں میں یہ آواز اکثر گھروں سے آیا کرتی تھی اس لیے دوسروں کو اس واقعے کی اطلاع دینے کی غرض سے اس آواز کو مصدر کی شکل بنا کر پٹنا لفظ "پٹنا" کے کہتے ہی سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں گھر میں پھلکنی اور کسی جسم انسانی کا اتصال ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ نے عموماً کی شکل اختیار کی اور برابری "کارروائیوں" کے متعلق جو دو ہستیوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں بولنا ہوتی ہیں اس کا استعمال ہونے لگا۔

اگر اس لفظ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کچھ پٹنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ بچپن میں رونے پر پتلا ہے۔ لڑکپن میں نہ پڑھنے پر پتلا ہے۔ جوانی میں شادی کر کے پتلا ہے۔ بڑھاپے میں دادا۔ نانا بن کر پتلا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اس پٹنے کا سلسلہ مختلف وجوہ اور نئی نئی شکلوں میں جاری رہنے والا ہے جہاں تک منقولی شہادت مل سکتی ہے اس سے ثابت ہے کہ پٹنے کی ابتداء ایک بڑے فرشتے سے ہوئی ہے یعنی سب شاگردوں نے مل کر اپنے استاد کو ٹھونک دیا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ استاد جو شاگردوں کو پیٹتے ہیں تو وہ درحقیقت اسی گستاخی کا بدلہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کو مار بیٹھے تو اس کا یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا افعال انسانی سے بڑھ کر فرشتوں کا فعل ہو جاتا ہے چنانچہ اس لحاظ سے میں بھی ایک دفعہ فرشتہ بن چکا ہوں۔ میں مثل میں پڑھتا تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ترقی پا کر دوسری جگہ چلے گئے اور ان کی جگہ ایک دوسرے حضرت تشریف لائے نام تو ان کا برکت رام تھا لیکن مدرسے میں بلحاظ اپنی چمکی ڈاڑھی کے بکرت اللہ کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ننھی سی ڈاڑھی سے طالب علم کیوں ڈرنے لگے۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوا۔ اور کلاس مکتب بن گئی۔ برابر ہی سید ماسٹر کا کہہ تھا۔ وہ تھے صاحب بہادر اور بڑے کرٹوسے مزاج کے آدمی۔ وہ ایک روز تو ذرا چپ رہے مگر جب اس "ہو حق" کا سلسلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا تو ایک دن صاحب نے بکرت اللہ کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ بیغصے میں بھرے کلاس میں آئے۔ جاتے وقت ایک سوال دے گئے تھے۔ ہم نے حل کر لیا تھا۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ہم نے پنج سے اٹھ خوشی خوشی جا سلیٹ ان کے سامنے کر دی۔ یہ جملے ہوئے تو تھے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ زڑ سے ایک "پٹر" رسید کیا۔ ہم روز ازل سے استادوں کو مارا۔ یہ لکھے ہوئے تھے۔ ادھر انھوں نے ہم کو پٹر ایسا۔ ادھر بکرت اللہ کے پیٹ میں اس زرد سے مکا پڑا کہ بچا رے پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ کچھ نہ پوچھو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ دریافت ہوئی۔ شہار میں لی گئیں اور جو فیصلہ آسمان پر ہوا تھا۔ وہی زمین پر ہوا یعنی فرشتے اپنی جگہ رہے اور ان کے استاد نکالے گئے۔ خیر یہ تو ایک واقعہ معترضہ تھا۔ اب اصلی بحث کو لیجیے۔

تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ میاں بیوی میں اس "پٹنے پٹانے" کا آغاز کب سے ہوا۔ نسل انسانی کے ابتدائی خانگی تعلقات کے متعلق کوئی صحیح روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ شریف سے شریف انسانوں میں بھی اس پر خانہ جنگی ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ سب سے بڑا جھگڑے کا جھونپڑا تو وہی جنت والا معاملہ تھا۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ کسی میاں کے رزق کا دروازہ اگر محض بیوی کی غلطی سے بند ہو جائے تو ان حضرت کو کیا کچھ تاؤ آئے گا۔ اور فطرت انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اس تاؤ کا نتیجہ کیا کچھ نہ نکلے گا۔ جھگڑے کے دوسرے مواقع ان کے ہاں اولاد پیدا ہونے کے بعد سے پیش آنے لازمی تھے اور ضرور پیش آئے ہوں گے۔ کیا ہمارا مشاہدہ نہیں ہے کہ جس گھر میں دو بچے بھی ہوتے ہیں وہاں جس بچے کو میاں چاہتے ہیں اس کو بیوی نہیں چاہتیں اور جس کو بیوی چاہتی ہیں اس کو میاں نہیں چاہتے۔ اور یہی اختلاف "چاہت" اکثر خطرناک صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر بھلا جس گھر میں دن کو ایک اور رات کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہوگا وہاں اراکین خاندان مشتہر کر میں کیا کچھ "اختلاف" نہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن چوں کہ اس مادے میں کوئی عینی شہادت نہیں ہے اس لیے اس پر عقل آرائی کرنی اور قیاس سے کام لینا اصولِ درایت کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی اس کے

لہ یہاں لفظ اختلاف تلمیحاً استعمال ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے چھوٹے بھائی صاحب بڑے غصیلے ہیں۔ انھوں نے ایک گھڑی ساز کو گھڑی بننے کو دی۔ وہ تھے بڑی لمبی ڈاڑھی والے اس لیے دھند کی پابندی ان پر لازم نہ تھی۔ ہزاروں تقاضے کیے گئے مگر اللہ کے بندے نے نہ گھڑی واپس دی اور نہ بنائی۔ ایک دن بات بڑھی اور ہمارے بھائی صاحب نے ان کو خوب ٹھونکا خیر اچھا کیا مگر سوال یہ ہے کہ بلا ضرورت ان کی ڈاڑھی کا کچھ حصہ نوچ کر گھر کیوں لے آئے۔ چند ہی روز کے بعد مجھے بھی گھڑی بنوانے کی ضرورت ہوئی ان کے ہاں گیا ایک روز یہ گھڑی ساز صاحب فرمانے لگے کہ "میاں وہ جو گورے سے صاحب آپ کے ساتھ رہتے ہیں کیا وہ آپ کے بھائی ہیں" میں نے کہا جی ہاں کہنے لگے وہ تو بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مجھ سے بھی بہت دوستی ہے ہاں ایک دن ہمارا ان کا کچھ اختلاف ہو گیا تھا۔ اہل زبان نوٹ کر لیں کہ "شرقا" کی زبان میں "بری طرح پٹنے" کے لیے لفظ "اختلاف" استعمال ہوتا ہے۔ ہذا من کنز الدفایق۔

یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نانا جنگی کا تخم ہماری فطرت میں ابدا رہی سے بویا گیا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ گھ میں اگر اس قسم کی دانتا کلکل نہ ہوئی تو وہ گھر کا ہے" کو ہوا قبر ہو گیا۔

اس کے بعد سے "پٹنے" کے متعلق تاریخی شہادت برابر ملتی چلی جاتی ہے چنانچہ اس بارے میں پہلا تاریخی واقعہ بابیل اور قابیل کا جھگڑا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی۔ اور عموماً جھگڑے کی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی اور اگر معلوم ہوتی بھی ہے تو وہ اکثر غلط ہوتی ہے لیکن اس واقعے سے "جس کی لاشی اس کی سببیں" کا مصدر عالم وجود میں آ گیا اس کے بعد کے واقعات اگر معلوم کرنے اور اس مصدر کے مشتقات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ عالم مؤلف مولفہ مووی فطرت اور مسطہ ضرورت۔

اس قدر سننے اور سمجھنے کے بعد بے کوئی باہمت جو میرے سامنے میدان میں آئے اور نعرہ لگائے کہ۔

منیرہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

نانی چندو

خدا معلوم یہ ہماری نانی چندو دنیا میں تیز ریف ہی کیوں لائیں۔ اور اگر لائی بھی تھیں تو نانا صاحب قبلہ کے حصے میں کیوں آئیں۔ اور اگر آئی بھی تھیں تو ہمارے زمانے تک یہ کیوں زندہ رہیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے مگر ان کی سہولیات میں منزل ہے۔ پہلے حور کی صورت تھیں اس کے بعد انسانوں کی شکل ہوئی اور اب انسان تو کیا شاید کوئی جانور بھی ان کی صورت کا ہو تو ہو۔ پہلے ماہ افروز تھیں۔ اس کے بعد گھٹ کر چاندنی خانم ہوئیں اور اب صرف نانی چندو رہ گئیں۔ اللہ کے بھی کچھ عجیب کارخانے ہیں۔ جوان مرے چلے جاتے ہیں اور نہیں مرتیں تو یہ سوا سو برس کی نانی چندو۔ گھروالے دوسروں کے مرنے پر روتے ہیں اور ان کے جینے پر روتے ہیں۔ خود ان کی یہ حالت ہے کہ مرنے کا نام آیا اور یہ رو دیں۔ مطلب یہ ہے کہ باؤ بزد بھگڑی بیر ہو جانے کے یہ ابھی اس دنیا فانی سے تشریف لے جانا پسند نہیں کرتیں۔ بچوں کو ان کی چڑھا تھ آگئی ہے۔ ایک آیا اور کان ہیں کہ گیا کہ "نانی چندو۔ اب تم کب مرو گی؟" انھوں نے سنا اور کوسنے دینے شروع کیے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور انھوں نے کہا "دیکھنا بوا۔ یہ کون دروازہ دھڑ دھڑا رہا ہے۔ غضب خدا کا۔ مانا میں بہری ہو گئیں ہیں۔ جواب تک نہیں دینیں" ان کا اتنا کہنا اور کسی نہ کسی نے آکر چپکے سے کہ دیا۔ "نانی، تمہارے ہی پاس ایک صاحب آئے ہیں۔" انھوں نے پوچھا "اری، میرے پاس کون آنے لگا تو مجھ سے بھی مذاق کرتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "نانی، میں کوئی جھوٹ تھوڑی بولتی ہوں۔ اللہ میاں نے تمہارے

لے جانے کو فرشتے بھیجے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ نانی چند دنوں میں ہزاروں صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ غرض گھر میں سارے دن یہی آفت بپا رہتی ہے۔ بڑے تو بڑے بچے بھی تو ان کے ستانے میں کسر نہیں کرتے۔ رضیہ مولوی صاحب کے پاس سے آئی سیدھی نانی چند دنوں کے پاس پہنچی اور کہنے لگی "اجی نانی، اجی نانی، آج ہم نے بڑے مزے کا سبق پڑھا ہے۔" انھوں نے کہا "شاباش بیٹا جلدی جلدی پڑھ کر اپنے بھائی سے آگے بڑھ جا۔ ہاں تو نے آج کیا پڑھا؟ رضیہ نے کہا "الحمد۔ نانی چندو۔ چوہاٹکے۔ بلی ٹپکے۔" یہ سننا تھا کہ نانی چندو کا پارہ سوا سو ڈگری پر پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد جو انھوں نے برا بھلا کہنے کی لین لگائی تو جب چینیٹے چینیٹے گلا ہی خشک ہو گیا اس وقت کہیں جا کر چٹکی ہوئیں۔

خیر اب تو یہ نانی چندو ہیں۔ مگر پہلے کی کچھ نہ پوچھو کہ یہ کیا تھیں۔ سارے دلی شہر میں کوٹھوں پر بیٹھے والیوں کی ناک تھیں۔ شکل خدانے وہ دی تھی کہ انسان دیکھے اور عرش عرش کرے۔ آنکھوں میں وہ جادو بھرا تھا کہ جس کو نظر بھر کر دیکھ لیا وہ ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ بڑے بڑے رئیس اور امیران پر لوٹ تھے۔ مگر ان کا وہ رکھ رکھاؤ تھا کہ کسی کو اپنی حد سے بڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ گلا اس غضب کا پایا تھا کہ جس نے سنا وہ محو ہو گیا۔ علم موسیقی میں ایسا دخل تھا کہ تان سین خاں کان پکڑتے تھے۔ بادشاہ سلامت نے بھی کئی دفعہ کوشش کی کہ یہ قلعہ میں آکر کچھ سناؤں۔ مگر ان کا وہ دماغ تھا کہ صاف انکار کر دیا۔ خدا معلوم صحیح ہے یا غلط مگر سنتے تو یہ ہیں کہ بھیس بدل کر خود بادشاہ سلامت ان کا گانا سننے آیا کرتے تھے۔ جب صورت شکل ایسی ہو۔ گلا ایسا ہو۔ آواز ایسی ہو۔ فن ایسا ہو تو پھر روپے پیسے کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ گھر میں بن برستا تھا۔ بڑا زبردست کارخانہ تھا تو کر چاکر، ماما میں، اصدیلیں، غرض سینکڑوں آدمی بھرے پڑے تھے۔ اور اب

اب کی کچھ نہ پوچھو۔ اب تو ان کو دیکھ کر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا کہ یہ وہی ماہ افروز ہیں، جن پر ساری دلی جان دیتی تھی۔ مگر جھک کر دوسری کیا تہری ہو گئی ہے۔ چہرے پر جھبڑیاں اس غضب کی پڑی ہیں کہ ان کو کیا ہوا کپڑا بھی کیا ہو گا۔ آنکھیں اندر دھنس کر غائب ہو گئی ہیں۔ پپوٹوں نے رنگ کر آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ دانتوں نے ٹوٹ کر ہمیشہ کے لیے منہ

کھول دیا ہے۔ زبان کسی روک نہ ہونے کی وجہ سے اکثر باہر نکلی رہتی ہے چو کا دب جانے سے ناک جھک کر ہونٹوں پر آگئی ہے۔ گھٹنے کانوں سے نکل کر سر سے بھی کچھ اوپر نکل گئے ہیں۔ جب یہ بیٹھتی ہیں تو ان کا منہ مانگوں کے عین بیچ میں آ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی کھڑکی میں سے جھانک رہا ہے۔ اب رہی آواز تو آواز میں گورس نہیں رہا پھر بھی بلندی وہ ہے کہ کسی جوان آدمی کی بھی کیا ہوگی۔ بچاری اپنی پہلی حالت کا اکثر ذکر کیا کرتی ہیں کبھی رو دیتی ہیں اور کبھی ہنسنے لگتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ماما ہے۔ شکل و صورت تو کچھ واجبی واجبی ہے۔ ہاں بال اتنے بڑے ہیں کہ سارے ہندوستان میں کوئی دس پانچ عورتوں ہی کے ہوں گے۔ بلا مبالغہ ایڑی تک آتے ہیں۔ ایک دن میری چھوٹی بہن بی عزیزہ نے کہا "نانی۔ میرے بال موعے بڑھتے ہی نہیں۔ چقدر کا تیل ڈالا۔ مہینوں ماش کی دال سے سردھویا حکیم جی کا بتایا ہوا تیل دنوں سر میں رگڑا۔ لیکن بال بڑھتے تو کہاں۔ اُلٹے اترتے چلے جا رہے ہیں کنگھی کرتی ہوں تو لچھے کے لچھے اترتے ہیں۔ اور اس ٹگڑی نفیس کو دیکھو اس کے بال بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ابھی پاؤں تک آتے ہیں۔ آگے چل کر پاؤں میں آئیں گے۔ اور ڈالتی مونی کیا ہے کہ دھوئی تلی کا تیل آخر آپ بھی تو دنیا دیکھے ہوئی ہیں۔ آپ ہی کوئی نسخہ بتائیے۔" نانی چند نے ایک بڑا لمبا سانس کھینچا اور کہنے لگیں۔ "بیٹی کیا بتاؤں۔ تم میرے بال دیکھتیں تو سیران رہ جاتیں۔ اے۔ ہے۔ اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ مجھ سے تو کنگھی بھی نہیں ہو سکتی تھی.... دو دو تین تین ماماں ہاتھ لگاتیں جب کہیں جا کر دو ڈھائی گھنٹہ میں کنگھی ہوتی۔" عزیزہ نے کہا "اے ہے نانی۔ اب تو تمہارے سر میں ان بالوں میں کا ایک بال بھی نہیں رہا۔" بچاری عزیزہ نے تو بالکل بھولے پن سے یہ بات کہی تھی اور بی نانی چند نے اس کو طعنہ سمجھ کر نسخہ بتانا تو کیسا اس غریب کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ایسی بری طرح اس بچاری کو لیا کہ روکھی ہو گئی۔ وہاں سے اٹھ کر دالان میں آئی اور اماں جان سے شکایت کرنے لگی۔ مجھ کو نانی چند کی یہ بات بری لگی۔ چپکے سے وہاں سے اٹھ نصیبن کو جا کر ایک پیسہ دیا۔ اور اس کا ایک بال جڑ سے اکھیر کر نانی چند کے پاس لے گیا۔ انھوں نے جو میری آہٹ پائی تو بولیں "کون۔ سعید۔" میں نے کہا "ہاں نانی۔ میں ہوں۔ آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔" تحفہ کا

نام سنتے ہی بڑی بی کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگیں ”بیٹا، کیا لایا۔ لا دے مجھے۔ کس نے بھیجا ہے۔“ میں نے کہا ”آپ کی جو ماما اختر می تھی نا۔ اس نے بھیجا ہے۔“ بولیں ”ہیں۔ اختر می۔ ایسے کیا بتا ہے۔ اختر می کو مر کر تو پچاس برس ہوئے۔ تو بڑھوں سے بھی مذاق کرتا ہے۔“ میں نے کہا ”نانی جان۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اختر می مر چکی ہے۔ اس نے یہ تحفہ دلی سے تھوڑی بھیجا ہے جنت سے بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کی ایک چیز کفن میں لپیٹ کر چلی آئی تھی۔ میں نے سینت کر رکھ لی تھی۔ خیال تھا کہ جب آپ آئیں گی تو دے دوں گی۔ آپ آنے کا نام ہی نہیں بتیں۔ قیامت قریب آرہی ہے۔ مجھے ڈر لگا کہ آپ کی چیز اگر آپ کو نہ پہنچ گئی تو حشر میں کیا جواب دوں گی۔ اس لیے آپ کو بھیجے دیتی ہوں۔ نانی اماں لیجیے یہ اپنی چیز۔“ میرے مسخرے پن کو وہ اچھی طرح سمجھ گئیں مگر ”چیز“ ایسا لفظ تھا کہ بے اختیار انہوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے نصین کا وہ بال ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ جب ذرا دونوں ہاتھ سے ٹول کر اور کھینچ کر دیکھا تو بال نکلا۔ بڑی بگڑ میں۔ میں نے کہا ”نانی جان۔ آپ خفا کیوں ہوتی ہیں۔ انھی بالوں میں کا ایک بال تو بے جس کی آپ عزیزہ سے اتنی تعریف کر رہی تھیں۔“ میں تو یہ کہہ کر باہر نکل آیا اور ان کی جو زبان چلی تو پھر اس وقت جا کر رکی۔ جب کھانا سامنے آیا۔ اور پلاؤ کی خوشبو ناک میں پہنچی۔

ہماری نانی چند و ندیدی ہیں اور بڑی زور دار ہیں ندیدی اور مجھ سے پوچھو تو دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ندیدہ نہ ہو۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کسی کے ندیدے پن کو اس کے جبہ و دستار چھپائے ہوئے ہیں اور کسی کے عزت و وقار۔ برخلاف اس کے کسی کا ندیدہ پن اس کے افلاس کی وجہ سے ظاہر ہو جاتا ہے تو کسی کے لباس سے۔ مگر میں سب کے سب ندیدے۔ ندیدہ پن بے کیا چیز۔ کسی چیز یا شے کو دیکھنے سے خود بخود اعضا میں ایک خاص قسم کی حرکت یا جوش کا پیدا ہونا کہ اس چیز کو خواہ کسی طرح بھی ہو حاصل کیا جائے۔ بعض لوگوں کے اس خیال کو بوجہ ان کی بزرگی و عظمت کے محسوس نہیں کیا جاتا اور اگر محسوس کیا جاتا ہے تو اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اور بعض لوگوں کے اس خیال کو ان کی کم مانگی و عسرت کے

باعث پوری طرح محسوس کیا جاتا ہے اور دل کھول کر اس پر رائے زنی کی جاتی ہے۔ اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ قصے بیان کیے جاتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے ان کی تشہیر کی جاتی ہے لیکن غور سے دیکھو تو دراصل ہیں دونوں کے دونوں ندیدے۔ کیا آپ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا وہ قصہ بھول گئے کہ کسی امیر کے ہاں دعوت تھی۔ شیخ بھی ان دنوں اسی شہر میں آئے ہوئے تھے۔ دعوت کی سن کر پھٹے کپڑوں اور زدہ حال سے دعوت میں پہنچے۔ دسترخوان پر بیٹھے اور بیٹھتے ہی شیرمال گھسیٹی۔ لوگوں نے ندیدہ سمجھ کر کھڑے کھڑے ان کو وہاں سے نکالا مگر شیخ بھی طرف معجون تھے۔ سیدھے ایک دکان پر گئے۔ مولویوں کا سالباس کرایہ پر لیا اور جون بدل کر پھر اسی دعوت میں آدھکے۔ لوگوں نے ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا انھوں نے دسترخوان پر بیٹھے ہی شیرمال پر ہاتھ ڈالا۔ میزبان نے نکالنا تو کجا ان کی طرف طرح طرح کے کھانوں کی رکابیاں بڑھانی شروع کیں۔ جو رکابی آتی اس میں سے بہت سا کھانا نکالتے اور اپنی آستینوں میں بھر لیتے۔ تمام لوگ ان کی اس حرکت سے حیران تھے آخر انھوں نے ہی یہ معرہ خود حل کیا اور کہا۔ دوستو! تم میری دعوت نہیں کر رہے۔ یہ کپڑوں کی دعوت کر رہے ہو۔ انہی میں خود کچھ نہیں کھاتا۔ ان کے پاس ہی کو کھانا کھدانا ہوں میں تو وہی ہوں جس کو ابھی ندیدہ سمجھ کر تم نے دسترخوان سے اٹھا دیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں قسم کے لباس میں تمھے تو شیخ سعدی ہی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایک دفعہ ان کو ندیدہ سمجھ کر نکال دیا گیا اور دوسری دفعہ ایسی خاطر تواضع کی گئی۔ بات یہ ہے کہ جو اصول میں نے اوپر بیان کیا ہے وہی یہاں بھی پورا اترا کہ محض لباس اور وضع قطع لوگوں کے خیالات بدل دے تو بدل دے ورنہ ہوتے ہیں سب ندیدے۔ خواہ شاہانہ لباس میں ہوں یا فقروں کے چمچھڑوں میں۔

اگر آپ اس واقعے کو محض قصہ سمجھتے ہیں تو خود تجربہ کر لیجیے۔ دو شخصوں کو بلوایے جن میں ایک کو آپ ندیدہ کہتے ہوں اور دوسرے کو سیر چشم۔ دونوں کی دعوت کیجیے لیکن دسترخوان اس وقت تک نہ بچھو ایسے جب تک دونوں کی انتڑیاں قل ہوالہ نہ پڑھنے لگیں۔ اس کے بعد طرح طرح کے خوشبودار کھانے سرپوش سے ڈھکی ہوئی

قابوں میں لاکر دسترخوان پر چن دیکھیے اور تھوڑی دیر تک ان کو یوں ہی بند کا بند رہنے دیکھیے۔ اس کے بعد اپنے دونوں مہانوں کے منہ کسی طرح کھلوا کر دیکھیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے اور یہی ندیدہ پن کی خاص نشانی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک صاحب اس پانی کو گھٹ کر کے نگل جاتے ہیں اور دوسرے کی بانچھوں سے یہ پانی بہہ نکلتا ہے۔ مگر دراصل ہیں دونوں ندیدے۔

خیر یہ تو ندیدہ پن کا فلسفہ اور تجربے ہوئے۔ اب نانی چندو کا ندیدہ پن دیکھیے۔ خدا کی قدرت نظر آتی ہے کہ جس عورت کا دسترخوان کبھی ریسوں اور بادشاہوں کا سادسترخوان ہو۔ جس کو دنیا جہان کی نعمت میسر رہ چکی ہو۔ جس کی تمام عمر اچھی سے اچھی نعمتیں کھا کر گزری ہو۔ وہ اپنی آخر عمر میں ایسی ندیدہ پن ہو جائے کہ گھر میں کسی چیز کا آنا مشکل ہو۔ یہ نہیں تھا کہ گھر میں جو چیز آتی ہو وہ نانی چندو کو نہ ملتی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ جو چیز وہ مانگتی ہوں وہ ان کو نہ منگادی جاتی ہو۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اگر ان کو پلاؤ دو تو ان کا جی دال کھانے کو چاہے اور اگر دال دو تو پلاؤ پر ان کی رال ٹپکے۔ پیٹ بھر کر خربوزے کھائیں اور آنکھ بچا کر تھپکے بھی حلق سے اتار لیں۔

زمانہ مکان میں جو صحن چبوترہ ہے اس کی ایک صحنچی ان کو ملی ہوئی تھی۔ صدر کے جو دالان ہیں ان میں بی اماں رہتی تھیں۔ بی اماں کیا رہتی تھیں۔ ساری گھرداری اسی میں تھی گھر میں کوئی چیز آئی اور نانی چندو کی ناک میں خوشبو پہنچی اور انھوں نے کسی چھو کرمی کو پکارا: 'اری نہیں۔ اری نہیں۔ ذرا ادھر تو آئیو' بھلا چھو کریاں ان بڑی بی کی بات کو کب سننے والی ہیں۔ ایک کان سنا دوسرے کان اڑا دیا۔ مگر بڑی بی کوئی چپ رہنے والی آسامی ہیں۔ کلمہ بھاڑ بھاڑ کر برابر کسی نہ کسی کو آواز دیے ہی جاتیں۔ آخر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ آہی جاتا۔ یہ پوچھتیں: 'بیٹا۔ دیکھیو۔ آج گھر میں کیا میوہ آیا ہے۔ کیا اچھی خوشبو آرہی ہے نارنگیاں معلوم ہوتی ہیں ہاں بیٹا۔ ذرا اصغری سے جا کر کہیو کہ دو پھانکیں مجھے بھی بھیج دیں۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے اور دیکھیو اگر تین پھانکیں لائی تو ایک تجھے بھی دوں گی' اس بچاری چھو کرمی نے اگر بی اماں سے کہا۔ انھوں نے پوری دونارنگیاں اٹھا بڑی بی کو بھیج دیں۔ اب ناممکن ہے کہ

نانی چند و ایک پھانک تو کجا ایک بھورا بھی اس لانے والی چھو کر می کو دیں۔ خود نارنگیاں پھیلیں۔ خود کھائیں اور پھلکے اٹھا صحن میں پھینک دیئے۔ ابھی نارنگیاں کھا کر فراغت کی تھی کہ کوئی بچہ نارنگی کھاتا ہوا ان کی صحنچی کے پاس سے گزرا۔ انھوں نے آواز دی ”کون ہے سعید ہے۔“ اس بچے نے کہا ”نہیں نانی۔ میں ہوں۔ رشید۔ بڑی بی بولیں“ بیٹا۔ ذرا یہاں آؤ، کیا کھا رہا ہے۔ نارنگی ہوگی۔ میٹھی ہے یا کھٹی۔ بیٹا ایک پھانک سہیں بھی دے۔ دیکھ اچھے بچے مل بانٹ کر کھاتے ہیں تنہا خوری اچھی نہیں۔ لا۔ بیٹا، لا۔“ بھلا میاں رشید کیا پکھنے والی آسامی ہیں۔ انھوں نے کہا ”اے ہے نانی جان۔ ابھی تو دو نارنگیاں کھا چکی ہو۔ مجھے تو بی اماں نے چار ہی پھانکیں دی ہیں۔ ان میں سے بھی حصہ بٹوانا چاہتی ہو۔ میں تو نہیں دیتا جاؤ بی اماں سے مانگو۔“ یہ کہہ کر میاں رشید تو چلتے ہوئے اور نانی چند و نے لیکچر دینا شروع کیا ”بس اس گھر کا اللہ ہی مالک ہے بچے ایسے نکلے ہیں کہ فوج کسی کے ہوں۔ ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے اور اس پر نیت کا یہ حال ہے کہ ذرا کچھ مانگو تو سامنے سے مل جائیں۔ کیوں نہ ہو۔ بی اصغری کے بچے ہیں۔ ایسے نہ ہوں گے تو کیسے ہوں گے۔ یہ تو وہ ہیں کہ دوسروں کے حلق میں انگلی ڈال کر کھایا پیا سب نکلوا لیں۔ اور کوئی مرنا بھی ہو تو اس کے حلق میں پانی کی بوند نہ پیکائیں لا حول ولا قوت۔ میری بھی کیا بری قسمت ہے جو اس گھر میں آکر پڑی ہوں۔ وہ کیا مرے میری تو مٹی پلید ہوگئی۔“ غرض اس قسم کی باتوں کا تانتا۔ یہاں تک بندھا کہ بی اماں کو کچھ بن نہ آئی اور نارنگیوں کی ٹوکری کی ٹوکری بڑی بی کے پاس لا کر رکھ دی کہ لونگلو۔ اب نانی چند و کی شرافت دیکھیے کہ چپکے سے لے ٹوکری اپنے ٹین کے صندوق میں بند کر دی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ بچارے بچے یونہی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ایک دن کیا ہوا کہ بی اماں ان کے پاس بیٹھی تھیں کہ اتنے میں ابامیاں نے باہر سے خر بوزے بھیجے اور کہلا بھیجا کہ ابھی کاٹ کر باہر بھیج دو۔ بی اماں نے رکابیاں اور چھری منٹکا کر خر بوزے کاٹنے شروع کیے۔ نانی چند و کی حالت تھی کہ جہاں کوئی خر بوزہ کٹا، اور انھوں نے پوچھا ”دلہن، تم نے چکھا بھی کس مزے کا ہے۔ دیکھنا کہیں کوئی پھیکا خر بوزہ باہر نہ بھیج دینا۔ لوگ کہیں گے کہ ان کو خر بوزے بھی نہیں خریدنے آتے۔ لاؤ مجھے دو۔ میں

چکھوں۔" بی اماں جو خربوزہ کاٹتیں اس کی ایک پھانک ان کو بھی دیتیں۔ دس بارہ خربوزے تھے اتنی پھانکیں کھا کر بڑی بی کا پیٹ بھر گیا ہوگا۔ مگر نیت کا کیا علاج۔ رکابیاں باہر گئیں۔ بی اماں کسی کام سے دالان میں آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جو جا کر دکھتی ہیں آدھے چھلکے غائب ہیں ادھر دیکھا "ادھر دیکھا جب کہیں نظر نہ آئے تو گل بدن سے بلا کر پوچھا کہ آخر یہاں سے چھلکے کون اٹھا کر لے گیا۔ گل بدن بولی۔ "لے جانے کون لگا۔ بڑی بی کھا رہی تھیں اور اگر آپ نہ آجائیں تھوڑی دیر میں یہ باقی آدھے چھلکے بھی ختم تھے۔" یہ سن کر بی اماں کو بہت غصہ آیا اور کہا: "اماں جان! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے خدا کے لیے ایسی باتیں تو نہ کیا کیجیے۔ گھر میں جو چیز آتی ہے وہ پہلے آپ کو ملتی ہے۔ اور ملتی بھی ہے تو سب سے زیادہ۔ آخر اس طرح کی باتوں سے کیا فائدہ۔ گھر کی مائیں سنہتی ہیں۔ چھوکر یاں مذاق اڑاتی ہیں۔ گھر گھر آپ کی یہ باتیں پھیلتی ہیں۔ ہم کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ خدا کے لیے جس چیز کو آپ کا حی چاہے وہ منگو الیا کیجیے۔ اور پیٹ بھر کر کھا لیجیے اور اللہ یہ چھلکے کھانا چھوڑے۔ کہیں ان کو معلوم ہو جائے تو دیکھیے کیا عمل مچاتے ہیں۔"

اب نانی چندو کا ظلم دیکھو کہ بجائے اس کے کہ شرمندہ ہوتیں۔ الٹی بی اماں کی جان کو آگئیں۔ اپنے کو کون سے دیئے۔ مرنے والوں کو برا بھلا کہا۔ گھر بھر کی نکتہ چینی کی۔ چھلکوں کو گالیاں دیں۔ غرض دو گھنٹے تک یہی باجا بجاتا رہا۔ بی اماں تو گھبرا کر وہاں سے اٹھ آئیں۔ ہاں نانی چندو کا بڑ بڑانا ادھی رات تک یوں ہی چلتا رہا۔ جب نیند نے ان کی آنکھیں ہی بند کر دیں اس وقت کہیں جا کر امن چہن ہوا۔

سعیدہ کی گڑ یا کا واقعہ نانی چندو کی سب سے بڑی کارگزاری ہے۔ ہوا یہ کہ سعیدہ اپنی سلولائیڈ کی گڑ یا لے کر ان کے پاس پہنچی۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھیلتی رہی اور اس کے بعد گڑ یا وہیں چھوڑ کر دالان میں چلی آئی۔ نانی چندو نے گڑ یا کو اٹھا کر دیکھا تو بڑی ہلکی پھلکی تھی۔ ان کے زمانے میں کپڑوں کی گڑیاں بنتی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس چیز کی بنی ہے۔ دکھائی کم دیتا تھا۔ پھر بھی بہت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گڑ یا کو دیکھا۔ گردن کو ذرا مڑوڑا۔ وہ تو تانگے سے جمی ہوتی ہی ہے لوٹ کر ہاتھ میں آگئی۔ سمجھیں شاید شکر کی گڑ یا ہے

چپکے سے سارے کا سارا منہ میں رکھ لیا۔ مگر کچھ مزہ نہ آیا۔ یہ تھوکننا چاہتی تھیں کہ اتنی دیر میں سعیدہ آگئی۔ اس نے جو دیکھا کہ بڑی بی بی بیٹھی اس کی گڑیا کا سر چبارہی ہیں تو اس نے ایک کہانی نہ دو۔ ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور لگی غل مچانے۔ سارا گھر جمع ہو گیا کہ خدا جانے سچی کو بچھونے کاٹ لیا یا بھڑچٹ گئی۔ جب سعیدہ نے دیکھا کہ ہاں اب سب آگئے تو اس نے نانی چندو کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔ ہاتھ کا ہٹنا تھا کہ پٹ کر کے گڑیا کا سر بڑی بی بی کے منہ میں سے نکل پڑا۔ اس کے بعد جو نانی جان فیمل لائی ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک تو بچاری سعیدہ کی گڑیا کا سر چبارہ گئیں دوسرے الٹا چور کو تو الٹ کو ڈانٹے۔ خود اس کے سر ہو گئیں کہ اس لڑکی نے زبردستی یہ میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ تو کہو بو انصیبین یہ سارا تاشا شروع سے دیکھ رہی تھی جو بی سعیدہ بچ گئیں۔ نہیں تو مفت میں ان کی کندھی ہو جاتی۔

بہرا

کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی اماں ہے۔ ہم اس مقولے پر ایک نہیں تین صاوا کرتے ہیں۔ دور کیوں جائیے خود ہم ہی پر اندازہ کر بیجیے کہ یہ بات صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آئی سی۔ ایس والے نہ ہوتے تو ہندوستان کا کام کیسے چلتا اور اگر ہم بہرا لوگ نہ ہوتے یہ بچارے آئی سی۔ ایس کہیں کے نہ رہتے۔ ہے یہ کہ ہندوستان کی یاگ ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کی لگام چارے ہاتھ میں ہے۔ خبر نہیں کہ کیوں کانگریس والوں نے ان غریبوں کو بدنام کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہندوستان کی دولت گھسیٹتے لیے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جو وہ کاتے ہیں وہ سارے کا سارا ہمارے ذریعے سے تم ہی کو تو پہنچ جاتا ہے۔ ان کا حساب ہم سے پوچھو۔ بھلا دوسرے گھ کا حال تم کیا جانو۔ سنیے صاحب۔ ہم ان کے گھر کے مالک ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تنخواہ تو تنخواہ۔ ان کے گھروں سے ہی کچھ آکر یہاں اٹھ جاتا ہے۔ ہاں یہ نہ ور ہے کہ اگر ہمارا قدم در میان میں نہ ہوتا تو تم سچے ہوتے اور تمہارا کہنا بالکل سچا اور ایسی حالت میں اگر ہندوستان لٹ بھی جاتا کوئی تعجب کی بات نہ تھی میرے صاحبوں والے صاحب کچھ پیسے جمع کر کے لے جاتے ہوں تو لے جاتے ہوں۔ بن بیا ہے بے چارے تو ننگے ہی آتے ہیں۔ ننگے ہی رہتے ہیں اور ننگے ہی جاتے ہیں۔ بھلا آپ ہی سمجھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کا ایک بھائی ان لوگوں کے خزانے کی کنپی ہو اور ہندوستان کی دولت کھسک جائے۔ ابق حضرت تو بیکھیے تو بے۔ یہ کام لکچروں سے نہیں چلتا۔ اس کے لیے سمہت اور عقل چاہیے اور خدا کے فضل سے ہمارے پاس اس کا توڑا نہیں ہے۔ کبھی آکر ہم سے

حساب کتاب کیجیے تو حال کھلے کہ ہم صحیح کہتے ہیں یا آپ۔

یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے دنیا بھر کے اختیارات ان آئی۔سی۔ ایس والوں کو دے دیے ہیں مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ان بے چاروں نے اپنے گھر کی ساری حکومت کھانے پینے کا انتظام رکھنے ڈھکنے کا بندوبست، نوکروں کا تقرر اور برطرفی۔ روپے پیسے کا اٹھانا رکھنا۔ خرید و فروخت کے اختیار سب کے سب ہمارے سپرد کر دیے ہیں اور سچ یہی ہے کہ یہ غریب سارے دن سہ مغزنی کر کے آتے ہیں ان سے کہاں گھر کے انتظام کا وبال اٹھ سکتا ہے۔ اب ہم میم صاحبیں تو ان کو دوکانداروں کی فہرستیں دیکھنے اپنے بال بھونری درست کرنے، دوسری میم صاحبوں کی برائیاں کرنے، صاحب لوگوں کی کارروائیوں کی ٹوہ لگانے، شام کو ٹینس کھیلنے، سوا خوری کو جانے اور ایسے ہی ہزاروں کاموں سے کہاں فرصت ہے جو یہ دیکھیں کہ گھر کیوں کر چل رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی صاحب بہادر اگر کوئی فقیرنی میم صاحب کو لاتے ہیں تو وہ ہمارا بھی ناک میں دم کر دیتی ہے خدا ایسے نریدوں اور کنجوسوں سے بچائے کہ نہ خود کھائیں نہ دوسروں کو کھانے دیں ہم تو یہی کہیں گے کہ بھئی آئی۔سی۔ ایس والے اچھے اور بہت اچھے، ہاں ذرا ان میم صاحبوں کی وجہ سے بدنام ہو گئے ہیں۔ ہم ایک ترکیب بتاتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بطور تجربہ سہ کار۔ اس پر عمل کر لے پھر ہم بھی دیکھیں کہ کون ان کو برا کہتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے بھی تو ہم اس کی گردن موڑنے کو بہ وقت تیار ہیں۔ بڑے بڑے حساب دانوں کو گھر کا بھٹ دکھا کر قائل کر دیں کہ ان لوگوں سے ہندوستان کو کیا کیا فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ یہ لوگ چیلنی ہیں ادھ ڈالا ادھ نکل آیا۔ ہاں تو وہ ترکیب یہ ہے کہ جس طرح آئی۔سی ایس کا امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح ان میم صاحبوں کا بھی امتحان قائم کر دیا جائے اور جب تک کوئی میم صاحب اس امتحان میں پاس نہ ہوں ان کا کسی آئی۔سی۔ ایس سے نکاح نہ ہونے پائے اس امتحان کا نصاب بس یہی ہو کہ تم بڑے لوگ ہو۔ گھر چلانا تمہارا کام نہیں۔ تم ہندوستان کو چلاؤ۔ بہر لوگ تمہارا گھر چلائیں گے کسی شریف کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے بازاروں میں سامان کا بھاؤ پوچھتے پھرنا تمہاری شان کے خلاف ہے۔ اگر سامان مہنگا بھی آتا ہے تو کچھ پر وا نہیں۔ یہ آئی سی ایس کا

گھر ہے کسی فقیر کا گھر نہیں۔ اگر صاحب کو بہرا لوثنا ہے تو تم اپنی آیا کا گھر بھر دو۔ اور ایسے ہمت کے کاموں میں بہرگز صاحب سے دب کر نہ رہو۔ تمہارا کام بڑی بڑی شاپوں میں جانا اور دل کھول کر اچھا اچھا اور قیمتی مال خریدنا ہے۔ یہ نہیں کہ دو پیسے کے انڈوں کے لیے ہر ایک کے منہ لگتی پھرو۔ اگر کسی کی برائی کرنا ہے تو اپنے برابر والے کی برائی کرو۔ کسی۔ آئی۔ ایم ایس یا کسی آئی۔ ای۔ ایس کی نیم صاحبہ یا صاحب کے کرتوتوں کا پتہ لگاؤ۔ دنیا بھر میں ان کا راز افشا کرو۔ تاکہ گورنمنٹ کو بھی معلوم ہو جائے کہ فلاں میم صاحب شہر کے معاملات میں بڑی گہری نظر رکھتی ہیں۔ خیر فی الحال اتنے ہی مضمون پڑھا دیے جائیں تو کافی ہیں۔ تجربے کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو ان میں اضافہ، ترمیم یا تبدیلی ہو سکے گی۔ اگر ایسے چندہ جوڑے آنے لگیں تو پھر دیکھیے کہ ہندوستان کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ اور خود یہاں والے ان آئی۔ سی ایس والوں کو لالہ دھن سنگھ اور مولوی دولت خان پر ترجیح دینے لگے ہیں یا نہیں بات یہ ہے کہ ایک مچھلی جل کو گندا کر دیتی ہے بعض صاحب بہادر خدا معلوم کہاں سے ادھر ادھر کی پکڑ لاتے ہیں اور ان کی وجہ سے بیٹھے بیٹھائے خواہ مخواہ بدنام ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بھئی ہم تو یہی کہیں گے کہ ایسے لکھ لٹ دنیا میں شاید ہی کہیں اور ملیں تو ملیں۔ ہماری نظر سے تو گزرے نہیں۔ یہ تو آپ مانتے ہوں گے کہ آئی۔ سی۔ ایس والوں کی لیاقت کے بارے میں :

ہر کہ شک آرد کافر گردو

یہ سمجھنے کے بعد ان لوگوں کی قابلیت کی داد دیجیے جو ایسے لائق لوگوں کی باگ تھامے ہوئے ہیں۔ میں تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا نصاب مرتب نہیں کر سکتیں جس کو پاس کر کے کوئی شخص بہرا بن سکے۔ حضرات یہ علم سینہ ہے، علم سفینہ نہیں سائنسی علم دریا ہے۔ تو بہرائی علم سمندر ہے۔ خیر اب تو موٹریں نکل کر سائنسوں کے علم کا دریا ہی خشک ہو گیا۔ اور مجھ سے پوچھو تو پہلے بھی یہ کیا خاک علم تھا۔ مٹھی بھر چنے چرا کر دھوتی میں اڑس لینا بھی کوئی کمال ہے۔ کمال ہمارا ہے کہ لیتے ہی نہیں لوٹتے ہیں۔ آنکھوں میں خاک جھونک کر لوٹتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ لوٹتے ہیں۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تڑا پڑ حساب دیتے ہیں کہ صاحب تو صاحب اجی میم صاحبہ کی بھی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ حساب سمجھانے کا یہ کچھ کم کمال ہے کہ

اگر کاغذ پر لکھ کر جوڑو تو روپے کے بارہ آنے آئیں اور انگلیوں پر گنو تو اٹھارہ آنے ہو جائیں اور دو آنے خود صاحب کو اپنی گڑھ سے بھرنے پڑیں۔ کوئی اس طرح حساب دے کر اپنے علم سے کسی کو قائل کر دے تو ہم جانیں اور یوں بیوں کی طرح بیٹھے حساب لگانے سے کیا ہوتا ہے۔ کسی صاحب بہادر کی ڈانٹ اور میم صاحبہ کی گھر کی کے بعد زبان ہلا سکیں تو ہم بھی مانیں کہ ہاں لالہ جی حساب جانتے ہیں۔

حساب تو حساب جب ہم صاحب کا کوئی راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اس وقت ہمارا رنگ دیکھیے۔ یہ نہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی طرح نوکر چاکروں سے گن گن لیتے پھر میں یا ماماؤں کی طرح دروازے سے چپک کر دوسروں کی باتیں سنیں۔ اجی ہم وہ ہیں کہ تنہ ہوئے سامنے کھڑے ہیں اور صاحب بہادر مزے سے اپنا کچا چٹھا بیٹھے سنا رہے ہیں ہیں تو یہ کہوں گا کہ خدا ڈیوار (DEWAR) اور کینین (BUCHANAN) کے کارخانوں کا بھلا کرے۔ وہ وہ وسکیاں نکالی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جس کو ہاؤس آف لارڈز پلا دی وولٹ صاحب ہو گیا۔ اور جس کے حلق سے کنگ جارج دی فورٹو اتا ردی وہ بادشاہ بن گیا۔ اور جس کو وائٹ ہارس چکھا دی وہ بدر منیر کے گھوڑے پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کرنے لگا۔ ہم نے بڑے بڑے صاحب بہادروں کو دیکھ لیا۔ ادھی بی بوتل میں بلبل کی طرح چمکنے لگتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں کہ جاتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے دہرا دی جائیں تو اپنا گلا کاٹ مریں یا ہمارا گلا گھونٹ دیں۔ یہ ہماری عالی ظرفی ہے کہ سب کچھ سنتے ہیں اور زبان پر کچھ نہیں لاتے۔ یہی تو وجہ ہے کہ بعض صاحب بہادر اس ڈر سے کہ کہیں خانہ جنگی نہ ہو جائے۔ ہمارے نازا اٹھاتے ہیں اور بعض اس خیال سے کہ کہیں نشے میں کوئی سرکوبی راز منہ سے نہ نکل گیا ہو ہماری مٹھی میں رہنے ہیں۔ اور ہمارا یہ نفع ہے کہ پہلا پیگ خالص پلا یا۔ دوسرے میں آدھا پانی ملا دیا اور ہوتا ہوتا خالص پانی پر لاڈ الا۔ اگر کہیں تین چار گھنٹے صاحب اور ان کے دوستوں میں دور چل گیا تو ہم غریبوں کے پانچ سات روپے سیدھے ہو گئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ رازداری اچھی یا راز کا افشا اچھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ راز کا چھپانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے طرف چاہیے۔ اور اس کو ڈاٹ لگا کر کھنے کے لیے

صاحب بہادر میں ہمت۔ رازوں میں جتنا انصاف ہوگا اتنا ہی ان کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔ اور جتنے وہ روکے جائیں گے اتنا ہی ہمارا رتبہ صاحب کی نظروں میں بڑھے گا انڈیا کی قیمت بڑھے گی، گوشت کا بھاؤ چڑھے گا تو سلائی کے دام زیادہ ہوں گے، سامان کی قیمت میں انصاف ہوگا۔ غرض ہر طرف سے آمد ہی آمد کی صورت نکلے گی اور جو کہیں خدا کی قدرت سے اس رازداری میں کسی دوسری طرح کے راز داخل ہو گئے تو پھر کیا پوچھتے ہو صاحب ہمارے اور گھر ہمارا صاحب تنخواہ لائے اور ہمارے حوالے کر دی ہم نے مہینے سے پہلے ہی پہلے حساب ان کے ہاتھ دیا۔ اب باقی مہینہ جانے اور صاحب جانیں۔ ادھر ادھر سے قرض دام لے کر انھوں نے پونہ پورا کیا غرض ہوتے ہوتے صاحب کا یہ کام رہ جاتا ہے کہ مہینہ بھر محنت کر کے تنخواہ مع "اور کچھ" کے لائیں اور ہمارے حوالے کر دیں، نہیں تو جانتے ہیں کہ راز کا پٹا رکھنا اور گھر بنگرنا۔

بعض بہروں کی یہ قسمتی قابل غموس ہے کہ ان کو ایسے صاحب لوگوں سے پالا پڑتا ہے جو دو ہی چلو میں نہیں ہو جاتے ہیں۔ بھلا ان کے بہرے بچائے اگر مفلس نہ ہوں تو کیا ہوں۔ خیر ہے تو ہمارا نقصان لیکن ہم سرکار کو ایک مشورہ دے دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں یہ شرط لگادی جائے کہ وہی لوگ امتحان میں لے جائیں گے جو ایک پیگ میں غین ہو سکتے ہیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ گورنمنٹ کے راز مینے کی گورنمنٹ بن جائیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن ہمارے نقصان کی تلافی رعایتی وظیفوں سے باسانی کی جاسکتی ہے۔ خیر کہنا ہمارا کام ہے۔ ماننا نہ ماننا گورنمنٹ کا کام۔

کچھ رازداری ہی کی وجہ ہے جو ہم کو بہرا کہا جاتا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گونگے کا بہرا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں بہرے کا گونگنا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ہمارا خطا تو دراصل بہرا گونگنا ہے۔ لیکن اختصار کے طور پر بہرا کہا جاتا ہے اور اس میں گونگے کا مفہوم بھی پوری طرح آ جاتا ہے لوگ آپس میں کچھ ہی باتیں کیوں نہ کریں ہمارا وہاں ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور ہم کو کبھی فخر ہے کہ تمام ہائی کوریوں کی رپورٹیں اٹھا کر دیکھ لیجیے

آپ کو کہیں نہ ملے گا کہ کسی بہرے نے طلاق کے کسی مقدمے میں گواہی دی یا صاحب اور میم صاحبہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کی تمام مثلیں چھان ڈالیے آپ کہیں نہ پائیں گے کہ کسی بہرے نے راز افشا کیا بعض میم صاحبوں کی باتوں سے دل تو بہت جلتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ اس گھر کے گھر کو آگ لگا دیجئے مگر ہم لوگ شریف ہیں، مصیبتیں جھیلنے ہیں، تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ جس گھر کو جھاڑو دے کر صاف کیا ہے اس کو پھونک بھی دیں ایسے تنگ نظر دیسی لوگ ہوتے ہیں ہم ولایتی نوکر ہیں، بھلا ہم اور ایسی رکیک حرکت کریں۔

اس خدمت کی وقعت کے متعلق مجھ سے پوچھو تو میں یہی کہوں گا کہ بہرا جیسی ہستی ساری دنیا میں ملنی مشکل ہے۔ ہاں مقابلے پر آپ کسی کو لاسکتے ہیں "تو وہ" آیا اماں ہیں مگر تو یہ کیجیے کہاں وہ اور کہاں ہم۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک بھلا لومڑی اور شہ کا کیا مقابلہ رذیل کو شریف سے کیا نسبت۔ آیا اماں لاجوں و لاقوۃ۔ پھلیاں وہ کھائے لگائی بھائی وہ کرے جھوٹ وہ بولے ضرورت ہو تو صاحب سے نظر بازی وہ کرے، میم صاحبہ کی یرائیاں دنیا میں وہ پھیلاتے اور مزایہ ہے کہ پچھ میم صاحبہ کی رازدار کہلا کر نوح نوح کر کھائے اجی حضرت اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پر کھنے والے پر کیا دوش۔ ہمارے ملک کی بی نالائق عورتیں ہی بچاری میم صاحبوں کو بہر کاتی ہیں ورنہ وہ غریب کیا جانیں کہ بیگن کا کیا بھاؤ ہے۔

میں بھی ایک دفعہ اسی چکر میں آچکا ہوں ہمارے صاحب سبحان اللہ کیا تعریف کروں بڑے میاں آدمی تھے۔ ہم ہی گھر چلاتے۔ ہم ہی کھاتے اور ہم ہی کھلانے خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ وہ ولایت جانا معلوم کہاں سے ایک زرغل کو بیاہ لائے صورت دیکھو تو چہاریوں کی سی دماغ دیکھو تو پریوں کا سا میم صاحبہ کے آتے ہی ان کی دم یعنی آیا اماں بھی آبراجیں۔ یقین مانئے کہ ایسی بد معاش تھی کہ خدا کی پناہ آتے ہی پہلے مجھ سے سوال کیا کہ "بہرا بھائی، ہم کو کیا حصہ ملے گا؟" میں ٹھیرا گھر کا مالک اس زور سے ڈانٹا کہ گھبرا گئی سمجھ گئی ہوگی کہ یہاں دال گلنا ذرا مشکل ہے میم صاحبہ سے مل کر بہرا کو چلتا کرنا

چاہیے۔ میم صاحبہ کو ہماری زبان نہیں آتی تھی مگر ظالم نے خدا جانے کہاں کہاں سے کتابیں منگوا کر تھوڑے ہی دنوں میں خاصی سیکھ لی پہلے شاید کوئی گالیوں کی کتاب منگوائی تھی کیونکہ آنے کے مہینے بھر کے اندر ہی اندر خاصی موٹی موٹی گالیاں دینے لگی اس کے بعد کچھ اور پڑھا ایک دن چائے پیتے پیتے کہنے لگیں ”ول، بہرا، جنٹ صاحب کے ہاں انڈیا پیسے کو آتا ہے۔ تم دو آنہ کیوں لیتا ہے، صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے۔ مگر بیوی کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گئے میں سمجھ گیا کہ آیا اماں کا یہ پہلا وار ہے میں نے کہا حضور جس طرح جنٹ صاحب کے ہاں انڈے آتے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو۔ اس طرح پیسے کے چار انڈے لادوں بات یہ تھی کہ جنٹ صاحب ذرا کچھ..... بس رہنے دیجیے کیوں دوسروں کا عیب کھوں یہ حال میم صاحب کو بھی معلوم تھا کہنے لگیں ہم اس طرح کا انڈا نہیں مانگتا۔ دروازے سے لگی ”آیا اماں“ کھڑی تھیں سمجھ گئیں کہ یہ استاد ہی وار خالی گیا۔ دو تین روز دے کر اس چڑیل نے دوسرا حملہ کرایا۔ صبح خانہ ہی پر میم صاحب آئیں ایک انڈا اٹھایا یا الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگیں ”دل جنٹ صاحب کی بات ٹھیک نہیں گڑھ کپتان کے ہاں تین پیسے کو انڈا کیوں آتا ہے۔“ میں نے کہا ”حضور وہ غلیظ انڈے کھاتے ہیں۔ ہمارے صاحب کے ہاں اول نمبر کے انڈے آتے ہیں۔“ میم صاحبہ کچھ منہ بنا کر چپ ہو رہیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس شام کو میم صاحبہ اور صاحب موٹر میں ہوا خوری کو نکلے مجھے پیچھے بٹھایا ایک گلی میں سے جو گزرنے لگے تو میں نے دیکھا کہ بہت سی مرغیاں ڈلاؤ کر یہ کرید کرید کر کھا رہی ہیں بھلا ایسا موقع ملے اور میں جانے دوں۔ میں نے کہا ”دیکھیے میم صاحبہ یہیں سے گڑھ کپتان صاحب کے ہاں انڈے جاتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں بھی کل سے انھی مرغیوں کے انڈے لایا کروں“ صاحب بولے ”ہم ایسا بڑا انڈا نہیں مانگتا“ میم صاحبہ بھی ذرا چپ ہوئیں میں نے کہا صاحب آپ کے ہاں اصیل کے انڈے آتے ہیں۔ واجد علی شاہ بادشاہ تھے تا۔ ان کو خانہ انی مرغیوں کا بڑا شوق تھا۔ کابل سے مرغیاں منگوائی تھیں ان مرغیوں کا خاندان اب تک چلا آ رہا ہے میں تو وہیں سے انڈے لاتا ہوں گھر پر آنے کے تھوڑی دیر بعد آیا اماں کو دیکھا تو ذرا جھپسی جھپسی سی تھیں۔ دبی دبی زبان ہی مجھ سے پھر پتی کو کہا میں نے کہا ”چل چڑیل پہلے دیتا بھی تھا تو

اب کوڑی نہیں دوں گا۔ جا اپنی اماں کو اور بھڑکا۔ اس گھر میں یا تو رہی یا میں رہا۔“ جل کر کونہ ہو گئی۔ اندڑوں کی سخت ختم نہ ہوئی تھی کہ گوشت کے بھاؤ پر جھگڑا چلا۔ میں نے لاکھ سرمارا کہ صاحب اچھا گوشت بارہ آنے سیر سے کم نہیں ملتا مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ بازار میں گوشت کا بھاؤ ساڑھے چھ آنے سیر تھا۔ آیا اماں اپنے پاس سے پیسے ملا چار آنے سیر لے آئیں۔ میں نے اس دن صاحب سے ایک روز کی چھٹی لی لیکن چلتے چلتے چپکے سے گوشت پر جمال گویا کوئی رات کے نونے ہوں گے کہ چپراسی بھاگتا ہوا آیا اور کہا چلو صاحب اور میم صاحبہ کا برا حال ہے آکر کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں نڈھال پڑے ہوئے ہیں سیول رجن بلائے گئے انہوں نے نسخہ لکھا میں نے خوب غل مچایا کہ ڈاکٹر صاحب بھلا مرے ہوئے جانوروں کا گوشت چار آنے سیر منگوا کر کھایا جائے گا تو آخر کیا ہوگا۔ سر ٹپکتا رہا کہ میم صاحبہ خدا کے واسطے اس آ یا کی باتوں میں نہ آئیے بھلا میری کون سنتا ہے۔ تجھے ہوں گے کہ کوئی اپنی مرض سے جو ایسی باتیں بناتا ہے ہم نے صاحب کے پیچھے اپنا گھر بار تباہ کر لیا۔ کشر صاحب دگنی تنخواہ دے کر لے جا رہے تھے ان کو صاف جواب دے دیا کہ جس صاحب کے ہور ہے اس کے ہوتے لیجئے۔ اس کا یہ بد لامل کہ ہم جھوٹے ہوئے اور یہ چار دن کی آیا سچی ٹھہری۔ لیکھ لیجئے کیا نتیجہ ہوا اور کہیں خدا نخواستہ صاحب یا میم صاحبہ کو کچھ ہو جاتا تو ہم جیتے جی مر گئے تھے۔ یہ کہہ کر میں نے ذرا آنکھیں ملیں آواز میں بھی رونے کا کچھ رنگ پیدا کیا۔ ہوا یہ کہ صاحب اور میم صاحبہ کو تو اچھا ہونا ہی تھا وہ دونوں تو اچھے ہو گئے ہاں۔ آیا اما جان۔ دوسرے ہی دن نکالی گئیں۔ اور پھر وہی دو آنے اندڑا اور بارہ آنے سیر گوشت کا بھاؤ چلنے لگا۔

ہمارے طبقے میں اگر کوئی کمزوری ہے تو بس یہ ہے کہ ہماری عورتیں آیا بننا نہیں چاہتیں یہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھتے ہو۔ ہندو سنان کو کل سوراج مل جائے۔ اور مجھ سے پوچھو تو آیا بننا ہی کیا بڑا کام ہے سوا دو روپیے کی دو ساڑیاں بارہ آنے کی دو چولیاں اور ڈیڑھ آنے کی دو بکڑی کی مرکیاں چلو ایک روپیہ سوا چودہ آنے میں آیا ہو گئے۔ یہ

سہ براہ کرم کوئی صاحب رقم جوڑ کر اس میزان کی صحت پر اعتراض نہ فرمائیں۔ یہ بہراؤں کا حساب ہے وہ جو کچھ کہیں سب صحیح ہے۔ (مصنف)

بہر حال اس حرافہ سے چھٹکارا پا کر میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا تیسرے دن دوسری آیا آگئی۔ یا تو اس کو پہلے ہی سے میری لیاقت کی خبر ہو گئی تھی یا یہ خود غریب طبیعت کی تھی۔ ہوا یہ کہ ادھر میں نے سوچا کہ مل بانٹ کر کھانا اچھلے۔ ادھر اس نے خیال کیا کہ جو مل جائے وہی غنیمت ہے۔ ایک آنے روپیے پر تصفیہ ہو گیا۔ کچھ دنوں امن چین سے گزری لیکن کیا کیا جائے دنیا کسی بھلے آدمی کو آرام سے کب بیٹھنے دیتی ہے۔ کلب کی میم صاحبہ نے ہماری میم صاحبہ کو بھڑکا کر نا شروع کیا ایک بڑے پر لے لگا گھاگ جنٹ صاحب بدل کر ضلع میں آئے ان کی میم صاحبہ کو اپنی گھوڑاری کی قابلیت جتانی تھی۔ جب تک کلب میں رہتیں اپنی تعریفیں کرتیں۔ اپنے تجربے بیان کرتیں اپنی جمع پونجی کا ذکر کرتیں۔ اور جوان میم صاحبوں کو سمجھایا کرتیں کہ جو کچھ ہو سکے یہاں سے گھسیٹ لو نہیں تو ولایت جا کر ساری کسر نکل جائے گی آخر بڑھیا کی کہاں تک کوئی نہ سنتا سارے بنگلوں میں روپے پیسے کا رونا پچ گیا ہماری میم صاحبہ بھی پھر گئیں ایک دن کہنے لگیں "ول بہرا بڑھی میم صاحبہ کے ہاں مہینے بھر میں پالش کی ایک شیشی ختم ہوتی ہے۔ تم آٹھ شیشیاں اٹھاتا ہے ہم پسند نہیں کرتے ہیں سن کر چپ ہو رہا۔ دوسرے دن صاحب کا بڑا بوٹ صبح ہی سے بے جا دھوپ میں ڈال دیا جب صاحب کچھری سے آکر میم صاحبہ کے ساتھ چائے پینے بیٹھے اس وقت میں نے کہا "حضور دیکھیے پھر وہی پہلے والی بات ہونے لگی ہے۔ میم صاحب کہتی ہیں کہ پالش کی ایک شیشی مہینے بھر چلاؤ میں آپ کا جوتا ابھی لاتا ہوں اور آپ کے سامنے پالش کرتا ہوں آپ خود دیکھیے کہ کتنا پالش کھاتا ہے" یہ کہہ میں جوتا اٹھا لایا۔ ایسا جل رہا تھا جیسے آگ۔ ادھر میں نے پالش اس پر لگا یا ادھر جذب ہو کر رہ گیا۔ ساری کی ساری شیشی ایک ہی جوتا کھا گیا۔ صاحب بیٹھے اخبار پڑھتے رہے میم صاحبہ یہ تماشہ دیکھتی رہیں آخر گھبرا کر کہنے لگیں۔ "ول بہرا یہ کیا بات ہے" میں نے کہا "حضور ہمارے صاحب کے جوتے نس کلاس چمڑے کے ہیں زیادہ پالش کھاتے ہیں۔ اگر ان کو اچھی طرح پالش نہ دیا جائے تو ستیاناس ہو جائیں بڑھی میم صاحبہ کے یہاں بھلا ایسے جوتے کہاں سے آئے وہ ایک ایک پیسے پر توجان دیتی ہیں سوا سوارو بیہ والا جوتا خود پہنتی ہیں۔ اور اپنے صاحب کو تو چودہ آنے

والا ہی لا کر دیتی ہیں ان کے ہاں ایک شیشی بھی بہت خرچ ہوتی ہے آپ بھی ویسے ہی جوتے پہننے لگیں تو مہینے بھر کا کام میں آدھی شیشی ہی میں چلا دوں :-

معلوم نہیں میم صاحب کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر مجھے آیا سے معلوم ہوا کہ انھوں نے بڑھی میم صاحبہ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ بھلا وہ بے چاری اس بہرائی علم کو کیا سمجھ سکتی تھیں۔ کچھ الٹی سیدی وہ بتلائی مگر ہماری میم صاحبہ کی سمجھ میں نہیں آئی اور پال جا رسے ہی ہاتھ رہا۔ ایک دفعہ ٹرک کھڑے کر بیٹھیں کہ سٹی کا تیل بہت خرچ ہوتا ہے میں نے ان کے سامنے لیمپ میں تیل ڈال ہاں یہ نور کیا کہ بتی کو پہلے سے کافر کے پانی میں بھگو دیا نتیجہ یہ ہوا کہ آدھی رات کو سارا تیل خرچ ہو کر لیمپ ٹھنڈا ہو گیا۔ غرض کہاں تک کھوں روز ایک نیا جھگڑا نکلتا ہے اور یہ تم لوگوں ہی کی بہت ہے کہ اس کو اپنی پیاقت سے سلجھاتے ہیں۔ ہماری جگہ کوئی دوسرا ہوتا پاگل ہو کر بھاگ نکلتے۔

اس کے بعد کچھ ایسا چکر پڑا کہ صاحب کے تو بڑے پہلے سے رازدار تھے ہی۔ میرا صاحب کہیں رازدار ہو گئے اس کے بعد سارا گھہارا ہونے میں کیا کس رہی۔ آیا کے ساتھ ہونے یہ سلوک کیا کہ منافع میں سے ایک آنے روپیہ کی بجائے پیسے روپیہ بطور خیرات اس کا بھی مقرر کر دیا۔ اب بڑے مزے سے گزر رہی ہے آیا نوکر تو میم صاحبہ کی ہے مگر ہماری غلام ہے۔ صاحب نوکر تو ہمارے ہیں۔ مگر ہمارے دست نگر ہیں۔ میم صاحبہ ہیں تو ہمارے کی بیوی۔ زہر سے ترساں لڑناں ہیں۔

تو حضرات میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ بہرائی غلام سمندر ہے۔ یہ نہیں کہ اونچا مناد بانہرہ دھڑھی چڑھالی، اپن پن لی، ٹپکا پیٹ لیا اور بہرا ہو گئے۔ بہرائی کے لیے شکرے جیسی تین آنکھیں چھتے جیسی شبک چال الو جیسی متانت، لومڑی جیسی چال کی شیر جیسی جمت اور اونٹ جیسا تحمل چاہیے نہیں تو ہر شخص بن جائے گا مگر کنارے پر ہی غوط کھائے گا اور وہیں ڈوب جائے گا۔ شیخ سعدی نے صحیح فرمایا ہے۔

نہر کہ مو بہرا شد قلندری دانہ

غلام

خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے کس غرض کی تکمیل اور کس خیال کو پیش نظر رکھ کر پیدا کیا گیا ہے؟ مجھے تو بظاہر اپنے یہاں آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر سرکار کے چائٹوں کے لیے کسی گڈمی کن بیگم صاحب کے چھانچوں کے لیے کسی کھلے کن صاحب زادے صاحب کی ٹھوکر کے لیے کسی پنڈلی کن اور صاحب زادی صاحبہ کی چٹکیوں کے لیے کسی ہاتھ کی ضرورت تھی تو یقیناً میرے پیدا کرنے کے بہت کافی وجوہ موجود تھے۔ اور شاید اسی خیال سے میری ہڈیاں مضبوط، میرا گوشت سخت اور میری گڈمی چوڑی بنائی گئی ہے یا رفتہ رفتہ بن گئی ہے۔

میں کہاں پیدا ہوا؟ اور کب پیدا ہوا؟ اس کا داخلہ قضا و قدر کے دفتر میں شاید مل سکے تو مل سکے دنیا میں ان واقعات کا پتا چلنا ناممکن ہے۔ میرے ماں باپ کون تھے؟ اس کا حال بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اور کیوں کر معلوم ہو سکتا ہے۔ جب باوجود اُن کا بیٹا ہونے کے مجھے خود معلوم نہیں، تو بھلا دوسروں کو کیا معلوم ہو گا؟ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ اُس وقت ایک عورت مجھے گود میں لیے پھرتی تھی۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔ اور کسی نے مجھے سڑک کے کنارے ایک مکان میں لا بٹھایا۔ ہمارے سرکار آئے کچھ لکھا پڑھی ہوئی۔ مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھولائے اس کے بعد اب تک نہ یہ گھر ہم سے چھوٹا اور نہ ہم اس گھر سے چھوٹے۔

گھر میں آتے ہی ماروں مار میرے لیے نئے کپڑے سلا اور نہلا دھلا کپڑے پہنا مجھے خاصا بھلا آدمی بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بھی دسترخوان پر بٹھالیا۔ یہ پہلا اور آخری دن تھا جو اس گھر میں مجھے دسترخوان پر کھانا کھانا نصیب ہوا۔ کھانے بڑے مزے

کے تھے میں بھوکا بھی تھا۔ ایسا بے تاب ہو کر گرا کہ جب پیٹ تن کر نفا رہ ہو گیا اس وقت کہیں جا کر کھانے سے ہاتھ اٹھایا۔ جس پیٹ میں کبھی آدھی روٹی نہیں پہنچی تھی اُس میں اتنا ملغوبہ بھر گیا۔ بد، مضمی ہوئی۔ علاج ہوئے۔ خدا خدا کر کے اچھا ہوا۔ اس کے بعد میں کھانے میں احتیاد کرتا یا نہ کرتا۔ ہاں کھانا دینے میں بیگم صاحبہ بہت احتیاد کرتیں۔ گھٹتے گھٹتے آدھی روٹی پر نوبت آگئی۔ حکم تھا کہ ”میرے سامنے کھا۔“ بھلا بڑھتے معدے کو آدھی روٹی کیا معلوم ہو۔ لیکن وہاں آدھی روٹی سے پون روٹی نہ ہوئی۔ اس پر بھی ماما میں طعنوں کی بوچھاڑ سے کلچر چھلنی کر ڈالتیں کہ ”اے بوا دیکھنا! اس کی عمر دیکھو اور اس کا کھانا دیکھو۔ ذرا بڑا ہوا تو پان سیر آٹا چٹ کر جائے گا۔“ ہوتے ہوتے بیگم صاحبہ نے بھی یہی سبق پڑھنا شروع کیا خود ایک وقت میں آدھی روٹی دیتی تھیں۔ پھر بھی میرے بڑے پیٹے ہونے کی شکایت تھی۔ ان کی ایک لڑکی بس میرے ہی برابر تھی۔ یقین مانئے گا کہ ہر وقت اُس کا منہ چلتا تھا۔ یہ سو دے والا آیا، چل گئی۔ دو پیسے لے کھا گئی۔ کوئی خواہنے والا آیا پھر گئی۔ ایک آنے لے چٹ کر گئی۔ کاجھن آئی، لوٹ گئی۔ دو چار پیسے کے کچا لوہضم کیے۔ کھانے پر بیٹھی تو سب کے بعد اٹھی۔ جب دیکھو پیٹ تنا ہوا ہے۔ دست آئے ہیں۔ مگر بیگم صاحبہ ہیں کہ یہی کہے جاتی ہیں کہ ”اے ہے یہ بچتی نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ آخر کیسے جیسے گا؟ ذرا کچھ کھانے بیٹھی اور اس سوئے (یہ میری طرف اشارہ تھا) نے گھوڑا شروع کر دیا۔ جیسے کا ویسا نکل گیا۔ جب سے یہ آیا ہے میری بچی کی تو بھوک مر گئی ہے۔ بھر بھر کا بیاں دیتی ہوں جب بھی تو موئے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ مرغی کا معدہ ہے ادھر کھایا اور ادھر ہضم۔“

نظر و نظر لگانا تو مجھے آنا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گھوڑا اکثر میرے لیے منمید ثابت ہوا ہے شروع شروع میں تو میری یہ حالت تھی کہ کسی کو کچھ کھاتے دیکھا اور الگ بٹ گیا۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ بھی خیال نہیں کرتا تھا کہ اس معصوم اور لاوارث بچے کو کچھ دے دو۔ آخر کہاں تک دل مارا جاتا۔ میں نے بھی رنگ بدلا۔ جہاں کسی نے ذرا منہ چلایا اور میں نے گھوڑا۔ ادھر میں نے گھوڑا اور ادھر مجھ پر صلواتیں پڑنی شروع ہوئیں۔ مگر تھوڑا بہت یاروں کے حصے میں آ ہی گیا۔ ہوتے ہوتے میری نظر کا شہرہ ہو گیا۔ ایک دفعہ میں نے بہت گھوڑا تھا مگر کسی نے مجھ کو کچھ نہیں دیا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ کسی کا سارا کھایا پیاجوں کا توں نکل گیا اور میری نظر لگنے کا اثر سمجھا گیا۔ اب کیا تھا ذرا میں نے کھانے والے کی طرف گھور کر دیکھا اور میں اُس کا حصہ دار ہو گیا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی کوئی نعمت نہ تھی جو گھر

میں آتی ہو اور اس میں تھوڑا بہت مجھے نزل جاتا ہو۔

ہمارے سونے کی شان بھی عجیب شان تھی۔ دوسروں کے پاس بچھونے تھے۔ ہمارے پاس بھی تھے۔ مگر رضائی تو ایسی تھی کہ اس میں سے آسمان دکھائی دے۔ اور تکیہ ایسا کالا تھا کہ اس پر میل بڑھنے یا گھٹنے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ میری رنگت اور بالوں کی سیاہی میں کچھ انیس بیس کا فرق ہو گا۔ مگر میرے بالوں اور تکیے کی سیاہی میں انیس بیس نہیں پندرہ اور بیس کا فرق تھا۔ ساتھ ہی چھپا پٹ ایسی تھی کہ سر کے ساتھ زمین سے اٹھ آتا تھا۔ اب رسی درمی تو وہ کسی زمانے میں درمی کی تعریف میں آتی ہو تو آتی ہو۔ میرے زمانہ استعمال میں بچھنے کے بعد زمین میں اور اس میں تمیز کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر بچھونے سے ہم کو واسطہ بھی کم پڑتا تھا۔ ادھر آنکھ لگی اور ہم کر دٹ لے زمین پر آ رہے تکیہ ایک طرف گیا۔ درمی ایک طرف گئی۔ اب رہی رضائی تو اس کا بچھونے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہونے خدا کی وی ہوئی زمین پر لوٹ ماری اور گھر کے کتے نے ہمارا بچھونا سنبھالا۔ سردی لگی تو سوتے ہی سوتے میں کتے کی اور ہماری درمی پر جنگ ہو گئی کبھی ہم نے کتے کو درمی سے ہٹایا اور کبھی کتے نے ہم کو ڈھکیں کر بچھونے پر قبضہ کر لیا۔ ادھر صبح ہوئی اور ادھر بیگم صاحبہ یا کسی ماما نے اٹھ کر ہم کو ٹھوکر کے ذریعے سے پوشیا کر دیا۔ ہم پیدے تو ذرا کسمائے مگر دوسری یا تیسری ٹھوکر نے آنکھیں کھول ہی دیں اور بچھونے کو پٹیا۔ ایک کونے میں رکھا۔ نل پر جا کر دو ایک چلو سے آنکھیں دھوئیں اور چل بیٹا چڑھ جا سولی پر ہم بھین کر نین گئے، پھر وہی ہم ہیں اور وہی ایک بونی اور تین کام۔

خیر کام سے تو ہم نہیں گھبراتے۔ مگر ہر وقت کی مار پیٹ ذرا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ آخر کوئی کہاں تک پتے جائے۔ یہ آیا ماری۔ وہ آیا ماری۔ بیگم صاحبہ کہ رہی ہیں ”ٹوٹا“ صاحب زادے صاحب کہ رہے ہیں پانی۔ صاحب زدی صاحبہ فرما رہی ہیں ”چل میرے ساتھ کھیل“ یہ کہ رہا ہے ”ادھر آؤ وہ کہ رہا“ ”ادھر جاؤ“ آخر آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا۔ جس کا حکم نہ مانو وہی مارے۔ اور حکم مانو تو کیوں کر مانو۔ بھلا تین کام ایک آدمی کیوں کر کرے؟ میں نے بھی بے حیالی کا جامہ پہن لیا۔ پٹنا قسمت میں لکھا ہے تو یوں ہی سہی۔ یوں بھی پٹنا۔ دوں بھی پٹنا۔ پھر کام کر کے اپنے آپ کو مفت میں کیوں تھکائیں۔ ننگے کا خطاب ملا تو ملنے دو۔ بڑا بھلا کہتے ہیں تو کہنے دو۔ اس کان سنو۔ اس کان آڑا دو۔ آپ ہی بک بک کر تھک جائیں گے۔ یہ چال بھی گھورنے کی ترکیب کی طرح کارگر ہوئی۔ سب چیختے چلاتے مگر میں ٹس سے مس نہ

ہوتا۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا اور میں نے اس زور سے چیخ ماری گویا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے۔ کبھی کسی نے میری اس ترکیب کو دیکھ لیا تو راز کھل گیا۔ نہیں تو مارنے والا خود گھبرا گیا۔ دوسروں نے غل مچایا کہ 'اے ہے لونڈے کو مار ڈالا' کبھی تو مارنے والے صاحب مجھ سے زیادہ پٹ گئے اور کبھی ہانڈ ڈپٹ ہو گئی مگر ہم کام سے بچ گئے۔ تھوڑی دیر چھینتے چلاتے رہے۔ اس کے بعد یا تو پراگر سو گئے یا آنکھ بچا باہر نکل گئے۔ مگر بابا 'ہر فرعون نے راموسنی' چھوٹی صاحب زادی صاحب کچھ مجھ سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ خود ہی مجھے مارتیں۔ اور خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔ بھلا ان کے مقابلے میں مجھ بے چارے کی کیا ہستی تھی! الٹی مجھ ہی پر لے دے موتی۔ غرض اس لڑکی کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا تھا۔ مگر میں بھی بدلے بغیر تھوڑی مانتا تھا۔ مارنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہاں کبھی بیگم صاحبہ ان پر خفا ہوئیں تو میں بھی الٹی سیدھی بہت کچھ لگانا۔ مہینہ مہینہ بھر پہلے کی باتیں یاد دلانا۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو کام بن گیا اور صاحب زادی صاحبہ کی خوب کنڈی ہوئی۔ نہیں تو لڑاپے کا الزام لگتا۔ بیگم صاحبہ نے بیٹی کا غصہ مجھ غریب پر اتاڑ لیا۔

ہمارے کپڑوں کی کچھ نہ پوچھو۔ ادھر پہنے اور ادھر میلے۔ بدن میں کانٹے تھے کہ نیا جوڑا بھی پندے سے ثابت نہیں اترتا تھا۔ خیر گریبان تو ہمیشہ چاک ہی رہتا تھا۔ ہاں اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ سینے کے نمونے کا گریبان پیٹھ پر بھی بن جاتا تھا۔ اب رہے ہمارے چاک۔ تو ان کا بڑھتے بڑھتے بغل تک آ جانا معمولی بات تھی۔ موٹے سے موٹے لٹھے اور گاڑھے کے کپڑے بنائے گئے۔ مگر کوئی کپڑا بدن سے ثابت نہ اترتا تھا نہ اترتا۔ پا جامہ پہلے ٹخنوں سے گزر کر شرعی ہوا۔ اس کے بعد گھٹنوں تک آیا۔ اور آخر گھٹنے گھٹتے جا نگیہ بن گیا۔ اب رہی ٹوپی اور اچکن، تو وہ ہمیشہ 'فس کلاس' رہتی تھی۔ اور کیوں نہ رہتی۔ پینتا ہی کون مسخرا تھا۔ کبھی عید۔ برات کو پہن لی تو پہن لی۔ نہیں تو ٹوپی میں اچکن ٹھنسی ہوئی کمرے کے کسی کونے میں پڑی رہتی تھی۔

ٹوپی کے ساتھ ہی سر کا بھی خیال آ گیا۔ اس کا حال بھی سن لیجیے۔ جمعے کے جمعے ہماری ٹانٹ گھونٹ کر باجرے کا پیڑا بنا دی جاتی تھی۔ ذرا بابوں کی کھونٹیاں نکلیں اور آستر بھرا۔ آسترے کا پھرنا قیامت ہوتا تھا۔ جس کے پاس سے نکلے اسی نے چانٹا رسید کیا۔ کچھ گھنٹی ہوئی ٹانٹ پر چانٹا ایسا پڑتا ہے کہ سبحان اللہ۔ چھینٹیں اڑ جاتی ہیں۔ مارنے والوں کو مزہ آتا ہو تو آتا ہو میرا تو بعض

وقت سر جھٹنا جاتا تھا۔ اور تو اور بڑے سرکار بھی مذاق میں چلتے چلتے دو ایک چائے ضرور رسید کر دیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں "باپ پر پوت۔ پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" میرا باپ بھی شاید کوئی چور تھا۔ کیوں کہ جہاں میں نے کسی اچھی چیز کو دیکھا۔ اور چرانے کو جی چاہا۔ پہلے تو دل مانتا رہا۔ آخر فطرت طبیعت پر غالب آگئی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری میں نے شروع کی۔ کھلونا اٹھایا چھپا دیا۔ روال دیکھا غائب کر دیا لیکن آخر ان چیزوں کو لے کر کہاں جاتا ہا میری دنیا تو اسی مکان کی چار دیواری تھی۔

سچ ہے خدا بڑا کار ساز ہے۔ یہ شکل بھی آسان ہوئی۔ ایک نئی ماما آئیں۔ ہاتھ کی بڑی تیز تھیں موقع ملا تو گھر گھر میں جھاڑو سے دیتیں بگر مشکل یہ آپڑی کہ بیگم صاحبہ کچھ ان کی شکل سے ناراض تھیں اس لیے ان کے حدود باورچی خانے اور صحن سے آگے نہ بڑھے۔ اس پر بھی وہ اپنا پوتھا پورا کر لے تی تھیں رات کو گھر جاتیں۔ صبح ہی صبح آتیں۔ دوپہر کا کھانا لے کر جاتیں تو کوئی دو بجے واپس آتیں۔ کوئی روز روز پوٹلی کھلانے سے رہا۔ خدا معلوم کتنا دال آٹا بائذہ کر لے جاتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب سے وہ آئی تھیں دسترخوان پر ہر چیز تھڑ جاتی تھی۔ ہماری بیگم صاحبہ کی سمجھ دیکھو کہ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ کھانا کیوں کم پڑتا ہے۔ اٹا غلہ بڑھا دیا۔ بگر مانے اس پر بھی بس نہ کی۔ ادھر غلہ بڑھا اور ادھر ان کی چوری بڑھی۔ غرض جب تک وہ رہیں کھانے میں ہمیشہ برکت ہی برکت رہی۔ ماما جی بچہ سمجھ کر میرے سامنے پوٹلی بانڈھنے میں ذرا احتیاط کم کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے ان کے کرتوتوں کا حال خوب معلوم ہے۔ رکابی اور پیالے سے رگلا چھوٹی پتیلی اور سرپوش تک ان کی پوٹلی میں ہمارے گھر سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کے جانے کے متعلق جس زمانے میں کچھ گڑ بڑ ہوئی تو بنی ماما ذرا ہاتھ روک لے تیں۔ خود پوٹلی سارے گھر کو دکھا کر جاتیں۔ جہاں ذرا محاذ ٹھنڈا پڑا اور چیزیں کھسکتی شروع ہوئیں۔ ان کو معلوم تھا کہ میں ان کی ساری کارروائیوں سے واقف ہوں اس لیے میری بڑی خاطر داری کرتیں۔ چیکے ہی چیکے باورچی خانے میں خوب کھلانیں کبھی کبھی مٹھائی بھی لا کر دیتیں۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی ان سے کچھ انس ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے میرے ساتھ کون سی بھلائی کرتے تھے جو میں ان کے مال کا غم کھاتا۔ آخر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں خود میں نے ماما جی کو چرہ آخری کر چیزیں دینی شروع کیں۔ ذرا بیگم صاحبہ نے کوئی چیز رکھی اور غائب۔

تکیر کے نیچے سے پیسے غائب۔ جیب میں سے روپیے غائب۔ کھونٹی پر سے تولیہ غائب۔ آخر یہاں تک ہوا کہ پیاری میں سے سونے کا چھلا اڑ گیا۔ اس پر بڑا غل مچا۔ چھری پڑھ کر رکھوائی گئی۔ کچے چاول چبوائے گئے۔ مگر پتہ نہ چلا۔ مجھ پر تو شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جانتے تھے کہ چراغے کا تو کہاں لے جائے گا۔

اما پر شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کیوں کہ ان سے باورچی خانہ کب چھوٹتا تھا۔ اب رہیں بی مغلانی اور آیا۔ تو وہ جانیں اور بیگم صاحبہ جانیں اور بیگم تھوڑے دن میں گئی گذری بات ہوئی۔ چھلے کے عوض میں بی ماما نے مجھے دو لڈو لگا کر دیے۔ اب کیا تھا مجھے لڈوؤں کی چاٹ پڑ گئی۔ میں نے بھی اپنا گھر صاف کر ماما جی کا گھر بھرا۔ اور خوب بھرا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ سارا جہیز ہمارے گھر سے رفتہ رفتہ وہاں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ درمی۔ چاندنی اور مچھردان تک اٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ پریشان تھیں کہ یا اللہ سامان کے بڑے لگ گئے ہیں کہ ادھر رکھا اور ادھر غائب۔ آخر حضرات کی ٹھہری۔ چھوٹی بی بی آئینے کے سامنے بٹھائی گئیں۔ جنوں کے بادشاہ آئے۔ ان سے چور کا حال پوچھا گیا۔ چھوٹی بی بی تو میری جان کی دشمن تھیں ہی۔ انھوں نے میرا نام لے دیا۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ مگر بڑے سرکار کچھ کھٹک گئے۔ شاید میرے اور ماما جی کے زیادہ میل جول سے ان کو کوئی خیال پیدا ہو گیا۔ ماما جی سمجھیں کہ چلو یہ مال بھی مضموم ہوا۔ ایک دن مجھ سے کہا۔

”دیکھو بیٹا! ابھی بیگم صاحبہ پیاری میں چسپا کلی رکھ کر کوٹھے پر گئی ہیں۔ اس وقت دالان میں کوئی ہے بھی نہیں۔ ذرا چپکے سے نکال تو لا۔ اتنے لڈو کھلاؤں گی کہ پیٹ بھر جائے گا۔ ہم باورچی خانے سے نکل ٹہلتے ٹہلتے دالان میں آئے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ پیاری کھول۔ چسپا کلی نکال، نیچے میں اڑس، باورچی خانے میں آ، ماما جی کے حوالے کی۔ انھوں نے اپنے خشکے کی رکابی میں ٹھونس پوٹلی میں باندھ دی۔ بیگم صاحبہ نیچے آئیں۔ پیاری کھول، پان کھایا۔ مگر کچھ نہ ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں بڑے سرکار۔ بی مغلانی اور آیا بھی دالان میں آگئے۔ کھانا منگوا یا گیا۔ سب نے کھانی فراغت کی۔

بی ماما اپنی پوٹلی دکھا دروازے کے باہر نکلی ہی تھیں کہ ایک غل چم گیا۔ میں بھی دوڑتا ہوا باہر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماما جی کو ایک سپاہی پکڑے کھڑا ہے اور بی ماما وہ ستور مچا رہی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ گھر والوں کو بھی کوسنے دے رہی ہیں۔ سپاہی کو بھی صلواتیں سنار ہی ہیں۔ مجھے جو مانے دیکھا تو کہا: ”بیٹا ذرا یہ کھانا تولے جا کر میرے گھر میں دے آ۔ سچی بھوک بیٹھی ہوگی۔ بارہ بیج چکے ہیں۔ دیکھیے ان کا بی وردی والوں سے کب سچھا چھٹتا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسے گھر میں نوکر ہو۔ یہ نہ مٹریں کو دکھیں نہ رذیل کو۔“

گھوڑے گدھے کو ایک لاکھی ہانکتے ہیں؟ یہ کہہ کر انھوں نے پوٹلی میری طرف بڑھائی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سپاہی نے اس زور سے ڈانٹا کہ میرا تو دم ہی نکل گیا۔ اور ما بھی کچھ سہم سی گئیں۔ اتنے میں داروغہ جی (سب انسپکٹر پولیس) بھی آگئے۔ کچھ لوگ اور جمع ہوئے۔ پوٹلی کھلوانی گئی۔ خشکے میں سے چمپا کلی نکلی۔ یہ دیکھ کر ماجی بھیر گئیں۔ کہنے لگیں، ہیں!! یہ چمپا کلی میرے خشکے میں کہاں سے آئی۔ بیگم صاحبہ نے خود نکال کر مجھے خشک دیا تھا۔ انھوں نے رکھ دی ہوگی۔ ہاں بابا بڑے لوگ ہیں۔ آج خشکے میں مدعا (چوری بڑا مال) رکھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ کل خدا جانے کیا کریں۔ نا بابا نا۔ میں اس گھر میں اب نہیں رہتے کی! یہ کہہ کر ماجی جانا چاہتی تھیں کہ سپاہی نے چٹیا کر پڑ گھسیٹ لیا۔ اس پر تو بڑھیا نے وہ او دھم مچایا کہ معاذ اللہ بار! محلہ چیخ چیخ کر اور رو رو کر سر پر اٹھا لیا۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھتا تھا مگر ہاں اب سمجھا ہوں کہ غل مچانے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ اس کا مکان قریب ہی میں تھا۔ یہ اپنی بیٹی کو نوٹس تھا کہ مال گھر سے نکال دے۔ وہ بھی اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ سمجھ گئی ہوگی کہ اماں پر آفت آئی ہے۔ مال لے کر نکل رہی تھی کہ دوسرے سپاہی نے اس کو پوٹلی کے ساتھ ماں کے پاس لاکھڑا لیا۔ اس کے بعد ہم سے پرسش شروع ہوئی۔ مار سے ڈرایا۔ مٹھائی کا لچ دیا۔ بھلا ہم کو ان ماں بیٹیوں سے کیا دل چسپی تھی۔ مار کے ڈر اور مٹھائی کے لالچ میں سارا قصہ کہ سنایا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ وہ دونوں کہاں جہنم رسید ہوئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم سے جو وعدے ہوئے تھے ان میں کا پہلا حصہ سبب ذل بھر کر ہم کو پہنچا دیا گیا۔ گھر میں اب بھی ہم رہتے ہیں لیکن ماؤں اور نوکروں سے ہم کو ذرا کم ملنے دیا جاتا ہے اور کبھی اب ہم خود بھی سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ اگر کچھ چراتے بھی ہیں تو خود ہی کھاپی کر برابر کہہ دیتے ہیں۔ کسی کو دیتے دلاتے نہیں۔ بھلا سرکار کے مال کے جب ہم حق دار موجود ہیں تو پھر یہ مال دوسروں کو کیوں پہنچے۔ پہنچنا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ اللہ معاف کرے گا۔

نئی دہلی

رہتے رہتے حیدرآباد اب ہمارا وطن نہیں تو مسافر کا گھر ضرور ہو گیا ہے۔ پچھلے بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ ورت سے دہلی جانا ہو ہی جاتا ہے اب بھی تھوڑے دن ہوئے کچھ دنوں کے لیے دہلی گیا تھا گرمی کا پورا زور تو نہ تھا، ہاں مزا آنے لگا تھا۔ لائٹ صاحب کے کچھ دنوں شملہ جا چکے تھے کچھ بار ہتھکے، نئی دہلی چوہٹ تھی۔ مگر اصل دہلی میں وہی پہل پہل تھی دس دن ٹھہرا غریبوں سے ملا دوستوں سے ملا، بنواری لال کا مکان دیکھا۔ نائک چند کی کوٹھی دیکھی۔ لہ سنہی رام کا حال دیکھا۔

واحدی صاحب کے ہاں دعوت کھائی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی کے اہل علم سے ملاقات کرائی۔ ہر چیز دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ شخص سے ملتا اور لطف اٹھاتا تھا۔ دل باغ باغ تھا کہ دلی پھر نئے سرے سے دلی ہو رہی ہے۔ مگر چلنے سے ایک دن پہلے مرزا قمر سے جو باتیں جامع مسجد کی بیڑھیوں پر ہوئیں اس نے راجوش ٹھنڈا کر دیا۔ دل بیٹھ گیا۔ اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ دلی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

مرزا قمر کو مرزا قمر و کہوں تو دل والا تو کوئی نہ سمجھے۔ ہاں مرزا چھکڑا کہوں تو سب سمجھ جائیگا۔ ان کو بھی پرانی دہلی کا ایک کھنڈر سمجھو۔ چند روز کی ہوا کھا رہے ہیں۔ زمانے کا ایک آدھ تھپڑا پڑا اور ان کا خاتمہ ہے۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ ساٹھ ستر ہزار کی جائداد تو دو تھکوں میں برابر ہو گئی۔ کچھ بچی کھچی رہ گئی تھی وہ ٹوٹ بھوٹ کر ٹھیکرا ہو گئی ہے انھوں نے اپنے خرچ کم نہیں کیے زمانے نے سوائے ان کی جائداد کے ہر چیز کی قیمت بڑھادی نتیجہ یہ ہوا کہ اس جائداد کو

بھی گروی رکھنا پڑا۔ نالش ہوئی ہے کوئی دن میں وہ بھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ مرجائیں تو اچھا ہے۔

نام تو ان کا مرزا قمر الدین ہے۔ مگر ان کی وضع قطع، ان کے بھاری بھر کم جسم اور ان کی ٹھمک چال کی وجہ سے ساری دلی ان کو مرزا چھکڑا کہتی ہے پڑھے لکھے خاک نہیں۔ پھر بھی خود کو شاعر سمجھتے ہیں اور ایک چھوڑو دو تخلص خیال اور دل رکھ لیے ہیں ان دونوں میں سے کوئی استعمال میں تو آتا نہیں ہاں یونہی شوق میں ایک نام کے تین کر لیے ہیں۔ خیر یہ جتنے نام چاہیں رکھ لیں۔ دلی والے تو انھیں مرزا چھکڑا کہتے ہیں اور یہی کہیں گے تمام جوتی کی وضع بدل گئی۔ اور نہ بدلی تو ان کی اور بدلنے کیوں لگی دلی کے جو چھکڑے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ رتی برابر فرق نہیں ہو جب وہ نہ بدلے تو یہ کیوں بدلنے لگے۔ پرانی وضع پر جان دیتے ہیں۔ نئی وضع پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آج کل کی کسی بات کی تعریف سنی اور پیچھے پڑ گئے لوگوں کو مذاق ہاتھ آ گیا ہے۔ ایک آیا لاٹ صاحب کی کوٹھی کی تعریف کر گیا، انھوں نے مذمت شروع کی! ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے نے آکر کسی اور چیز کی تعریف کر دی۔ یہ پہلا سلسلہ چھوڑ دوسرے کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگ بیچارے کو بہت ستانے لگے ہیں۔ میں نے دس برس پہلے بھی ان کو دیکھا تھا۔ اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اب تو کچھ باولے سے ہو گئے ہیں۔ اسی برس کی عمر ہے آخر دماغ کہاں تک کاڑے یہ دوسروں پر بگڑتے ہیں۔ دماغ ان سے بگڑ بیٹھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ نئی دہلی کے ایسے دشمن ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو بے چارے کو ناحق کیوں پریشان کرتا۔ چلنے سے ایک دن پہلے شام کوئی ساڑھے پانچ بجے گھر سے ٹہلنے نکلا۔ جامع مسجد قریب ہی ہے۔ خود بخود پاؤں اُدھر ہی اٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ شہت والے کی دوکان کے قریب۔ رومال بچائے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ پہلے تو آنکھوں کو چندھیا کر ذرا شست لگائی۔ جب یوں کام نہ چلا تو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجا بنا کر غور سے دیکھا اور ایک دفعہ ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ "اوہو! میاں فرحت ہیں۔ کہو بیٹا یہاں کہاں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ حیدرآباد ہی کے ہو لیے۔ آخر آئے مگر بھئی بہت دنوں میں آئے" میں نے کہا، "مرزا صاحب کیوں نہ آتا دلی کہیں ہم سے چھوٹ سکتی ہے" کہنے لگے دلی بیٹا! دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری اب یہ

دلی تھوڑی ہے یہ تو لاہور کی اماں ہے۔ جاؤ جائد اذیح کر کہیں اور جا بسو۔ اب یہ تمہاری دلی نہیں رہی۔ یہ تو دوسروں کی دلی ہو گئی ہے۔“ مجھے کیا معلوم تھا کہ نئی دلی کی تعریف سن کر ان کے آگ لگ جاتی ہے۔ میرے منہ سے نکل گیا، واہ مرزا صاحب واہ! دلی تو اب دلہن بن گئی ہے اور ابھی کیا ہے۔ تھوڑے دنوں میں دیکھنا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ کبھی راتے سینا بھی گئے ہو یا یوں ہی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نئی دلی کو صلو اتیں سناتے ہو۔“

میرا اتنا کہنا تھا کہ پھر گئے۔ ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا کہا، ”آ بیٹھ! میں تجھے تیری دلی کی تعریف سناؤں تجھے معلوم بھی ہے کہ دلی کا دل کیا تھا“ میں نے کہا ”چاندنی چوک کہنے لگے۔“ بہت تیرے جھوٹے کی شرماتا کیوں ہے۔ چاوڑی کیوں نہیں کہتا کہیں بڑی جگہ نوکر ہو گیا ہے جو چاوڑی کو چھوڑ کر چاندنی چوک کی تعریف پر اترا آیا ہے۔ بیٹا دلی کا دل چاوڑی ہے۔ اب تو چاوڑی کو دیکھو کیا رنگ ہے۔ جب دل ہی بگڑ گیا تو شہر کیا رہا۔ اب جامع مسجد سے لگا کر اجیری دروازے تک چلا جاو وہ وہ شکلیں نظر آئیں گی کہ خدرا کی پتاہ۔ نہ وہ اللہ دی غازی آباد والی رہی نہ نور جہاں، نہ وہ حشمت ہے نہ وہ یہ ٹھوڑا لی زہین زہین تو تجھے یاد ہوگی۔ اب اس کے قاضی کے حوض وائے کوٹھے کو جا کر دیکھو ایک پہلوان بیٹھے ہیں، تھوڑا سا منہ، میل کے سے دیئے، یہ موٹی ناک، ڈھیلے ڈھالے پنچوزوں کا سا لباس، منہ کے سامنے بجلی کا لیمپ رکھا ہے بیچے یہ ہیں ”بی صاحبہ“ اور کس جگہ آ کر بیٹھی ہیں کہ بی زہین کی جگہ اوپر جائیے تو نہ سلام نہ مزاج پر سی نہ پان ہے نہ چچا لید جاتے ہی مطالب کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ماشاء اللہ گفتگو ایسی شستہ زبان میں کی کہ منہ سے پھول جھوٹنے لگے۔ کالی بغیر تو بات ہی نہیں ہوتی۔ بھلا ان کے ہاں پان کہاں۔ یہ نہ پان کھائیں نہ پان بنانا جانیں کسی نے بے جیا بن کر پان مانگا تو دو پیسے نکال پھینک دیے۔ پیچھے پنواڑی کے ہاں سے پان آگئے۔ ہاں حلقہ بہت ہی پیتی ہیں۔ حلقہ آیا تو وہ آیا کہ گنوار بھی اس کو منہ لگاتے ذرا گھبرا ئیں خدا جھوٹ نہ بلو، وے تو سارے کا سارا مل کر کوئی دس سیر کا ہو گا نیچے پر بان پٹا ہوانے اتنی موٹی جیسے پھکنی چلم ایسی کہ سو پایا و تمبا کو آئے پیچھے حلقہ حاضر ہے۔ حلقہ کا پانی ٹپکتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بھی کوئی نہیں دیکھتا کہ چاندنی پر رکھا گیا تو دھبہ پڑ جائے گا۔ اب ہے کوئی بہت والا جو اس حلقہ کا ایک دم بھی لگائے کھائے دم نہ نکل جائے تو میرا دم اب فرما رہی ہیں۔ پیچھے پیچھے۔ ابر سر کا تمبا کو ہے۔ کل ہی سردار صاحب

ہنے لاکر دیا ہے۔ بھلا کس کی شامت آئی ہے جو اس حقے کا دم لگا کر مفت میں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے اور خود بی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی بیخ اٹھا۔ منہ اوپر کر کے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاکھ کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی یہ میں نے اس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو اس وقت چاؤڑی کی ناک کھی جاتی ہے دوسروں کی کچھ نہ پوچھو ان کے تو دروازے ہی پر قدم رکھنا مشکل ہے پہلے زمانے کی چاؤڑی تو مجھے یاد ہو گی، گرمی کا موسم ہے ادھر شام ہوئی ادھر سب کمرے روشن ہو گئے یہاں گانا ہو رہا ہے وہاں گانا ہو رہا ہے شوقین بیٹھے سن رہے ہیں شریف لوگ سفید براق کپڑے پہنے۔ موتیا کے گجرے گلے میں ڈالے مولسری کی لڑیاں ہاتھوں میں پیٹے سڑک پر ٹہل رہے ہیں۔ چہل قدمی ہو رہی ہے۔ گلے کا لطف بھی آ رہا ہے بارہ ایک بجے تک یہی کہا گئی رہی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جا آرام سے سو رہے۔ اب چاؤڑی میں رات کو جاسیے تو دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے۔ برآمدوں میں کھیموں سے لگی رنڈیاں کسی انتظار میں بیٹھی ہیں۔ ایک آدھ کو ٹھے پر ریل روں بھی ہو رہی ہے۔ نگر گانا کیا ہے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بی جان اپنی اماں کو یاد کر کے زور ہی ہیں۔ سنتا ہوں اب سب کی سب چاؤڑی سے نکالی جانے والی ہیں۔ اچھا ہو گا۔

خس کم جہاں پاک

میں نے کہا "مرزا صاحب، بھلا رنڈیوں سے اور دلی کے اچھے برے ہونے سے کیا واسطہ؟ کہنے لگے 'واہ بیٹا۔ واہ خوب سمجھے اور ننھے بن جاؤ۔ یار عزیز انھیں سے تو دلی دلی تھی، نہیں تو دلی میں رکھا ہی کیا تھا ذرا حکیموں کے مطب میں جا کر دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ دلی کی زبان کا سپنہا لنے والا کون ہے کبھی کسی کو ٹھے پر گئے ہوتے تو کھلتا کہ آداب مجلس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے بننے سنونے کو دیکھتے تو پتا چلتا کہ لباس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے کمروں کو دیکھا ہوتا تو سمجھتے کہ سلیفہ کس کو کہتے ہیں۔ میاں رنڈیاں دلی کی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ لاکھ عورتوں میں سے الگ نکال لوں کہ یہ دلی کی رنڈی ہے اب جیسی روح ہے ویسے فرشتے خیر بڑے متقی پرہیزگار تھی۔ رنڈیوں کو چھوڑو ان شہروالوں کو لو۔ لعنت ہے۔ ان کی شکل پر یہ دلی والے ہیں۔ خدا کے لیے سچ کہنا کیا ان کو کوئی دلی والا کہے گا، ہال دیکھو تو جھاڑ جھنکار، منہ دیکھو تو ہیر طوں کا سا لباس دیکھو تو سبحان اللہ نیچے قمیض ہے اوپر کرشٹانوں جیسا چھوٹا کوٹ، ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے گٹ پٹ گٹ پٹ

کرتے چلے آ رہے ہیں پیچھے یہ ہیں آپ کے دلی والے اور تو اور کبخت عورتوں نے بھی اپنی کچھ عجیب وضع بنالی ہے، انگلیا، کرتی، اور ڈھیلے پیجامے تو غدر کے ساتھ گئے۔ چوڑی دار تنگ پیجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا، سلیقے کا حال یہ ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانے کی مالک ماما، سینے پر رونے کے ذمہ دار درزی اور زری نہیں، ماسٹر ٹیلر۔ اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہو اخوری کو نکلیں۔ صاحب ایک طرف گئے، میم صاحب دوسری طرف گئیں اب نہ ان کو ان کی خبر اور نہ ان کو ان کی سیجی یہ آپ کی دلی کی جیا و مشر مر رہ گئی ہے۔ کچھ پتے کچھ گھرانے اپنی پرانی چال پر چل رہے ہیں۔ لیکن کب تک خر بوزے کو دیکھ کر خر بوزہ رنگ بدلتا ہے۔ وہ بھی یا تو اسی بھیڑ چال کو اختیار کریں گے یا نکوین جائیں گے۔“

میں نے کہا ”مرزا صاحب یہ تو نہ کہو پردہ تو دلی میں اب بھی خالص ہے،“ کہنے لگے ”وہ تو ماشاء اللہ آپ کے حیدر آباد کا کچھ اس سے بھی زیادہ تیز رنگ ہے۔ بندہ خدا یہ کوئی پردہ میں پردہ ہے، پہلے باہر والیاں بھی نکلتی تھیں تو اوڑھے پیسے ٹنھیں برقع اور ہنسی تھیں تو اس طرح کہ صرف ایک آنکھ یا ہر ہے، نہ اس طرح جیسے اب پھرتی ہیں۔ برقع تو اب بھرتی کے سر پر ہے لیکن پلو ہیں کہ ادھر ادھر رہے ہیں۔ خود ہیں کہ برقع سے دو قدم آگے۔ مرد میدان بنی چلی جا رہی ہیں اب برقعے کو برقع سمجھ کر تھوڑی اوڑھا جاتا ہے۔ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ سم چلی آتی ہے۔ اس کو پورا کر رہے ہیں۔ جب اپنے ہی برے ہو گئے تو دوسری قوم و نون کو میں کیا کہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ پہلے جن کی انگلی نہیں دکھائی دیتی تھی ان کی پنڈ لیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اُسے بھی یہ تو جو کچھ تھا سو تھا، اب دل بھی تو صاف نہیں رہے۔ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بیزار ہیں اور مسلمان ہندوؤں سے بیزار، بات بات پر کٹے مارتے ہیں۔ ذرا کلبوں نے ملو کو گالی دی یا ملو نے کلو کو مارا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ میاں معاملہ کیا ہے۔ آخر لڑنے کا سبب کیا تھا۔ مسلمانوں سے پوچھو تو کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے مسلمان کو ہندو نے کیوں مارا! ہندوؤں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں میاں پرے ہٹو ہم کو اس سے غرض نہیں کہ کیا ہوا، ہندو کو مسلمان نے کیوں گالی دی۔ جو ہے آپ سے باہر ہوا جاتا ہے۔ بس کو دیکھو بھوکے شیر کی طرح

پھر رہا ہے۔ آج اس کا سر پھوٹا۔ کل اس کا خاتمہ ہوا۔ اسپتال بھرے چلے جا رہے ہیں وراثت سے دواؤں پر دوائیں چلی آ رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیس بھرتے بھرتے دیوال نکلا جاتا ہے۔ اور ہے کیا کہ کلو نے ملو کو مارا۔ خاکیوں اور گوروں سے بھری موٹریں ادھر سے ادھر ہوں پول کرتی چلی جا رہی ہیں۔ تو پیس کھٹکھٹ کرتی ادھر سے ادھر دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز چیلوں کی طرح سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پکڑے جا رہے ہیں جیل خانے بھر رہے ہیں۔ مقدمے بازی ہو رہی ہے۔ کسی کو جہنم قید ہوتی ہے کوئی پچاسی پر ٹسکا یا جاتا ہے۔ اور یہ سب کس لیے کہ ملو نے کلو کو گالی دی تھی۔ نتیجے یہ آپ کی دلی ہے۔ اور یہ آپ کے دلی والے ہیں۔ کل ہی کا قصہ ہے کہ میں بڑیوں کے کھٹے سے قاضی کے حوض آ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت کے کوچے کے قریب دو بچار لڑ رہے ہیں۔ سب راستے ہیں کہ بند ہیں۔ موٹریں، گاڑیاں، تانگے، ٹرام، پیرل ٹینس سارا راستہ ستر کا کھڑا ہے اور کسی کی جوت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھ کر اور دو لٹ مار کر ان کو ملحدہ کر دے آخر جب لڑتے لڑتے خود ہی تھک گئے اس وقت ایک بھاگا۔ دوسرا اس کی پیچھے بھاگا دو تین آدمی چھیٹ میں آگے جب کہیں جا کر راستہ کھلا۔

میں نے کہا "میرا صاحب آخر مار کر جینکا دینے میں کیا برج تھا" کہنے لگے "ارے بھائی خون خرابے ہو جاتے۔ وہ کیا لفظ ہے۔ تصادم ہاں تصادم ہو جاتا بین الاقوامی تصادم ہو جاتا میں نے کہا بین الاقوامی تصادم یہ بھی آپ نے خوب کہی" کہنے لگے "ہاں میاں تم پر ٹھہرے کھٹے آدمی ہو جہاڑی زبان میں مین میٹھ نکالتے ہو ہم تو اب یہی سنتے ہیں کہ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو اخبار والے اس کو بین الاقوامی تصادم کہتے ہیں اب جانے ہماری بلا۔ وہ صحیح کہتے ہیں کہ غلط آئی سے جا کر پوچھو کہ اس کے کیا معنی ہیں ہمارے زمانے میں تو بڑے بڑے واقعات ہوتے تھے جب بھی بین الاقوامی تصادم نہیں ہوتا تھا کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ ہم پھول والوں کی میر کو جا رہے تھے۔ تم کو یاد ہو گا سر میدھی سڑک قطب کو جاتی تھی اب بھی کبھی ادھر گئے ہو خدا

لہ دہلی میں ان بیوں کو بچار کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں ان کو سانڈ بھی کہتے ہیں

بکر ب۔ ج۔ ۱۰۔ رکالفظ زیادہ مستعمل ہے۔ (مصنف)

نہ لے جائے قطب جانا مشکل ہو گیا ہے چاروں طرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں بے لکھا پڑھا آدمی صبح کو چلے تو کہیں شام کو جا کے قطب پہنچے اب ادھر چلو اب ادھر چلو اب ادھر گھومو اب ادھر جاؤ ہر موڑ پر تختی لگی ہوئی ہے پڑھنے والے پڑھ لیتے ہوں گے ہماری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا جہاں دیکھو تختی پر ہاتھ بنا ہے ایک انگلی آگے کو نکلی ہے یعنی ادھر جاؤ۔ آخر ادھر جاؤ تو کہاں جاؤ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی سڑک ہے کہیں جاتی ہی ہوگی۔ لیکن جاتی کہاں ہے۔ کیوں کر معلوم ہو۔ اگر ہاتھ کی جگہ قطب کی لاکھ بنا دیتے تو سب سمجھ جاتے کہ یہ سڑک قطب کی لاکھ کو جاتی ہے۔ بقدر بنا دیتے تو جان جاتے کہ یہ سڑک مدرسے کو جاتی ہے۔

سڑکیں کیا ہیں خاصی سبوں سبیلیاں ہو گئی ہیں سڑک پر یہاں وہاں جہاں دیکھو سپاہی کلاڑے تھرک رہے ہیں کبھی یہ ہاتھ اونچا کرتے ہیں کبھی وہ کبھی ادھر پھرتے ہیں کبھی ادھر غرض کیا کہوں دلی کی سڑکیں بھی تماشا ہو گئی ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ ہم قطب جا رہے تھے۔ منصور کے مقبرے کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ گاڑی چلی آ رہی ہے اندر بیسوں آدمی ٹھساٹھس بھرے ہیں۔ چھت پر لوریاں لہی ہیں ان کے پیچ میں پانچ چھ گنوار دیکے دیکے بیٹھے ہیں۔ میاں میواتی اونٹ کی ٹیکل تھامے سامنے کے تختے پر بیٹھے اونٹ بٹ رہے ہیں۔

خدا کی قدرت دیکھو۔ دوسری طرف سے ایک ایک آ رہا تھا ایک میں تین بندو سیدنی ایک پت میں دو ادھر ادھر ایک ہاتھ سے چھتری کے ڈنڈے پکڑے دوسرا ہاتھ ٹوپی سنبھالنے کے لیے سر پر دھرتے ساف ستھے کپڑے پہنے چلے آ رہے ہیں یکے والے نے ہری ہری گھاس چھتری کے اندر بانڈھ رکھی تھی کہ قطب میں کام آئے گی۔ یکے جو اونٹ گاڑی کے پاس سے گزرے تو میاں اونٹ کی نظر گھاس پر پڑی انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنی گردن بڑھا چھتری میں داخل کر دی سیلانیوں نے ہشت ہشت کی اونٹ نے جو گھبرا کر گردن سیدھی کی تو یکے گردن میں ٹک گیا بھی مزہ آگیا۔ اونٹ کے گلے میں بلی توستی تھی یہ اونٹ کے گلے میں یکے اسی دن دیکھا خیر ادھر ٹوٹی نے ہاتھ پاؤں مارے ادھر یکے والے نے غل چایا کچھ راہ گیروں نے گڑ بڑ کی اونٹ نے جو گردن کو

جھٹکا دیا تو یکہ اور سیلانی وہ جا کر گرے چوٹیں بھی آئیں۔ کپڑے بھی خاک میں ملے نقصان بھی ہوا۔ مگر نہ کچھ جھگڑا ہوا نہ ٹٹایکے والے نے کچھ کڑ بڑ شروع کی تھی اس کو لوگوں نے ڈانٹ دیا کہ جانے یہ ہوتا ہی ہے۔ نہ چھتری میں گھانسی باندھ کر لاتا نہ اونٹ گردن ڈالتا نہ یہ تماشا ہوتا۔ بیچے معاملہ رفع دفع ہو گیا خدہ انخواستہ اگر آج کل یہ واقعہ پیش آجاتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچتی خوب گم گٹا ہوتی بکڑی چلی نالشاناشی ہوتی اور کیوں نہ ہوتی کسی مسلمان کے اونٹ کا کسی ہندو کے ٹوکڑ خمی کرنا کوئی معمولی بات ہے۔

میں نے کہا "تو ز صاحب آپ دلی کی عورتوں سے تو خفا تھے ہی مردوں سے بھی صاف نہیں" کہنے لگے "مرد عورت تو کیا میں تو دلی کی ہر بات سے خفا ہوں اب اس گڈڑی ہی کو دیکھو اب یہ گڈڑی تھوڑی رہی ہے نام نہانہ بڑا زرد ہو گیا ہے۔ جو ماں شہر میں نہ ملے یہاں لے لو سو روئے والے ہیں وہ نئی نئی آوازیں نکالتے ہیں اب جو بیٹی۔ ای۔ تی۔ ای پکار رہا ہے۔ جلتے ہو کیا پتہ رہا ہے۔ میاں کھینچ رہا ہے۔ بھلا میں آواز پر کوئی کیا آئے گا۔ کاچھی سب گونگے ہو گئے۔ یا کسی زمانے میں گرمی کا موسم ہے تو آوازیں آ رہی ہیں کالے اودے لگا دیے ہیں شہرت کو سانوں سلونے لگا دیے ہیں شہرت کو جاڑا ہے تو آوازیں آ رہی ہیں۔ گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں، بیڑا ڈو پیاری نے توڑے ہیں۔ اب کاچھی تو دلی سے ناپیدا ہو گئے ہاں فتح پوری کے نیچے پتھ میوے والے بیٹھے ہیں وہ ٹیپے کالے از رو کھی کچھ یوں ہی جانتے ہیں آوازیں کیا لگائیں گے اور لگائیں بھی تو لوگ ڈر کر بھاگ جائیں پہلے چاندنی چوک میں یہاں سے وہاں تک میوے والوں کی دکانیں نہیں بیچے نہ ہراؤ پر درختوں کا سایہ جا بجا فلو دے والوں کی دکانیں دکانوں کے سامنے نہیں بیچے بیچے ہیں نہیں مونڈ ٹھہرے ہیں لوگ کے بیٹھے دھ ادھ کی باتیں کہیں پیسے دو پیسے کا شہرت پیا اٹھے چلے گئے۔ اب نہ پٹری ہے نہ درخت۔ فتح پوری سے لگا تلے تک صفا چٹ میدان ہے گرمی میں یہاں سے وہاں جاؤ تو فٹار ہو جائے یا وہ زمانہ تھا کہ دو پہر کو بھی اس سڑک پر بہا ہوتی تھی گھر میں وہ آرام نہ ملتا تھا جو یہاں ملتا تھا۔ اور اس چاندنی چوک کو تو دیکھو کیا کالی بھٹ ہوئی ہے ایک چکر لگا کر جاؤ تو معلوم ہو کہ ابھی کوئلہ بیچ کر آرہے ہو اور گرم ایسی کہ تندور (تنور) بھی کیا ہو گا۔ دو پہر کو روٹیاں پکا لو کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ

قیمتی سڑک یہی ہوتی ہے۔ ہاں بھائی ہوگی ولایت کا مال لگا ہے قیمتی کیوں نہ ہوگی ایک دن رام لیلا دیکھنے نکلا تھا رات کے بارہ بجے تک تو یہ سڑک ٹھنڈی ہوئی نہ تھی اور ہاں میاں فرحت کبھی رام لیلا کے زمانے میں بھی دلی آئے ہو" میں نے کہا "جی نہیں" کہنے لگے "ارے کبھی کیا کہوں! اس میلے کے ٹوٹنے کا جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ پہلے جو سواری نکلتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے۔ ہندو مسلمان، امیر و غریب شریف و ذلیل سب کے سب کھانا وانا کھا سفید کپڑے پہن چاوڑی میں شام ہی سے نکل آتے، کوٹھے ہیں کہ روشنی سے پڑے جگمگ جگمگ کر رہے۔ رنڈیاں ہیں کہ بنی سنوری گاؤ تکیوں سے لگی برآمدوں میں بیٹھی ہیں نیچے سے کچھ بات ہوتی ہے اوپر سے جواب ملتا ہے۔ ادھر سے پان آ رہے ہیں۔ ادھر سے روپے جا رہے ہیں بھیڑ کا یہ عالم کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ روشنی کا یہ عالم کہ جیسے دن نکلا سو سواری اس شان سے آئی کہ کیا کہوں ہنسی خوشی چار پانچ گھنٹے گزار گھروں میں جا پڑے اور اب کی سواری دیکھو تو واہ واہ آگے توپ ہے پیچھے توپ ہے سامنے فوج ہے پیچھے فوج ہے سپاہی ہیں کہ ڈنڈے بجا رہے ہیں ایک غل مچ رہا ہے کہ بڑے چلو بڑھے چلو کوٹھے بند ہیں اور ان کا بند ہونا ہی اچھا۔ بھلا آج کل کی کوٹھے والیوں سے میلے کی کیا شان بڑھ سکتی ہے۔ کوٹھے کی چھتوں پر پولس والے چڑھے ہوئے ہیں جہاں چار آدمی جمع ہوئے اور سپاہی نے ڈانٹا کہ آگے بڑھو۔ ذرا پھر چرکی تو پکڑا تھا نے میں لے گئے بھلا اس مصیبت میں کون پڑے بھلے آدمیوں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا ایک منہ ہی رسم رہ گئی وہ پوری ہو جاتی ہے اس میں کبھی کبھی مار کٹائی کی نوبت آجاتی ہے اور ہم سے پوچھو تو نہ اب وہ رام لیلا ہے اور نہ رام لیلا کا مزا اس سے بدتر حال پھول والوں کی سیر کا ہے۔ بس یہی دو میلے ایسے تھے کہ سارے جہان میں لا جواب تھے اب نہ رام لیلا وہ رام لیلا ہے اور نہ پھول والوں کی سیر وہ پھول والوں کی سیر ہے۔ پہلے بھادوں آیا سیر کی تاریخ مقرر ہوئی۔ نیفری پنج گئی، مہرونی آباد ہوئی شروع ہوئی۔ مکالوں میں سفیدی ہو رہی ہے، کمرے سجائے جا رہے ہیں کرایہ کا یہ حال ہے کہ پہلے جو کمرہ دو روپیے مہینے کو ملے، وہ سو روپیہ روز کو ملنا شکل ہے۔ رنڈیاں رکھوں میں بیٹھی جا رہی ہیں۔ امیر فٹنس اڑائے چلے جاتے ہیں غریب غریبا مثلاً سروں پر اوندھائے، ننگوٹ کسے چھین اڑائے گاتے بجاتے چلے جا رہے ہیں۔ قطب کی لٹ

تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا۔ بڑے لوگ تو اپنے کمروں پر جا، نہا، دھو، کپڑے بدل نکل آئے غریبوں نے جھرنے پر جادو میں غوطے مارے۔ ٹکے میں سے تحفہ تحفہ کپڑے نکالے، کار چوٹی ٹوپی، ٹاٹ بافی جو تاشرتی کل کا کرتا، انگرکھا، نٹ مار لٹھے کا بیجامہ پہن ایسے نکلے جیسے چاند گہن سے نکلتا ہے بھلا دیکھ کر کوئی کہہ تو دے کہ یہ میاں قادر سقے ہیں اور یہ نتھو کبار، مہرولی میں اس سرے تک دوکانیں لگی ہیں لوگ بیٹھے ہیں کھا رہے ہیں باتیں ہو رہی ہیں، ادھر گانا ہو رہا ہے ادھر دف بج رہا ہے باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے ایک دفعہ ہی نیفری کی آواز آتی ییسے جگ مایا جی کا پنکھا آگیا، سب کے سب اس میں جا شریک ہوئے عبد الوہاب کٹورا بجار ہا ہے نیفری کے کمال دکھائے جا رہے ہیں بلیں مل رہی ہیں کوئی روپیہ دیتا ہے کوئی دو شالہ رات کے ایک دو بجے تک یہی چہل پہل رہی دوسرے دن درگاہ شریف میں پنکھا چڑھا وہاں اس سے زیادہ دھوم رہی چار پانچ روز آنکھ بند کرتے گئے ہنسی خوشی گھر آئے قطب کے پرائٹھے لائے چاندی کے چھلے لائے اب گھر گھر پرائٹھے اور چھلے بٹ رہے ہیں اور اب کی پھول وانوں کی سیر خدا نہ دکھائے شریف لوگ تو وہاں کیوں جانے لگے۔ جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے میں نے کہا مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں۔ فرقہ واری جنگ۔ ”کہنے لگے چل ہٹ جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ نہ اس کے کچھ معنی، نہ اس کے کچھ معنی خواہ مخواہ اخبار وانوں نے نئے نئے لفظ کھڑے لیے ہیں اور تو نے یہاں کی زبان بھی سنی سبحان اللہ کیا زبان ہے اور اسی پر مرے جاتے ہیں کہ اردو ہماری زبان ہے۔ کھنٹو کا حال تو مجھے معلوم نہیں ہاں دلی کی زبان تو اب کچھ نئی ہو گئی ہے وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں اور ان پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے۔ ایک لفظ اردو کا بولیں گے تو دو انگریزی کے، بھئی مجھے تو یہاں کی زبان سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ پرسوں ہی جمعے کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ کر رہے تھے۔ ماشاء اللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالے کہ سبحان اللہ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو رہے مسلمان اب ہندوں کی گفتگو سنو تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں جو وہ بولتے ہیں اگر آہی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم مرتے مر جائیں گے مگر یہ زبان نہ آئے گی

اچھا بھئی، ہم عربی بولیں، تم ہندی بولو، مگر اس طرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اردو میں نہیں ہے اس کے لیے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں۔ یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ، قاموس میں سے نکال کر استعمال کریں۔ ارے بھئی، سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اردو کا کوئی بڑا مدرسہ کھلا ہے، سب علم اردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے؟“

میں نے کہا: ”جی ہاں، کلیہ جامعہ عثمانیہ۔“

مرزا صاحب بڑے زور سے تقہرہ مار کر کہنے لگے: ”اوہو، یہ نام اور اردو کا مدرسہ، معلوم ہوتا ہے وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر، جامعہ تو یہ جیسے جامع مسجد عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہو، اور میاں یہ کلیا کیا بلا ہوئی؟“

میں نے کہا: ”آپ اس بحث کو چھوڑیے۔ دلی کی کچھ اور سنیے جب دہلی کی ہر چیز سے آپ کو نفرت ہے تو کیسے گزرتی ہوگی۔“

کہنے لگے: ”میاں، بیت گئی، تھوڑی رہی ہے۔ صبح ہی اٹھتا ہوں۔ نماز پڑھ کر کبھی منہدیوں میں چلا جاتا ہوں، کبھی کلو کے تنکیے پرانی دلی والے وہاں آرام کر رہے ہیں۔ ان کی قبروں پر جا بیٹھتا ہوں۔ ان کی اور ان کی دلی کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتا ہوں۔ جی ہلکا ہو جاتا ہے شام کو جامع مسجد کی میڑھیوں پر آ بیٹھتا ہوں اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھتا ہوں کہ پہلے دلی کیا تھی اور اب کیا ہو گئی۔“

اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ مرزا صاحب رومال جھاڑ، اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ”میاں فرحت، یہاں بس اسی لیے آتا ہوں، اگر دلی میں کچھ لطف رہ گیا ہے تو جامع مسجد میں مغرب اور عشا کی نماز میں رہ گیا، یہ بھی نہ ہوتا تو کچھ کھا کر سو رہتا۔“

دوسرے دن میں حیدر آباد چلا آیا۔ سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا جو خوشی دلی جا کر ہوئی تھی، وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی۔ یہ تو میں بھی کہوں گا کہ دلی مجھ کو بھی کچھ نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دلی رکھا گیا۔ جو دلی ہمارے زمانے میں تھی، وہ تو اب نہیں رہی۔ اب چاہے دلی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں۔

حواشی

- ۱۔ دہلی میں ان بیلوں کو بجا کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں، ان کو سانڈ بھی کہتے ہیں۔ مگر ’ج‘، ’ا‘، ر کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔
- ۲۔ ہمایوں اور منصور کے مقبروں کو مدرسہ ہی کہتے ہیں۔
- ۳۔ منہدیاں اور کلو کا تکیہ، دلی کے دو بڑے قبرستان ہیں۔



MIRZA FARHATULLAH BEG



MIRZA FARHATULLAH BEG
INSPECTOR-GENERAL OF COURTS, NIZAM'S GOVERNMENT
By Courtesy of Begum Farhatullah Beg